

پاکستان سوسائٹی آن لائن لائبریری

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پچی کہانیاں

September

2016

سوسائٹی

مختصر صابریاتی
کازندگی نامہ

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆..... ”مسئلہ یہ ہے“ قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆..... ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ ”زر دلو مٹھی“ اور کاشی چوہان کا ناول ”زہر عشق“

www.paksociety.com

ماہنامہ پتی کہانیاں کراچی

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانس سہام مرزا



میجر مارکیٹنگ

021-35893121

میجر سرکولیشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منترہ سہام

مدیر : کاشی چوہان / وانیاں شمسی

انکم ٹیکس ایڈوائزر
منڈو اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رکن آل پاکستان نڈر ویچر سوسائٹی
رکن نوس آف پاکستان نڈر ویچر ایسوسی ایشن

MEMBER
APNS
CPNE

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کراچی
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 - شمارہ: 09 - ستمبر: 2016

ایڈیٹر، پبلشر: منترہ سہام نے سٹی پریس سے پبلسوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دو شیزہ اور پتی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ منڈو ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت و گنہگار ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

لائف بوائے

30

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز پنپا رکھتی ہیں

احوال

08

کاشی چوہان

قارئین کے خطوط اور حوالہ احوال کا دل چسپ سلسلہ

مقدر

07

منزہ سهام

دہشت گردی کا شکار ہونے والے اس تواریخ کی کہانی جس کی ایک دنیا مداح تھی

جائے سکون

49

ضرغام محمود

حسد کی آگ میں اپنے ہی گھر کا سکون برباد کر دینے والی ایک عورت کا کارنامہ بد

چاندنی

44

محمد سلیم افتر

اُس اداکارہ کی کہانی جو ہر مرد کو بے وقوف سمجھتی تھی.....

اہم اور مری کرنے

35

احمد سجاد بابر

دہشت گردی کا شکار ہونے والے اس تواریخ کی کہانی جس کی ایک دنیا مداح تھی

مکافات عمل

74

سید مازم حسین شہبازی

اُس جرم کا بیان جس کی سزا مجرموں کو تیس برس بعد ملتی تھی

اک یہی حقیقت ہے

68

محمد یوسف اعجازی

اُس نوجوان کی کہانی جس نے جو یو ایس وہی کاٹا

مال رسی

60

جواد احمد

اُس عورت کی آبلہ پائی جو مال بن کے بھی ماں سے بدلتی پائی

اصلی چہرہ

90

نادیہ ملک

آج بھی اس معاشرے کی ایسی عورت کے آس قاتل حسین کی انوکھی داستان ہے ہمیشہ شکار کے لیے بھڑے گاتے رکھتے ہیں اصل چہرہ میک آپ میں چھپا کر رکھتی تھی

ایسی عورت

84

سید منیر زلالہ بھٹانی

آج بھی اس معاشرے کی ایسی عورت کے آس قاتل حسین کی انوکھی داستان ہے ہمیشہ شکار کے لیے بھڑے گاتے رکھتے ہیں اصل چہرہ میک آپ میں چھپا کر رکھتی تھی

جب دولت گھر کی بانڈی تھی

79

فرزانہ ننگت

اُس بیٹھک کی زندگی کا زہر بلا باب جو کبھی دولت کے پیمانہ پر پر اجماع تھا

کر بھلا سو ہو بھلا

113

ممتاز احمد

اُس شخص کا قصہ جس نے ہمیشہ خیر خواہی کو شعار بنایا

موتی Love You

106

صابشری

ایک جانور کی بے مثال محبت اور وفاداری سے جڑی بہت خاص تھا

روٹین لائف

96

بنت حفا

آج کی وہ کہانی جس سے ہر شخص گزر رہا ہے ایک نوجوان کی زبانی

زرد لوہڑی

128

ایم اے راحت

جاسوسی کی دنیا میں تھلکے مچا دینے والا ایم اے راحت کا نیا سلسلہ

ایک تصویر ایک کہانی

127

دانیال شمیمی

آنکھ کے کیرے میں محفوظ ہو جانوالے ان مناظر کو آپ فراموش نہیں کر سکتے

جرس

121

محمد بلال فیاض

صحرائی اُس بے بسی کی داستان جہاں ہمیشہ پیاس بندے کھا جاتی ہے

ندامت

154

مریم مہرمان ملک

حسن کے نشے میں پڑا راس حیدر کا قصہ عبرت
جو آن بھی اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے

کارنامہ

149

شعبان کھوسہ

مغرب سے لڑتا ایک شہلا جس کی آج
مشرق کے ہر گھر میں محسوس کی جائے گی

کھڑکی

146

ام ناز

گورت کے اقامت کی ایک منفرد داستان
جسے ام ناز کے قلم نے پیرا امن دیا

امتحان

175

بابر نایاب

اُس مرد کی کہانی جو دنیا میں خیر کا
پیام بھرتا تھا مگر.....

مفاو پرست

170

اعجاز احمد شکرال

اُس شخص کا قصہ جسے دوسروں کے جذبات
کے بجائے ہمیشہ اپنا مفاد عزیز تھا

بھارت میں بلیک سٹ

158

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

رائٹ نمبر

198

انبلا امام بخش

ایک روگ نمبر نے اُس بد نصیب
کے بھاگ چکا دیے تھے

بادبان

184

نعمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی کے
ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا

مور شاہد حسین

180

مور شاہد حسین

اُس مرد کی کہانی جس کی پہلی ہجرت
ہی زمانے کی دھوئیں بن گئی تھی

پانی کا پھول

206

فراجت صدیقی

ایسا غریب بچوں کا ترقی پر کوئی
حق نہیں ہوتا؟

دوسرا مکا

204

انا نعیم اللہ

آسیبی طاقت کا مظہر
ایک حکایت

رفوگر

201

سید سکا

آج کے سب سے مشہور شہر کی زندہ تصویر ہے
کے لیے انصاف تلاش ایک دو شہر کی حکایت

زہر عشق

226

کاشفی جوهان

خوف اور رنگوں میں ہو جادو دینے
والے مناظر سے بھر پور سلسلہ

انجمنی محبوبہ

212

جاوید اللہ

قتل کی ایک ایسی داستان راہی صاحب
خود بھی جس کا حصہ بن گئے

سوال؟

209

ایڈیٹس آریس مسیح

ایڈیٹس کے قلم سے نکلی ایک نثر حکایت
جو نا جانے کتنوں کو بولہبان کرے گی

تیر نیم کش

257

قارئین

قارئین کی سخن نہیں کہ
آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

ہائیڈ پارک

254

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ
جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

مسئلہ یہ ہے

244

ادارہ

آپ کا مسائل کا حل، سچی
کہانیاں کا لازوال سلسلہ

زر اللانہ پبلشرز رجسٹرڈ پاکستان 890 روپے نمبر 65، الزکیہ 77، سٹریٹ 65، الزکیہ پورہ، 735، ناولی شہر ای ایم سٹریٹ 40، کراچی ہائی کورٹ

سچی کہانیاں

میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ سچی کہانیاں کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برستے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بیٹھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انہیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ سچی کہانیاں میں آپ بتائیں جگہ بتائیں اعتراف جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابل یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دُریکے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ سچی کہانیاں میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کراچی۔ ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



مقدار

وزیر اعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف صاحب نے طویل مدت کے بعد بہت سنجیدہ بیان دیا، وہ کہتے ہیں کہ سنجیدہ سیاست کنٹینرز پر چڑھ کر نہیں ہوتی بالکل درست! سنجیدہ سیاست زمین پر پاؤں ٹکا کر ہی کی جا سکتی ہے۔ خان صاحب کی طرز سیاست کے تو بہت سے لوگ قائل نہیں۔ کیونکہ سیاست کھیل تماشہ، گانا بجانا نہیں۔ یہ واقعی میں بہت سنجیدہ عمل ہے۔ لوگوں کا مجمع تو بندر والا بھی لگا لیتا ہے۔ منجن والا بھی روش رہا باتیں کر کے اپنا منجن بیچ ڈالتا ہے۔ کپڑے بیچنے والی کپڑیاں ہوں یا موبائل فون بنانے والے، جو تے بیچنے والے ہوں یا لولی پاپ تیار کرنے والے، سب پیئہ باجے، ناچ گانے کے ساتھ اپنی مصنوعات کی تشبیہ کرتے ہیں۔ لوگ دلچسپی سے ایسے اشتہارات دیکھتے ہیں اور خریدتے بھی ہیں مگر جو نا بیچنا یا لولی پاپ بیچنا بہت مختلف ہے سیاست سے، سیاست میں جو تے پرتے ضرور ہیں..... قوم کو لولی پاپ بھی دی جاتی ہے مگر پھر بھی سیاست ایک سنجیدہ طرز حکومت کی ابتدا ہے۔ اچھے سیاست دان کا کام قوم میں شعور بیدار کرنا ہوتا ہے۔ ناچ گانا کر کے مجمع اکٹھا کرنے والے کو تو کچھ اور ہی کہتے ہیں..... سیاست دانوں سے تو اب کسی اچھائی کی توقع نہیں مگر ہم عوام اب بھی سدھہ سکتے ہیں، سنبھل سکتے ہیں..... کیونکہ معاملہ ہمارے وطن کا ہے، معاملہ ہماری آنے والی نسلوں کا ہے، معاملہ ہماری بقا کا ہے۔ آئیں عہد کر لیں کہ آئندہ کسی ایسے مجمع کا حصہ نہیں بنیں گے جہاں قوم کے بجائے جھوم ہوگا، جہاں تقریر کرنے والا سنجیدہ سیاست دان کے بجائے بندر کا تماشا دکھانے والا ہوگا.....

منزہ سہام

ہم نے اگر صرف اتنا بھی کر لیا تو یقین مانیں ہمارا نام بھی تاریخ میں روشن حروف سے لکھا جائے گا دوسری صورت میں تاریکی ہی ہمارا مقدر ہے۔

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو!

کل مہر کے پھول دیکھے ہیں آپ نے..... گلابی گلابی سفید سفید ایک گچھے کی صورت۔ نظروں کو ایسے بھلے لگتے ہیں کہ آپ ہی آپ ان پر پیار آ جاتا ہے۔ اور اسی طرح کا موسم آج کل ہماری طرف بھی رہا۔ سلی گیلی دھوپ کے گچھے برساتا بادل راجا، مسرتیں برساتا رہا۔ محبتوں کی ہلکی سی دستک ایک آہٹ بھی کدورتیں صاف کر دیا کرتی ہے۔ سنہری سنہری کونجیں جب کوکتی ہوئی لمبی اڑان بھرتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے ان میں کسی راکٹ کا انجن فٹ کر دیا گیا ہے۔ مدھم مدھم چراغ اڑھتی آنکھیں بھی اس منظر کو دیکھ کر مسکرائتی ہوں گی۔ لگتا ہے مسکرائیوں کے ٹھنڈے گلاب ہمارے پاس رہے نہیں ہیں۔ مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کچھ ساھی ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتے اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وزیر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اُف!! اس پر ایک رسم محبت میسج سروس بھی ہے۔ بہت کوشش کی کہ اپنے کام سے کام رکھا جائے۔ اور کام بھی کیا..... بس لکھو اور لکھتے جاؤ لیکن نہیں..... ہم سو سے زائد تحریریں شائع ہونے کے بعد بھی خود کو طفل مکتب سمجھتے ہیں۔ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ درجن بھرا یوارڈ تو میری شیف میں بھی میری محنت اور ادب سے محبت نے میرے نام کے ہیں۔ کبھی کام سے فرصت ہی نہ ملی کہ اس طرف دھیان دیا جائے۔ اب چونکہ سمجھنے سمجھانے کا زمانہ گزر گیا ہے اس لیے وعظیم لکھاری ہمارے پرچے میں شاید نہ چھپ سکیں۔ ادب کے ساتھ کھلاؤ کرنے والوں کے لیے بہت سارے دوسرے راستے پھول بچھائے منتظر ہیں۔ اُن سب کو فی امان اللہ اور اب صرف میرٹ ہی سب سے بڑا ہتھیار ہوگی۔ وعظیم لکھاریوں سے گزارش ہے کہ اپنے تبصروں میں یا کالز پر تردیدیں اور صفائیاں پیش کرنے سے گریز کریں۔ ساتھیو! ایوارڈ تقریب کی تاریخ کا اعلان بہت جلد کر دیا جائے گا۔ آئیے اب ہم اپنی محبتوں کے طلسم کدے کا رخ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔ حسن ابرار رضوی۔ ساہیوال سے۔ کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ماہ اگست کا چچی کہانیاں بہت جلد مل گیا۔ نائل بہت خوبصورت پیش کیا گیا ہے۔ منزہ سہام نے ایدھی کے نام ادارہ بہت اعلیٰ لکھا اور کاشی بھائی نے احوال کی محفل بہت زبردست سجائی ہے، تمام احوالی خوش اخلاقی سے محو گفتگو ہیں۔ ہر چہرہ کھلکھلا رہا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سمار رہا ہے۔ ممتاز احمد صدارت کی کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور مجید احمد جانی سر جھکائے حکم کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ صائمہ مجید، ایم اے راجیل، کنزہ ملک، سونیا خان، ایم مجاہد حسین جانی، سید ملازم حسین شیزازی، عمارہ ناز، غزالہ کرن، بشری کنول نے بہترین احوال لکھے مبارک باد۔ عشال احمد نواب کو خوش آمدید آتے

رہے گا جناب۔ ان کے ساتھ تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور پرانے احوالیوں کے لئے سلامتی کی دعائیں۔ ایدھی کے نام لکھی نظم پیاری تھی، کہانیوں میں لائف بوائے ہر بار عمدہ ہوتی ہے۔ بہت کچھ سکھانی ہے یہ تحریر۔ رب کا انصاف، وہ پھر زندہ ہو گئی، وہ فرشتہ، ہیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، بندر کا پنچہ، کے ساتھ ساتھ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سب سے اچھوتی تحریر ”رات کا مسافر“ تھی، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو بہت بہت مبارک باد۔ قبول ہو۔ زہر عشق کی کمی محسوس ہوئی، زرد لومڑی نے چاشنی برقرار رکھی۔ بھارت میں بلیک لسٹ اچھی جا رہی ہے اس کے علاوہ مستقل سلسلے اعلیٰ چل رہے ہیں۔ پُر اسراریت سے بھرپور شمارہ دل جیت گیا۔ تمام پرچے کو خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔

☆: پیارے احسن اتبصرہ اچھا کیا تم نے۔ سلامت رہو۔

☆: عیشال احمد نواب کی ملتان شریف سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں پُر اسرار نمبر 2 ملا۔ نائل بہترین مزین کیا گیا ہے۔ نچلے کونے میں چٹیل کی تصویر ڈرا رہی ہے۔ منزہ سہام نے ادارہ اعلیٰ لکھا۔ عبدالستار ایدھی اور تمام مرنے والے کو اللہ تعالیٰ کر وٹ کر وٹ راحت و سکون نصیب فرمائے۔ کاشی بھائی آپ کی باتیں بہت تڑپاتی ہیں۔ ممتاز احمد، مجید احمد جانی، صائمہ مجید، صبانور، کنزہ ملک، سونیا خان، ایم مجاہد حسین جانی، احسن ابرار رضوی، ایم اے راحیل، ملک علی رضا، عمارہ ناز، غزالہ کرن، بشری کنول، سید ملازم حسین شیرازی کے تبصرے خوب تھے، کہانیوں میں رب کا انصاف، وہ چٹکبری بلی، آخری شرارت، ہیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، بندر کا پنچہ، رات کے مسافر زبردست کہانیاں تھیں۔ قسط وار صرف زرد لومڑی پڑھنے کو ملی، زہر عشق، اور بادیاں نے انتظار کی سولی پہ لٹکا دیا۔ بھارت میں بلیک لسٹ مزہ دے گیا، مستقل سلسلے بھی اچھے رہے، پُر اسرار نمبر نے روکنے کھڑے کر دیئے۔ کاشی بھائی زندہ باد، زندہ باد۔

☆: اچھے عیشال! تم نے احوال میں آکر ہمارا مان بڑھایا۔ اب ہر ماہ آتے رہنا۔

☆: آداب ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا۔ رجب والا ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ اگست کا تازہ چمکتا ملتا شمارہ ادارہ کی طرف سے موصول ہوا۔ لٹافہ چاک کیا تو سرورق نے دل جیت لیا۔ پُر اسراریت سے مزین پرچہ، واہ مزہ آ گیا۔ منزہ سہام نے عبدالستار ایدھی پر ادارہ لکھ کر حق ادا کر دیا۔ عبدالستار ایدھی کا زندگی نامہ بھی سچی کہانیاں کی زینت بنائیں۔ احوال کی محفل میں کاشی بھائی سبھی احوالیوں کو اپنے پاس محبتوں کے ساتھ بٹھائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ محبتوں، چاہتوں کا درس کوئی ان سے سیکھے۔ بڑی گہری اور غور و فکر کرنے والی باتیں کرتے ہیں۔ سبھی احوالیوں کے تبصرے بھی سپر تھے۔ میری طرح چند پرانے نام کہیں غائب ہو چکے ہیں۔ لوٹ آئیے۔ میں بھی پھر سے اس محفل میں آ گیا ہوں، مصروفیات تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں، مگر کیا کریں کاشی بھائی کی محبتیں پہنچ لاتی ہیں۔ اب دیکھو ناں، ”رات کے مسافر“ کو چھاپ کر میرا مان بڑھا دیا۔ شکر یہ کاشی بھائی۔ پیارے مجید احمد جانی کی کہانی ”ہیری کا درخت اور وہ“ بہت پیاری تحریر تھی۔ اس کے علاوہ، سرسوں کا ساگ، آخری شرارت، جائزہ، وہ نکلن، میرا پیچھا چھوڑ دو، رب کا انصاف، مجید بھرا گھر، فریب نظر، وہ فرشتہ، پاور آف لو، بس ذرا سی چھاؤں، خمیاڑہ، بندر کا پنچہ، فرعون کے مجرم، پھر سے زندہ ہو گئی، اعلیٰ

کہانیاں تھیں۔ زہر عشق اس بار غائب تھی، زرد لومڑی خوب چل رہی ہے، بھارت میں بلیک لسٹ چھایا ہوا ہے اور مستقل سلسلے بہترین جا رہے ہیں۔ اتنا پیارا پڑ اسرار نمبر سجانے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆: پیارے ڈاکٹر صاحب! کہانی کی اشاعت پر آپ کو بھی مبارک باد۔ احوال میں اسی طرح آمد مسلسل رکھیں ورنہ لڑائی ہوگی۔

☆: کنزہ ملک، قاسم پور کا لونی، ملتان سے تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ آزادی کا مہینہ کیا شروع ہوا، ہم تو گھروں میں دب کر رہ گئے۔ سچی کہانیاں نے ڈرا، دھمکا دیا ہے۔ ماہ اگست کا پڑ اسرار نمبر 2 پوری آب و تاب کے ساتھ ملا، سرورق۔ پیچھی لڑکی مسکرا رہی ہے اور نیچے نکلنے میں کوئی چڑیل دکھائی گئی ہے، جس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی روٹنے کھڑے ہوتے ہیں۔ منزہ سہام کا ادارہ بہت بہت پیارا تھا۔ اس بار احوال کی محفل خوب سچی ہے۔ سبھی احوالیوں کو میرا بیٹھا بیٹھا سلام، نئے آنے والوں کو مست بسم اللہ اور پڑانے تو ہیں ہی اپنے۔ جن احوالیوں نے مجھے یاد رکھا، اُن کو سلام، ایدھی کے نام نظم، کاشی بھیا آپ نے خوب لکھی ہے۔ پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ، ہائے اللہ! کیا مجھے بھی ایوارڈ ملے گا؟ مجھے کیسے مل سکتا ہے، میں تو ابھی ابھی وارد ہوئی ہوں۔ ویسے جن کے ایوارڈ نہیں ہوں گے اُن کو شرکت تو کرنے دیں گے ناں۔ پڑ اسرار نمبر 2 کی تمام کہانیاں اعلیٰ سے اعلیٰ تر تھیں، لیکن رات کے مسافر نے تو کمال ہی کر دیا۔ جنات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیرا نے عمدگی سے لکھا۔ زہر عشق نہ پا کر دل شکستین ہوا۔ پاور آف لو، رب کا انصاف، وہ فرشتہ، بس ذرا سی چھاؤں، خمیازہ، بندر کا بچہ اور میرے پیارے سرجی مجید احمد چائی کی کہانی پیری کا درخت اور وہ نے خوب مزہ دیا۔ وہ کنگن، سرسوں کا ساگ بھی خوب تھی۔ پڑ اسرار نمبر پڑ اسراریت میں بازی لے گیا۔ ویلڈن کاشی بھیا۔

☆: پیاری کنزہ! تمہارا تبصرہ خوب ہوتا ہے۔ رہی ملکی حالات کی بات تو حالات کی آنکھ چھوٹی تو چلتی ہی رہتی ہے۔

☆: ایم۔ اے۔ راہیل سنا یہ کیسے ہیں؟ آزادی کے مہینے میں پڑ اسرار نمبر۔ سرورق دیکھتے ہی جان نکلتی ہے۔ پورے پرچے میں صرف ادارہ ہی تھا جو پڑ اسرار نہیں تھا۔ کاشی بھائی احوال میں پڑ اسرار باتیں کر رہے ہیں۔ احوال کی محفل میں سکون و راحت ہے، ہر لب پہ مسکراہٹ اور آنکھیں شرارتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ تمام احوالی ایک دوسرے کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور ہنس ہنس کر رونقیں بڑھا رہے ہیں۔ اور یہ سب کاشی صاحب کی مہربانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے خاندان کو سلامت تا قیامت رکھے آمین۔

احوال کی محفل سے نکلے تو کہانیوں کی وادی میں سیر کرنے لگے۔ جہاں ہر کہانی ایک نئے رنگ سے خوف پیدا کر رہی تھی۔ جیسے رب کا انصاف، پیری کا درخت اور وہ، بندر کا بچہ، میرا پیچھا چھوڑ دو، سرسوں کا ساگ، بس ذرا سی چھاؤں، پھر وہ زندہ ہوئی، میرا دلہا، خمیازہ، منفرد کہانیاں ہیں رات کے مسافر، زبردست کہانی تھی۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ ہر ایک نے خوب محنت سے لکھا ہے۔ زرد لومڑی نے اچھا تاثر دیا ہے اور زہر عشق نے انتظار کی سوتی پہ لڑکا دیا ہے۔ بھارت میں بلیک لسٹ محمود شام کی صحافتی تجربے کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ مستقل سلسلے بھی خوب سے خوب تر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

مبارک باد

ہماری ہر دل عزیز ساتھی کھفتہ شفیق کی صاحبزادی کنزل تابش لندن میں ایک پیاری سی بیٹی کی امی جان بن گئی ہیں۔ ادارہ ان کی دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

ہیں۔ اب اجازت۔

۵۷: راحیل! خوش رہو! تبصرہ اچھا کیا ہے تم نے۔ اس بار تم سے کچھ دوستوں نے جواب طلب کیے ہیں امید ہے جلد جواب دو گے۔

۵۸: مجید احمد جانی۔ ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ مزاج گرامی! امید ہے خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خوش و خرم رکھے آمین۔ پاکستانی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں اللہ خیر فرمائے، اس دوران سچی کہانیاں کا بروقت مل جانا خوشیاں بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔ پراسرار نمبر 2 کا ٹائٹل لاجواب تھا۔ محسوس آکھوں والی دو شیزہ مسکرا رہی تھی اور کونے میں خوفناک مناظر دیکھائے گئے ہیں۔ ایڈھی بھی چلے گئے، بہترین ادارہ لکھا گیا۔ وہ شخصیت ہی بے مثال تھیں جو جاتے جاتے آنکھوں کا تھخہ دے گیا۔ ایڈھی اچھے سلام! احوال کی محفل میں کاشی بھائی بڑی گہری باتیں کر رہے تھے۔ پیارے ممتاز احمد صاحب کا تبصرہ پہلے نمبر پر تھ خوشی ہوئی۔ نور صبا کا خط کیا اتنا ہی بولڈ تھا جو سنسکر کرنا پڑا۔ سونیا خان، عیشال احمد نواب، احسن ابرار رضوی، کتنزہ ملک، ایم اے راحیل، ایم مجاہد حسین جانی، ملک علی رضا، نفیسہ فضل، بشری کنول، غزالہ کرن، عمارہ ناز، فرزانہ گل صاحبہ، علی اصغر انصاری، خضر حیات، سید ملازم حسین شیرازی، خواجہ حسین فیصل ندیم بھٹی، کے ساتھ ساتھ کبھی کے احوال سپر ہٹ تھے۔ جن دوستوں نے بندہ ناچیز کو یاد رکھا تبہ دل سے شکر گزار ہوں، کچھ پرانے ساتھیوں کی خیریت مطلوب ہے جن میں سدرہ انور علی، ملک عاشق حسین ساجد، مبارک علی شمس، صدیق علی حیدری، شمس محمد عزیز مئے، مقصود احمد بلوچ، عبدالعزیز جی، محمد شعبان کھوسہ اور بہت سے ساتھی مہربانی فرما کر احوال کی محفل میں لوٹ آئیں۔ عبدالستار ایڈھی کے نام لکھی گئی آپ کی نظم نے دل جیت لیا۔ اس بار ایک خبر نے راتوں کی نیندیں اڑوی اور وہ ہے پہلی سچی کہانیاں راترز ایوارڈ تقریب..... اس بار پراسرار بیت سے بھر پور کہانیاں پڑھنے کو ملیں جن میں خمیازہ، بندر کا بچہ، وہ چٹکیری ملی، رب کا انصاف، بس ذرا سی چھواؤں، فرعون کے مجرم، وہ میرا دولہا، مجید بھرا گھر، میرا پیچھا چھوڑ دو، وہ سنگن، سرسوں کا ساگ، اور سب سے بڑھ کر منفرد کہانی ”رات کے مسافر“ تھی۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو مبارک باد، انہوں نے بہت ہی شاندار کہانی لکھ کر پہلی انٹری دی ہے۔ اس کے علاوہ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، بھارت میں بلیک لسٹ جا رہے ہیں۔

۵۹: اچھے مجید! جلد ہی ایوارڈ تقریب کی تلخیج کا بھی اعلان کر دیا جائے گا۔

۶۰: نور صبا، ملت کالج قاسم پور ملتان سے لکھتی ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق اچھا ہے اور ادارہ عمدہ لکھا گیا ہے۔ ادھر آپ نے آزادی کے مہینے میں پراسرار نمبر نکال کر ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے۔ رب کا انصاف، میرا پیچھا چھوڑ دو، میرا دولہا، بندر کا بچہ، خمیازہ، پھر وہ زندہ ہو گئی، پیری کا درخت اور وہ، رات کا مسافر نے ڈرا کر رکھ دیا۔ اف اللہ۔ ایسا بھی ہوتا ہے، انسانوں کے ساتھ۔۔۔ توبہ۔۔۔ اس کے بعد شمارہ بند اور میرے آنکھیں بھی

بند۔۔۔ باقی کے تبصرے سے معذرت۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔

☆: پیاری نور! تبصرہ بولڈ نہیں تھا تمہارا، ہاں مگر لکھتے ہوئے بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ لو اب پھر سے تم جذباتی ہو گئیں۔ خط پھر سے جو کٹ گیا لڑکی!!

☆: صائمہ مجید۔ ملتان شریف۔ پُر اسرار نمبر نو وقت پر مل گیا۔ سرورق عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ ایڈھی بھی چلے گئے، اچھا ادارہ منزہ سہام نے لکھا۔ ایڈھی صاحبہ یہ جتنا لکھا جائے کم ہے۔ احوال میں پہنچے تو کاشی بھیا کی دل گیر باتوں نے رُلا دیا۔ میرے پیارے انگل ممتاز احمد صدارت کی کرسی پر بڑے سچ دھج کے ساتھ خوبصورت لگ رہے ہیں۔ میرے سر تاج بھی قدم سے قدم ملائے ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر احوال کی محفل روز بروز خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے، نئے نئے اور پرانے احوالیوں نے اس میں رنگ بھر دیے ہیں۔ جنہوں نے یاد رکھا، اُن کا شکریہ اور جنہوں نے یاد نہیں کیا اللہ اُن کا بھلا کرے۔ ایڈھی کے نام نظم نے متاثر کیا۔ کہانیوں میں آخری شرارت، پیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، وہ میرا دلہا، آخری فرعون، رب کا انصاف، وہ چتکبری بلی، بس ذرا سی چھاپوں، پاور آف لو، وہ فرشتہ، فریب نظر، رات کا مسافر عمدہ اور کمال کی کہانیاں تھیں۔ زہر عشق نہ پا کر دل غمگین ہوا، زرد لومڑی اور بھارت میں بلیک لسٹ خوب جا رہی ہیں، لائف بوائے نے دھوم مچا رہی ہے۔ ہائید پارک اور تیرنیم کش بہترین ہیں۔ سب سے خاص بات پُر اسرار نمبر کی سلیکشن تھی۔ جو کاشی بھائی نے نہایت عمدگی سے کی اور سچی کہانیاں کو سجایا، ویری ویلڈن کاشی بھیا،۔

☆: اچھی، بہن! تبصرہ بہت پیارا لکھا۔ خوش رہو۔ من کی مرادیں پاؤ۔ ہر ماہ ہمارے احوال میں آؤ۔

☆: سونیا خان۔ بستی شاہ گردیز کوئلہ رحم علی سے عرض گزار ہیں۔ ماہ اگست کا سچی کہانیاں 4 تاریخ کو ممتاز آباد سے خریدا۔ ٹائٹل بہت جاندار تھا۔ حسینہ بیٹی مسکرا رہی تھی اور چڑیل اُس سے چڑ رہی تھیں۔ منزہ سہام نے ادارہ ایڈھی کے نام لکھ کر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت پیش کیا۔ احوال میں کاشی بھیا تمام احوالیوں کو اپنے ارد گرد جمع کیے بیٹھے ہیں۔ محبتوں کی خوشبو ہر سو بکھری ہے۔ اللہ کرے یہ محبتیں سدا سلامت رہیں۔ تمام احوال پیارے تھے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ جن ساتھیوں نے مجھے یاد رکھا، اُن کا شکریہ۔ سچی کہانیاں ایوارڈ تقریب کروا رہے ہیں۔ اور مجھے جیسے لوگوں کو خوشی سے ہارٹ ایک بھی ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال کرنا۔ ویسے لاہور میں تقریب ہو تو مزہ آ جائے گا۔ کراچی، کراچی ہے اور لاہور زندہ دلوں کا شہر ہے، اس بہانے ہم بھی دیکھیں گے کہ زندہ دل وہاں رہتے ہیں یا۔۔۔؟ آپ کی ایڈھی کے نام لکھی گئی نظم بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں رب کا انصاف، پیری کا درخت اور وہ، مجید احمد جانی کی کافی دیر بعد کہانی پڑھنے کو ملی۔ بندر کا پنجہ، وہ فرشتہ، بھید بھرا گھر، سرسوں کا ساگ، میرا پیچھا چھوڑ دو، میرا دلہا، اچھی کہانیاں تھیں۔ رات کے مسافر نے متاثر کیا۔ زرد لومڑی اچھی چل رہی، زہر عشق اور بادیاں کی کمی محسوس ہوئی، انتظار کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ پُر اسرار نمبر 2 اور آل بہت اعلیٰ اور عمدہ پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کاشی بھیا اور سچی کہانیاں کی ٹیم کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیروں مبارک۔

☆: پیاری گڑیا! تبصرے کا شکریہ۔ تبصرہ مختلف مگر جامع رہا۔

☆: ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے عرض گزار ہیں۔ "کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد اب

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے لطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

”دامِ دل“..... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

”دامِ دل“..... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی..... اور جب

محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو.....

”دامِ دل“..... کہانی ہے اُس ماں کی..... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی

رویوں نے سولی چڑھا دیا

”دامِ دل“..... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریمہ چہروں

سے نقاب اتارنے والوں کی

”دامِ دل“..... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی..... جن کی

ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول ”دامِ دل“

آپ کے اپنے ماہنامہ ”دوشیزہ“ ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

دوبارہ اس محفل کی رونق کو بحال کرنے آیا ہوں (ارے.....) اگست کا شمارہ 3 اگست کو ملا۔ ٹائٹل خوفناک تھا۔ جولائی کا سچی کہانیاں مجھے نہیں ملا تھا۔ مینا تاج اور زمان صاحب کی وفات کا پڑھ کر ایک شاک سا لگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ لچند محمد علی باکسر 5 جون 2016ء کو 71 برس کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ اگست کے سچی کہانیاں میں ایوارڈ تقریب کا اشتہار پڑھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تقریب زندہ دلان شہر لاہور میں ہوگی۔ ”احوال“ میں بھی رائٹروں نے اپنے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں دوڑ لگا رہے ہیں (بیجیے! آپ بھی اس بار شامل ہو جائیے) بھی نے بہت اچھا لکھا لیکن کچھ لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ ان میں ایم اے راجیل، سونیا خان، عمارہ ناز نے اپنے اپنے خطوط میں یہ لکھا ہے کہ ہم مقصود احمد بلوچ کی کہانی قسمت اس سے پہلے کسی اور رسالے میں پڑھ چکے ہیں۔ ان تینوں نے اس رسالے کی تشاندہی نہیں کی ہے۔ (پلیز اگر کہانی آپ تینوں نے پڑھی ہے تو نشاندہی ضرور کریں۔) آخر میں سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، تمام قارئین، تمام رائٹرز کو میرا خصوصی بھرا سلام۔“

بہت پیارے اشفاق! اتنے دن بعد آئے بھی تو..... ارے محبت میں اتنا جذباتی تھوڑا ہو جاتے ہیں۔ تمہیں بھی چھوٹے سے بچے کی طرح سمجھانا پڑ رہا ہے۔ امید ہے ہماری محبت کا مان قائم رکھو گے۔

بہت پیارے قاری ساتھی خضر حیات لکھتے ہیں۔ ”اگست کا شمارہ ایک خوب صورت دلکش سرورق کے ساتھ 7 اگست کو مل گیا۔ شمارہ بہت ہی سپر ہٹ تھا۔ کاشی صاحب کچھ تو خیال کریں اتنا لٹریٹ شمارہ کچھ تو خیال کریں (سرکولیشن والو! آپ سے کہہ رہے ہیں) سب سے پہلے تو میں آپ کو پراسرار نمبر 2 نکالنے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اتنا پیارا اور خوب صورت شمارہ..... کاشی صاحب آپ نے تو ہمارے ہر دل عزیز اور پیارے ڈائجسٹ کو کہاں پہنچا دیا۔ بے شک پراسرار نمبر 2 آپ کی محبت و محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں بالکل خوشامد نہیں کر رہا بلکہ دل کی بات کر رہا ہوں۔ سب کی سب کہانیاں بہت بہت ہی عمدہ، زبردست اور اچھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خوفناک بھی تھیں۔ دہشت ناک اور پراسرار بھی تھیں۔ میں سب کہانیاں لکھنے والوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اگست کا شمارہ اپنی مثال تھا۔ لاجواب شمارہ تھا۔ اب اجازت آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگن ترقی کرے۔“

بہت پیارے قاری خضر! خط پورا لگا دیا۔ اب تو خوش ہونا!

بہت پیارے قاری محمد قاسم خان بلوچ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے لکھتے ہیں۔ ”آج ایک بار پھر احوال میں شرکت کر رہا ہوں۔ تقریباً دو یا تین ماہ کام کی مصروفیت کی وجہ سے غائب رہنا پڑا۔ خط نہیں لکھ سکا لیکن سچی کہانیاں میں اتنی مصروفیت کے باوجود بھی پڑھتا رہا۔ سب نے اچھی کہانیاں اور اچھے تبصرے لکھے سب کو مبارکباد۔ اب بات ہو جائے اگست کے شمارے پر تو اگست کا شمارہ نہایت اچھے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ منزہ سہام کا ایڈھی جی کے بارے میں لکھا ہوا کالم اچھا تھا۔ ان کے جذبات ایڈھی صاحب کے لیے دیدنی تھے۔ احوال میں ایک بات جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ سچی کہانیاں پہلی بار پہلی ایوارڈ تقریب کروا رہا ہے۔ یہ تو بہت خوش آئند بات ہے اور کاشی بھیا کی کوشش کو اللہ پاک

سانچہ ارتحال

ہماری ہرول عزیز قاری اور لکھاری ساتھی رضوانہ کوثر کی ہمشیرہ، شانہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔
ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔

خوب رنگ دے، آمین۔ جن جن رائٹروں کو ایوارڈ ملنے والے ہیں وہ تو آپ ضرور خوش ہوں گے لیکن اب رائٹروں کو چاہیے کہ وہ اس محفل کو کامیاب کرنے کے لیے کاشی بھائی کی کچھ ہیلپ بھی کر دیں جو ان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ احوال میں پیارے پیارے ممتاز کا تبصرہ دل کو چھو کر دل میں اتر گیا۔ بہت خوب تبصرہ لکھا۔ مجید احمد جانی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سونیا خان، کنزہ ملک کے تبصرہ اچھے تھے۔ جناب ملک علی رضا بھائی آپ کا تبصرہ مختصر ضرور تھا لیکن اچھا تبصرہ تھا پسند آیا۔ عمارہ ناز کا تبصرہ دل و جان سے پڑھا۔ عمارہ ناز آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ فرزانہ گہمت کا تبصرہ بھی کمال کارہا۔ کہانیوں میں ”فریب نظر“ پہلے پڑھی۔ جاوید راہی اس بار تو بازی لے گئے بہت بہت مبارک ”آخری فرعون“ پسند آئی۔ فرعون کے مجرم بت حوا یہ کہانی بھی کمال کی رہی۔ ”جائز“ وقاص حسین کی کہانی بھی اچھی لگی۔ ”رات کے مسافر“ بہت پسند آئی۔ رانا حبیب الرحمن بھائی آپ کیوں ناراض ہوتے ہو۔ ہماری کہانیاں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ آپ کا شعر بے حد پسند آیا اور آپ سے ملاقات کر کے بے حد خوشی ہوئی آپ نے مجھے بے حد پیارا اور محبت دی۔ شکریہ بھائی۔ آخر میں سب کو سلام۔“

بھلا: پیارے قاسم! تبصرہ ہر ماہ بھیجا کرو۔ بھائی تم سب کی محبتوں کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ تم سب ہمارے لیے کیا کرتے ہو۔ یہ ہم بھی دیکھیں گے اب۔

بھلا: مراد خان کوٹ رادھا کشن سے لکھتے ہیں۔ ”سلام محبت کاشی بھائی جگ جگ جیو ہزاروں سال کاشی بھائی بہت مدت بعد آج پھر آپ کی محفل میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے سب لوگوں کے مزاج اچھے ہوں گے۔ سنی کہانیاں تو ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے میں جہاں بھی جاتا ہوں۔ آج کل میں کسی ضروری کام کی وجہ سے بلوچستان میں رہ رہا ہوں۔ جب بھی کام سے ناگم ملتا ہے تو میں سنی کہانیاں پڑھتا ہوں۔ اگست کا شمارہ پراسرار نمبر بہت زبردست تھا۔ کہانیوں کی بات کریں تو میرا خیال ہے سب کہانیاں اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں زیادہ پسند آئیں۔ جن میں ”فریب نظر“ جاوید راہی، ”جائز“ وقاص حسین، ”رب کا انصاف“ ممتاز احمد، ”بس ذرا سی چھاؤں لی گھی“ محمد قاسم خان بلوچ ”رات کے مسافر“ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا۔ کاشی بھائی یہ کہانیاں اس شمارے میں بہترین کہانیاں تھیں۔ ان لوگوں نے خوب محنت کی اور ان کو ان کی محنت کا پھل مل گیا۔ آئندہ پراسرار نمبر میں ان لوگوں کو خصوصی طور پر شامل کیا جائے۔ ابراہیم شوبی کی غزل اچھی تھی۔ ”تیرنیم کش“ میں رانا حبیب الرحمن، محمد قاسم خان بلوچ، ملازم حسین شیرازی کے شعر پسند آئے۔ کاشی بھائی! آپ کی محنت خوب رنگ بھیر رہی ہے امید کرتا ہوں اگلا پراسرار نمبر اس سے بھی بڑھ کر اچھا ہوگا، والسلام۔“

بھلا: پیارے مراد! جم جم آؤ۔ تمہیں پراسرار نمبر پسند آیا، ہماری محنت وصول ہو گئی۔

>> ادوی زرینہ جو نیچو خیر پور ناٹھن شاہ بورڈی شریف سے لکھتی ہیں۔ ”کاشی بھیا اگست کا شمارہ

پراسرار نمبر 2 بہت لیت ملا ہے۔ آپ کے پھوپھا، مور شاہد حسین کی دادی کی روح کو باری تعالیٰ کروٹ
 گروٹ جنت نصیب کرے (آمین) اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ سچی کہانیاں ایوارڈ کی تقریب
 کراچی میں ہونی چاہیے کیونکہ زیادہ تر لکھاری کراچی اور سندھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ادی! ایسا نہیں
 پورے پاکستان سے خصوصاً پنجاب کے رائٹرز سندھ کے ہم پلہ ہو گئے ہیں) سدرہ شاہین کا اللہ کے فضل و
 کرم سے آپریشن کامیاب رہا۔ سدرہ شاہین نئی زندگی بہت بہت مبارک ہو۔ سلسلہ ”مسئلہ یہ ہے“ سے
 ہر ماہ لاکھوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں اس سلسلے کو یوں ہی جاری رکھا جائے۔ ”احوال“ میں نئے آنے
 والوں کو خوش آمدید۔ اس مختصر وقت میں جو کہانیاں پڑھ سکی ہوں ان میں ”فریب نظر“ جاوید راہی، ”پاور
 آف لو“ ضرغام محمود، ”وہ فرشتہ“ حنا بشری، ”میری کا درخت اور وہ.....“ مجید احمد جانی، ”لائف بوائے“
 اسماء اعوان، ”فریب نظر“ جاوید راہی کی تحریریں ناقابل فراموش تھیں۔ سدرہ شاہین، مور شاہد، مجید احمد
 جانی، صائمہ مجید، سونیا خان، آئی ٹی نصیبہ فضل، عمارہ ناز، غزالہ کرن کو بہت سارا سلام اور دعائیں۔
 ✨: پیاری بہن! ہمیں سب سے زیادہ خوشی آپ کو احوال میں پا کر ہوتی ہے۔ تبصرہ آپ کی محبت
 کا ثبوت ہوتا ہے۔

بہن! ہلہری نٹ کھٹ تحسین اپنے مزیدار تبصرے کے ساتھ خیر پور ناٹھن شاہ بورڈی شریف سے
 حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ”آنے والی عید الاضحیٰ آپ سب کو بہت بہت مبارک۔ ٹائیکل گرل نہیں
 (خاتون) کے ساتھ جڑیل انتہائی خوفناک منظر پیش کر رہی ہے۔ بھئی ہم پہلے ہی ڈرے ہوئے ہیں
 (دور ہٹو ہمیں کچھ اپنی باتیں کرنی ہیں)۔ مبارک! اب کی بار تو خوب چمکا دیا ہے آپ کے شہر کو اور
 رحمت نے۔ لوجی ہم آہی گئے ہیں، مانواحوالی تو تسلیم کر ہی چکے تھے کہ مابدولت کوچ کر گئی ہیں۔ سوچی
 وی ناں ظالمو کچھ ماہ ہم حاضری نہ لگوائیں تو شاید یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ ایک تھی تحسین۔ نام تک بھلا
 دیا اتنا ظلم وہ بھی اس بچی کے ساتھ، جو اپنے بچپن کے کئی سال اس محبوب پرچے کے نام کر چکی ہے۔
 ابھی ہم زندہ ہیں۔ معتبرین کے ڈسنے والو یہ مت بھولو کہ ہم چہرہ شناس نہیں، ہے ناں بھیا! ابھی اپنی
 ریاست قائم دائم ہے۔ جہاں پر ہماری ہر دل عزیز شہزادی سدرہ انور بھی موجود ہے۔ آج سدرہ ہم
 سب کے درمیان موجود ہے نئی زندگی کے ساتھ بہت بہت خوش آمدید یار۔ ادنیٰ شادا شے ایوارڈ
 تقریب زیادہ خوشی ہونے کی ضرورت نہیں لڑکی، کون سے ہمیں ایوارڈ ملنے والا ہے۔ چلو سب کی خوشی
 میں خوش ہو لیتے ہیں۔ ظالماں Pizza ہی کھلا دے ہا ہا ہا ہا..... اللہ پاک ڈھیروں کامیابیاں عطا
 کرے اپنے بھیا کاشی کو اور یہ ذمے داری احسن طریقے سے نبھانے کی توفیق دے (آمین ثمہ آمین)
 ہمیں مت بھولنا پاجی! کیا معلوم شمولیت کا چانس بن جائے۔ بہت خوشی ہوئی بھیا۔ ادارہ ”ایدھی بھی
 چلے گئے“ اللہ پاک عبدالستار صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، (آمین)۔ تمام نئے احوالی
 ساتھیوں کو خوش آمدید۔ عزیز جی آنکل کی آمد بھی بھلی لگی خوش رہیے۔ ناصر رضا آنکل کو نانا مننے پر
 مبارک باد۔ بہت سپاس گزار ہوں ان تمام احباب کی جنہوں نے میری تحریر پڑھی اور پسند کی۔
 سلامت رہیں۔ بھیا! آپ کی محنت رنگ لائی اور پراسرار نمبر کی تمام تخلیقات عمدہ رہیں۔ خاص کر رب
 کا انصاف وہ میرا دولہا ہے، میری کا درخت اور وہ، وہ کنگن، رات کے مسافر، جائزہ، فریب نظر اچھی
 رہیں۔ ”زہر عشق“ کی کمی محسوس ہوئی۔ ”تیر نیم کش“ اور ”ہائیڈ پارک“ میں تمام شہ پارے اعلیٰ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

سچی کہانیاں کا یادگار عشق نمبر 1

محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے

بلکہ ہم تو کہتے ہیں

عشق کا تجربہ ضروری ہے
ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

عشق نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟

یہ واردات ہوئی تو آپ عشق کی ہتھکڑی میں قید ہوئے یا بس دیکھتے ہی دیکھتے، عشق نے آپ کو کسی اور جہان میں پہنچا دیا۔

سچی کہانیاں کے صفحات پر بہت جلد عشق کی وارداتیں، عشق کی گھاتیں، عشق کی فتح اور عشق کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں، جن سے ابن آدم اپنی زندگی میں ضرور گزرا ہوگا۔

تو پھر بس تھوڑا سا انتظار اور.....

بہت جلد، عشق نمبر 1 آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

لکھاری ساتھیو سے التماس ہے کہ اس منفرد نمبر کے لیے عامیانه تحریروں سے گریز کریں۔ امید ہے آپ کی منفرد اور اچھوتی عشق بیتیاں، اس نمبر کو چار چاند لگا دیں گی۔

اپنی تحریریں ہمیں اس طرح ارسال کریں کہ 20 ستمبر تک موصول ہو جائیں۔ 20 ستمبر کے بعد موصول ہونے والی تحریریں عشق نمبر میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ نوٹ فرمائیں۔

(اگر آپ اپنی عشق کہانی بھیجنا چاہتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے..... پورے اعتماد کے ساتھ سچے عشق کے واقعات لکھیں۔ کرداروں کے نام اور مقام ہم خود تبدیل کر لیں گے)

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

اکتوبر 2016ء

کوئی
برائے
احوال

نام: _____

مکمل پتا: _____



میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

اکتوبر 2016ء

کوئی
برائے
اشاعت
کہانی

عنوان کہانی: _____

تعداد صفحات: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

فون ریسل نمبر: _____



میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اکتوبر 2016ء

کوئی
برائے
پسندیدگی
کہانی

اول، عنوان: _____

مصنف: _____

دوم، عنوان: _____

مصنف: _____

سوم، عنوان: _____

مصنف: _____

نام: _____

رہے۔ چلتی ہوں۔ اجازت۔“

☆: ارے نٹ کھٹ لڑکی! بابا آرام سے ایک ہی سانس میں دیوان پڑھ دیتی ہو۔ خوش رہو۔ خدا تمہیں اسی طرح ہنستا مسکراتا رکھے۔ بہنیں ہنستی مسکراتی ہیں تو بھائی شاد رہتے ہیں۔ تبصرہ زبردست کیا تم نے لڑکی۔ اب اگلے ماہ آنا نہ بھول جانا۔

☆: مسکان بھٹی کی شام کے بھٹیاں سے پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ”سچی کہانیاں ملتے ہی دل خوش ہو گیا۔ سرورق ڈراؤنا کم اور خوب صورت زیادہ تھا۔ احوال میں صائمہ نور محبت کے پھول برساتی نظر آئی۔ سونیا خان نے بچپن یاد دلا کر رلا دیا۔ نٹ کھٹ کنزہ ملک کا انداز بیان پسند آیا۔ بشری کنول کی صلاحیت کا کیا کہنا۔ غزالہ کرن حسد کے تیر برساتی نظر آئیں۔ عمارہ ناز کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہانیوں میں جاوید راہی واقعی نمبرون کے مستحق تھے۔ کیا خوب تحریر لائے۔ حنا بشری کی ”فرشتہ“ ایمان افروز کہانی تھی۔ اتنے خوب صورت انداز میں تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں نیکی کا مد و جزر پیدا کر دیا۔ محمود شام کا سفر نامہ معلومات اور دلچسپی سے بھر پور ہے۔ ممتاز احمد کی ”رب کا انصاف“ سمجھ نہیں آئی۔ ماریہ یاسر کا ”سرسوں کا ساگ“ میں مکھن اور مکئی کی روٹی کی کمی تھی۔ ”بیری کا درخت“ پسند نہیں آئی۔ ”آخری شرارت“ میں موت نے خوب شرارت کی۔ پھر زندہ ہو گئی، پاور لو، چتکبری ملی پسند آئی۔ ہائیڈ پارک سوچ نگر سے سجا میلہ ہے۔“

☆: مسکان بھٹی! خوش آمدید! اگلے ماہ احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ آپ جلدی جلدی میں یہ کیوں لکھنا بھول گئیں کہ آپ کی پہلی آمد ہے۔

☆: مقبول حسین نیازی خانیوال سے لکھتے ہیں۔ ”اگست کا پراسرار نمبر 1 میں نے لاہور جاتے ہوئے سفر کے دوران ادا کاڑھ کے ایک بک اسٹال سے خریدنا، ٹائٹل بہترین تھا۔ منزہ سہام نے جو الفاظ ایدھی صاحب کے لیے تحریر کیے یقیناً قابل تعریف تھے۔ ایدھی صاحب بلاشبہ ایک عظیم انسان تھے اللہ ان کو اجر عظیم عطا کرے۔ تبصرے بڑے اچھے تھے سبھی لوگوں کی تحریروں کو دیکھا تو جاوید راہی کی ”فریب نظر“ بہت پسند آئی۔ ”رب کا انصاف“ ممتاز احمد نے بھی کمال کی کہانی لکھی۔ ”بیری کا درخت“ اور ”مجید احمد جانی“، ”بھید بھرا گھر“، ”نوزیہ فرید احمد“، ”بس فراسی چھاؤں لی گئی“ محمد قاسم خان بلوچ اور لوگوں کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ جن میں ”جاڑ“ و قاص حسین کی تحریر، ”دہ فرشتہ“ حنا بشری، ”رات کے مسافر“ اچھی کہانیاں رہیں۔ ہائیڈ پارک میں، زکوٰۃ کی رقم، نوبت، ملاجی کی حاضر و ماضی، ہری مرچیں اور لفظوں کا بیہر پیر اچھے لگے۔ شاعری تقریباً سبھی اچھی تھی۔ باقی تبصرہ اگلے شمارے میں تب تک کے لیے اجازت۔“

☆: پیارے مقبول! خوش رہو، تبصرہ مختصر مگر دلچسپ تھا۔ اگلے ماہ جہاں بھی ہو پرچے پر کر راتے ضرور دینا۔

☆: قمبر شہدادکوٹ سے ہمارے ساتھی مور شاہد حسین کی آمد ہے لکھتے ہیں۔ ”سب سے پہلے تمام اہل وطن کو جشن آزادی مبارک۔ چند ماہ غیر حاضر رہا اس کے لیے دلی معذرت۔ اب آتے ہیں اپنے محبوب رسالے سچی کہانیاں کی جانب۔ حسین دو شیزہ اپنی آنکھوں میں پراسراریت لیے سچی کہانیاں کے سرورق پر موجود تھی۔ ڈراؤنی شکلوں نے اس کی پراسراریت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اگلے

اشتبہارات نظر انداز کرتے ہوئے ادارہ ”ایڈھی بھی چلے گئے“ عبدالستار ایڈھی ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ محفل احوال کے آغاز میں کاشی بھیا بھی مرحوم ایڈھی ہی کی بات کر رہے تھے اور احوال کے اختتام میں ان کی لکھی ہوئی نظم دل میں اتر گئی۔ انہما اعوان لائف بوائے، ”بے مثال“ جاوید راہی، ”فریب نظر“ محمد سلیم اختر، ”پھر سے زندہ ہو گئی“ حنا بشری، ”وہ فرشتہ“ ضرقام محمود، ”پاور آف لو“ منفرد تحریریں پڑھنے کو دیں بے حد شکر یہ۔ محمد قاسم خان بلوچ ”بس ذرا سی چھاؤں لی تھی“ ماہ و ش طالب ”Victim کون“ ممتاز احمد ”رب کا انصاف“ ایک... سے بڑھ کر ایک تھیں۔ نادیہ ملک وہ چتکبری بیٹی، شمینہ طاہر بیٹ ”خیمازہ“ صداقت حسین ساجد ”بندر کا بچہ“ اچھی تھیں۔ ایم اے راحت ”زرد لومڑی“ دلچسپ سلسلہ پڑھنے کو دے رہے ہیں۔ بنت حوا، فرعون کے مجرم، ملک صفدر عباس اعوان ”آخری فرعون“ اسرار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دانیال شمسی ایک تصویر ایک کہانی بے مثال محمود شام بھارت میں بلیک لسٹ معلومات میں اضافہ۔ فرح انیس وہ ”میرا دولہا ہے“ فوزیہ فرید احمد ”بھید بھرا گھر“ سعدیہ عابد ”میرا پیچھا چھوڑ دو“ شیما عبدالقیوم ”وہ کنگن“ مجید احمد جانی ”بیری کا درخت اور وہ“ نادیہ یاسر ”سرسوں کا ساگ“ احتشام شامی ”آخری شرارت“ مہر پرویز احمد ”آئیے کون تھی؟“ مختصر مگر اسرار سے پُر جامع لکھیں۔ مسئلہ یہ ہے، رسالے کی جان ہائیڈ یارک سب کے انتخاب پسند آئے۔ وقاص حسین جائز، ڈاکٹر خادم حسین کھیرارات کے مسافر دل کی آنکھ سے پڑھی اسرار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ شکر یہ مصنفین تیرنیم کش تمام شعرا چھ گئے۔ کاشی بھائی اب اجازت۔“

✽: پیارے مور! سلامت رہو تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے۔ دیکھو آپ اتنی طویل غیر حاضری قطعاً قابل قبول نہ ہوگی۔

✽: راولا کوٹ، آزاد کشمیر سے اشفاق احمد رفیق کی پہلی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”محترم کاشی چوہان پکی دعائیں آپ کے نام۔ آپ کے حلقہ اپنائیت میں شامل ہونے کی پہلی بار کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ دل سے خوش آمدید کہیں گے۔ مدیر صاحب میں کچی کہانیاں کے معیار کی بات نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ یہ معیار ہی تو اس کی پہچان ہے اور اس معیار کی خاص وجہ آپ ہیں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں کچی کہانیاں کا خاموش قاری تھا۔ اب لکھنے کا حوصلہ مور شاہد حسین نے دیا ہے۔ مور شاہد حسین ہر بار کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے اصرار کرتے اور میں نئے نئے بھانے بنا کر ٹالتا رہتا مگر اب اس کی محبت نے خاموشی توڑ دی۔ اگست 2016ء کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے یہ شمارہ گزشتہ کئی سالوں کے پراسرار نمبروں پر بہت بھاری لگا۔ آخری فرعون، فریب نظر، سرسوں کا ساگ، رب کا انصاف، وہ فرشتہ اعلیٰ تحریریں تھیں آخری شرارت واقعی عتیق کی آخری شرارت ثابت ہوئی۔ میرا پیچھا چھوڑ دو، وہ کنگن بھی اچھی تھیں۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے باقی پرچہ زیر مطالعہ ہے۔“

✽: پیارے بھائی! خوش آمدید، آپ کی محبت کا شکر یہ۔ شکر ہے آپ نے خاموشی کی دیوار ڈھا کر محبت کے راستے کا انتخاب کر لیا۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✽: صبر والا سے راشد لطیف لکھتے ہیں۔ ”جولائی 2016ء کا رسالہ عید مبارک کافی لیٹ ملا۔ ہمارے ڈاک کا نظام بھی کچھ خراب ہے۔ خیر مل گیا بہت خوب صورت Title تھا۔ ٹائیکل پر تصویر بہت خوب صورت تھی جو رسالے کو چار چاند لگا رہی تھی۔ واقعی اس بار کاشی بھائی آپ نے کمال کر دیا ہے۔“

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

مہنی پاکستان سے نکل کر.....

پاکستان کے دل میں.....

زندہ دلان لاہور کے درمیان

بہت جلد.....!

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا لاہور..... کراچی سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب..... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

آپ اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے.....

میرا ساتھ کس طرح دیں گے؟

آپ کے جواب کا منتظر.....

آپ کا اپنا.....

کاشی چیمپان

ویسے آپ خود بھی کمال کے ہو۔ جیسے آپ خود خوب صورت ہوتا خوب صورت کام کرتے ہو۔ آپ کا احوال میں جواب دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ عید کے رسالے میں سب کی کہانیاں بہت اچھی تھی۔ ”نئے چراغ“ اقبال بانو، ”آدھی سہاگن“ جاوید راہی، ”بازی گر“ امیر حمزہ بلوچ، ”ایک منٹ تین سیکنڈ“ محمد شعیب، آفسر شیخ معظم الہی ”سور روپے کا نوٹ“ سیماء عروج صدیقی، سوئی سنبل آپی ”ملن“ جیجیل میٹلو، ”قسمت مقصود احمد بلوچ صاحب، زربخت اور شب گل سیدہ عطیہ زاہرہ، ”سلو پوائزن“ شاہد رفیق سہو، ”کے الزام دوں“ عبدالغفار عابد۔ جن کے نام نہیں لے سکا ان سب کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اور کاشی بھائی کیا کمال جا رہی ہے آپ کی اسٹوری ”زہر عشق“ کاشی بھائی کیا میری تصویر زیادہ خوفناک تھی جو آپ کو پسند نہیں آئی اور میرے پیارے بھائی مجید احمد جانی صاحب اور جناب ممتاز احمد صاحب آپ کو فقیر کا بہت بہت سلام ہو۔ آخر میں سب لکھنے پڑھنے والوں کو بہت سلام ہو۔“

☆: پیارے راشد! بھیا تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔ تھوڑا سا مطالعے پر توجہ دو تو تم بہت اچھے کہانی کار بن جاؤ گے۔ تمہاری تصویر کمپیوٹر نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟

☆: ثواب، بلوچستان سے عمران مظہر کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”کافی عرصے بعد حاضری لگا رہا ہوں۔ وجہ صرف صحت ہے جس سے نبرد آزما ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھے گا۔ آپ کے پھوپھو کے بارے میں پڑھا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ جولائی کے شمارے کا سرورق اچھا ہے۔ منزہ صاحبہ کا ادارہ ٹھیک رہا۔ احوال میں خطوط کی بھرمار آپ کے ہر دلچیز شخصیت ہونے کا ثبوت ہے۔ بہت سارے پرانے ساتھی غائب ہیں۔ لوٹ آئیں تو ہمیں اچھا لگے گا۔ ایک وقت تھا وہ بھی..... بس کاش ہی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال نئے احوالی بھی بہترین خطوط لکھتے ہیں۔ ”نئے چراغ“ اقبال بانو، ”منزل کہاں تھی“ حسین جو نیجو، ”ملن“ جیجیل میٹلو، ”سوئی“ سنبل، ”کیا لے جائے گا“ نگہت غفار، ”آدھی سہاگن“ جاوید راہی، ”زربخت اور شب گل“ عطیہ زہرا یہ وہ کہانیاں ہیں جن کے صرف رائٹرز کے نام دیکھ کر ہی پہلی فرصت میں پڑھا اور تشنگی ختم ہوئی۔ ہر رائٹر نے خوب لکھا۔ اس کے علاوہ عبدالغفار عابد، اسماعیل بروہی، فصیحہ آصف نے بھی خوب لکھا۔ باقی کہانیاں پڑھ نہیں پایا۔ اس لیے ان پر رائے نہیں دے سکتا۔ مستقل سلسلے سارے بہترین ہیں۔ آپ کی ”زہر عشق“ بھی خوب جا رہی ہے۔ کاشی بھائی چند کہانیاں زیر تکمیل ہیں۔ آنکھ کی سرجری وغیرہ سے فارغ ہوں گا تو مکمل کر کے آپ کو بھجواؤں گا اور یقین ہے کہ آپ کا ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“

☆: پیارے عمران! سلامت رہو۔ تمہاری سرجری کی خبر نے ہمیں بہت رنجور کر دیا۔ تبصرے کے لیے شکریہ۔

☆: اکوال، تلہ گنگ سے ہمارے ریگولر قاری سلیمان شبیر عرض کرتے ہیں۔ ”ماہ اگست کا شمارہ 4 اگست کو ملا۔ بھائی جان اس شمارے کے بارے میں کچھ ضروری گزارشات ہیں کہ سب سے پہلے صداقت حسین ساجد سے گزارش ہے کہ اپنی کہانی پر غور کریں اور..... امید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ دوسری گزارش ہے صفدر عباس اعوان صاحب سے کہ ہارر فلمیں کم دیکھا کریں۔ انگریزی فلم کی اسٹوری ہمیں سنا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے سال بھی پراسرار نمبر میں ایک

مبارک باد

ہماری ساتھی لکھاری اور شاعرہ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل گزشتہ ماہ میں ماشاء اللہ ایک پیارے سے پوتے کی دادی جان بن گئی ہے۔ ادارہ ان کو دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

انڈین فلم "امر پریم" کی اسٹوری اپنے نام سے چھپوا چکے ہیں۔ خیر ان دو کہانیوں کو چھوڑ کر باقی رسالے نے اپنا معیار برقرار رکھا۔ اسماء اعوان "لائف بوائے" میں پھر ایک اچھی اسٹوری لے کر آئیں۔ جاوید راہی صاحب، سلیم اختر صاحب، ممتاز احمد، مجید جانی کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ "سرسوں کا ساگ" ماریہ یاسر "وہ کلکتہ" شیماء عبدالقیوم، "پاور آف لو" ضرعام محمود بہت ہی اچھی اسٹوری تھیں۔ اس کے علاوہ حنا بشری، محمد قاسم بلوچ، ماہ وس طالب، نادیا ملک، شمینہ طاہر بیٹ، فرح انیس، فوزیہ فرید احمد، سعدیہ عابد، مجید احمد جانی، مہر پرویز احمد دولو، وقاص حسین اور ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کی تحریریں بھی زبردست تھیں۔ "باد بان" اور "زہر عشق" کو مس کیا۔ ایم اے راحت کی تعریف کرنا ناممکن بات ہے۔ باباجی کو اللہ پاک جزائے خیر دیں۔ ہائیڈ پارک میں بھی سب کے انتخابات اچھے تھے۔ تیرنیم کش میں ناظم حسین شاہد کا انتخاب بہت پسند آیا۔ بہن سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور اور بہن منزل خان کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ اجازت اگلے ماہ تک بشرط زندگی۔"

☆ پیارے بھائی سلیمان! صداقت حسین ساجد، صفدر عباس اعوان تک آپ کی تشدید پہنچائی جا رہی ہے۔ تبصرے کا شکریہ اور ہاں پلیز وہ میگزین ہمیں فوراً بھجوادو۔ تبصرے کا بہت شکریہ۔ خوش رہو۔

✎ خانیوال سے محمد حنیف عاصم بلوچ کی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ "زندہ کہانی آپ کو سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ کاشی بھائی مزدور بندے کی زندگی بے حد مصروف ہوتی ہے اور غم روزگار اس کو ہر وقت ستانے کے ساتھ ساتھ اسے جسمانی اور ذہنی طور پر بھی مصروف عمل رکھتا ہے اور مجھ جیسے مزدور بندے کا قلم اور کاغذ کے لیے وقت نکالنا جان جو کھوں کا کام ہے مگر بچپن کا شوق اور ادنیٰ ذوق کسی نہ کسی صورت یہ وقت نکالنے پر بندے کو مجبور کر دیتا ہے گو کہ کہانی سچے اور حقیقی کرداروں پر مشتمل ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے مقام اور نام بدل دیے ہیں۔ اگر قابل اشاعت ہو تو ضرور بتائیے گا۔ ہاں اس میں بہت سی غلطیاں ہوں گی جنہیں درست کرنے کا آپ کو مکمل اختیار ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی میرے قلم کے لیے باعث تقویت ثابت ہوگی۔

☆ بہت پیارے بھائی عاصم! خوش آمدید، انشاء اللہ بہت جلد کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ آپ کی آمد کا اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

✎ سجدہ صابر بورے والا سے پڑے دنوں بعد تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو میں اپنے تمام احوالیوں سے معذرت کرتی ہوں کیونکہ پورے چھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد اب محفل میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ میری غیر موجودگی میں جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا ان سب بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں احوال کی محفل میں غیر حاضر ضرور رہی ہوں لیکن پرچہ ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہوں۔ اب اگست کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ کاشی بھائی میری طرف سے راتر

یوارڈ تقریب کی ایڈوانس بہت بہت مبارک ہو اور انشاء اللہ میں یہ امید کرتی ہوں کہ تقریب بھی بہت اچھے طریقے سے منعقد ہوگی۔ اس دفعہ احوال میں سب لوگوں نے اچھا لکھا سوائے چند لوگوں کے ایم اے راجیل، سونیا خان، عمارہ ناز مجھے آپ لوگوں کے خط پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کسی کے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے ایسا نہیں لکھتے۔ اس دفعہ کہانیوں میں انکل سلیم اختر، ممتاز احمد سرگودھا سے، مہر پرویز دولویاں چنوں سے، سعدیہ عابد، ضرغام محمود، فرح انیس ان سب کی اسٹوریاں ٹاپ کلاس اسٹوریاں تھیں۔ ویری ویلڈن۔ اس دفعہ مجید احمد جانی کی اسٹوری ”پیری کا درخت اور وہ“ اتنی خاص اسٹوری نہیں تھی۔ اس دفعہ غزالہ کرن یہ میری بہن کافی غصے میں نظر آئی۔ غزالہ اگر آپ کو ایک چیز یاد کر رہی ہے تو اسے مت پڑھو چھوڑ دو۔ آخر میں رانا حبیب الرحمن، قاسم خان بلوچ، اشفاق شاہین ان سب کے اشعار پسند آئے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔“

☆: سجدہ جی! تبصرہ اچھا لگا آپ کا۔ اب کتنے ماہ بعد حاضر ہوں گی؟

☆: رحیم یار خان سے احوال میں پہلی بار آمد ہے اویس اویسی کنگ کی۔ لکھتے ہیں۔ ”کاشی صاحب اگست کے پرچے میں آپ کی نظم جو آپ نے ایڈھی صاحب پر لکھی ہے بہت کمال کی تھی اور محترمہ منزہ سہام نے بہت کم لفظوں میں ایڈھی صاحب کی جامع شخصیت کو بیان کر دیا یہ کمال بھی خدا کی ذات بہت کم لوگوں کو دیتی ہے۔ سچی کہانیاں ایک لاجواب شمارہ ہے۔ اس کا شمارہ کم ہم لوگوں کے لیے تو بالکل نہیں ہوتا۔ پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں اس لیے کسی کا نام نہیں لکھ رہا۔“

☆: بہت جلد باز اویس! خوش آمدید! تمہارا خط پڑھ کر لگا کہ ہم نے تازہ تازہ شمارہ مارکیٹ کیا ہے۔ تمہاری پہلی آمد میں اتنے مشورے اور دھمکیاں۔ ارے..... بھائی چینیے دو اگلے ماہ تمہاری آمد کا دل سے انتظار رہے گا۔

☆: عابدہ طارق کی لالہ موسیٰ سے پہلی پہلی آمد ہے لکھتی ہیں۔ ”میں آپ کے ڈائجسٹ سچی کہانیاں کا حصہ بننا چاہتی ہوں اور امید بھی کرتی ہوں کہ آپ مجھے ویلکم کہیں گے۔ پھلا خط، پہلی تحریر ارسال کر رہی ہوں۔ سچی کہانیاں کے لیے۔ اس سے پہلے بھی میں ایک ڈائجسٹ میں لکھتی ہوں۔ اگر آپ اچھے اور خوشگوار موڈ میں ویلکم کہتے رہے تو انشاء اللہ اور بشرط زندگی پڑھنے والوں کے لیے اچھے سے اچھا مواد شیر کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ مجھے لکھتے ہوئے بہت عرصہ تو نہیں گزرا۔ مگر اشفاق بٹ صاحب نے مجھے لکھنے پر اکسایا اور یہی وجہ ہے کہ لکھنے کا کام جاری ہے۔“

☆: اچھی عابدہ! ویلکم خوش آمدید! جی آیاں نو! اب تو خوش ہونا تحریر پڑھ کر ہی کوئی رائے دے سکیں گے۔ فی الحال تو انتظار کرو۔ احوال میں اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆: منجن آباد سے خواجہ حسین جاوید لکھتے ہیں۔ ”شمارہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تاخیر سے ملا خیر صد شکر خدا کا کہ بالآخر مل تو گیا ورنہ میں نے تو اس بار پکا سوچ لیا تھا کہ شمارہ لینے کراچی جاؤں گا اور اس بہانے کاشی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کاشی بھیا شمارے کے ہر ورق سے آپ کی محنت نظر آرہی ہے۔ آپ نے پراسرار نمبر دے کر دل باغ باغ کر دیا اور خطوط کے آخر میں آپ کی نظم کمال کی تھی۔ ایڈھی صاحب کو آپ نے خراج عقیدت پیش کر کے اپنا حق ادا کر دیا۔ ہائے افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ بھیا جی یہ جو آپ ہر خط کا جواب دیتے ہو آپ کی اس

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیر ادارت

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

☆ پاکستان کے مہتممانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں مالی تحقیقاتی اداروں کی

بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی او کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مسنوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ نوجوانی ☆ تندرستی

☆ پاکستان کے اضلاع ☆ موسیقی ☆ ہم اور ہمارے بچے ☆ طنز و مزاح ☆ اردو ادب سے انقلاب

☆ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت ☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ اطراف میں ہے

Ph: 0092 21 32274661

Mob: 0300-8210636

سویٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندر گپت روڈ، کراچی

Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com

نہنے کی مفت کاپی
کے لیے تلاش

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادا کا بھی جواب نہیں۔ بھیا جی سوچیں ہوں تو تھو لعل جیسی ہو اور مدیر ہو تو کاشی چوہان جیسا ہو۔ باکمال لوگ لا جواب شمارہ۔ بھیا جی بڑی معذرت کے ساتھ..... مجھے بہت امید تھی کہ اس بار میری کہانی ضرور شائع ہوگی آپ نے میری کہانی تو نہیں لگائی لیکن مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ ناقابل اشاعت تحریروں میں میری کہانی نہیں تھی یعنی کہ میں پُر امید رہوں کہ ایک نہ ایک دن میری کہانی ضرور شائع ہوگی (ارے..... لسٹ تو ہر دوسرے مہینے آتی ہے بھیا!) بھیا جی ایک بار پھر آپ کا بہت بہت شکریہ تمام رفیقانِ قلم سے گزارش ہے کہ میرے دیرینہ دوست علی اصغر انصاری آج کل بہت پریشان ہیں۔ اس کے لیے خصوصی دعا کریں۔ احوال میں ممتاز احمد صاحب نے یاد رکھا شکریہ جناب! مجید احمد جانی، مجاہد حسین بھائی، آنٹی نفیہ فضل، افضل آزاد کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ ناظم حسین شاہد! یار کردی ناپچوں والی بات۔ میں نے آپ کو روکا تھا نا کہ خط میں میرا ذکر نہیں کرنا۔ جن احباب نے یاد رکھا مالک ان کو خوش رکھے، آمین اور جن احباب کی میں تعریف نہ کر سکا دراصل وہ تعریفی القابات سے بے نیاز تھے۔ بہن نسیم سحر بہن نگہت عفتار بہن فرزانه گل اور بہن فرزانه نگہت کے خط بہت ہی اچھے تھے۔ بہن سونیا خان نے بہت شاندار تبصرہ کیا ہے۔ ملک علی رضا، ملک صفدر اعوان، خضر حیات صاحب اور پیارے امیر حمزہ مہدی صاحب کے تبصرے بہت شاندار تھے۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ”تیرنیم کش“ بہن رضوانہ کوثر، بہن شازیہ رضوی اور بہن شائلہ اختر کے اشعار زبردست تھے۔ بھائی قاسم خان بلوچ، خضر حیات، شعیان کھوسہ کے انتخاب اچھے تھے۔ ہائیڈ پارک میں شہروز شریف، شہباز رضا، کاشف عاثر اور بہن عظمیٰ شکور بہت خوب۔ انتخاب تھے آپ لوگوں کے گڈ جاب، کاشی بھیا ایک عدد اور کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ شائع فرمائیں گے۔ آپ کے مثبت جواب کا انتظار رہے گا۔“

مٹا پیارے بھائی! سلامت رہو۔ تبصرہ بہت مزیدار تھا تمہارا مگر تھا شیطان کی آنت۔ کہانی پڑھ کر ہی رائے دی جاسکتی ہے۔ فی الحال کہانی کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں انشاء اللہ اس ماہ ضرور پڑھ لوں گا۔

>>> ہماری بہت پیاری آنٹی نفیہ فضل کراچی سے بہت لیٹ احوال میں پہنچی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ بھانجے اور بھانجیوں کی شادیوں میں مصروفیت کے باوجود پراسرار نمبر پڑھ ہی ڈالا۔ آپ کے پھوپا اور اقبال زمان کے بہنوئی اور مینا تاج کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اس مرتبہ پراسرار نمبر واقعی پراسرار ہو گیا۔ فریب نظر جاوید راہی، وہ پھر سے زندہ ہو گئی زبردست کہانیاں ہیں۔ محمد سلیم اختر کی تحریروں میں کافی نکھار ہے۔ وہ فرشتہ جنا بشری یہ حقیقتیں آج بھی ہیں۔ پاور آف لو، ضرغام محمود اچھی کہانی ہے۔ بس ذرا سی چھاؤں لی تھی یہ کہانی حقیقت سے نزدیک ہے۔ محمد قاسم خان بلوچ ویلڈن۔ ممتاز احمد رب کا انصاف۔ نادیا ملک چتکبری بلی، زبردست۔ ذرد لومڑی، ایم اے راحت۔ ان کے لیے کیا کہوں یہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بیری کا درخت اور وہ مجید احمد جانی اچھی کہانی ہے۔ سرسوں کا ساگ، مار یہ یا سر آخری شرارت،

احتشام شامی دل پہ اثر کر گئی۔ وہ میرا دولہا فرح انیس، اچھی کہانی ہے اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ وہ کنگن سیما قیوم اور بنت حوا کی فرعون کے مجرم بھی بہت اچھی لگیں۔ غرض مجموعی طور پر دوسرا پراسرار نمبر 1 ہے۔ آپ سب کو مبارک ہو۔

☆ پیاری آنٹی! آپ کی صحت کے لیے ہر پل دعائیں لبوں پر رہتی ہیں۔ بس اس طرح ہمیں اپنی شفقت سے نوازی رہا نیچے۔

✉ شگفتہ ناز کی رحیم یار خان سے یہ پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھائی کسی رسالے میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں کو پڑھتے ہوئے تو کافی ٹائم بیت گیا ہے۔ لیکن اس میں لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہی ہوں۔ جولائی 2016ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس دفعہ احوال میں سب بہن بھائیوں نے بہت اچھا لکھا۔ اب بات ہو جائے اسٹوریوں کی نئے چراغ، اقبال بانو، نہ خدا ہی ملا، فیصل ندیم بھٹی، سلو پوائزن، شاہد رفیق سہو، نام بھی نہ رہے گا، شاہد محمود مغل، اور اس مہینے کی ٹاپ کلاس اسٹوری۔ 'قسمت' جو کہ مقصود احمد بلوچ نے تحریر کی تھی۔ ویلڈن مقصود بھائی آپ کی اسٹوری نے تو مجھے رلا دیا۔ اگر دوستوں نے مجھے خوش آمدید کہا تو انشاء اللہ ہر ماہ حاضری دیتی رہوں گی۔ اس ماہ کے لیے اتنا کافی ہے اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری دوں گی۔ تب تک خدا حافظ۔

☆ پیاری بہن شگفتہ! خوش آمدید۔ آپ کی جذباتیت نے ہمیں بھی رلا دیا۔ آپ ایک کہانی پر اتنی جذباتی ہو گئیں۔ اگر ہم پیچی نہ چلاتے تو ہمارے قاری ڈاک خانے کے بجائے آپ کے گھر کا پتا ڈھونڈ رہے ہوتے۔ خوش رہیے۔ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ دیکھیے اگلی پارکس کے بھاگ جاتے ہیں۔

✉ ہمارے سینیئر لکھاری سید محمد ابو آزاد، کراچی سے زمانوں بعد احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کرتا ہوں کہ میری بیگم سیدہ منورہ خاتون آج سے تین ماہ پہلے اس دنیا فانی سے رحلت فرمائیں۔ ان اللہ وانا اللہ راجعون۔ آپ سے دعا ہے کہ رب ان کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے سورہ فاتحہ پڑھ دے۔ شکر یہ۔ مرحومہ کے اوصاف حمیدہ کے متعلق ایک سچی کہانی بعنوان "میرے محبوب تیرے لیے" آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم آپ اس کو اپنے ڈائجسٹ میں شائع کر کے مجھے ممنون فرمائیں۔

☆ محترم انکل آزاد! آپ کی آمد کی جتنی خوشی تھی۔ آنٹی کے انتقال کی خبر نے غمگین کر دیا۔ آپ کی تحریر جلد ہی اشاعت کے مراحل طے کرے گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ سیالکوٹ سے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی احوال میں آمد ہے، لکھتے ہیں۔ میں آپ کو شاتھی کارڈ کی فوٹو کاپی، ماہنامے میں شائع کروانے کے لیے دو دفعہ کہانی دو غزلیں اور جوابی لفافے کے ساتھ خط بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ (یہ ہم پہ الزام ہے ڈاکٹر صاحب) میری کوئی تحریر جس رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ اس ماہ کا رسالہ مجھے اعزازی طور پر ارسال فرمادیں۔ اس دفعہ ایک بالکل سچا واقعہ آپ بیتی کے انداز میں بھیج رہا ہوں۔ آپ اسے دوبارہ خود لکھ کر میرے نام کے ساتھ شائع کریں اور

وہ ماہنامہ مجھے بھی ارسال فرمادیں۔ (ارے اچھی زبردستی ہے بھئی) یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ (اور ہماری.....) اگر آپ قارئین کو قابل اشاعت کرانے کا انعام وغیرہ دینے ہیں تو امید ہے مجھے بھی مایوس نہیں کریں گے۔ آپ کو کہانیاں اور دوسری تحریریں بھیجتا رہوں گا۔ (جان لیں گے کیا ہماری؟) اس کے لیے آپ مجھے اپنا یہ رسالہ اعزازی طور پر ارسال کرنا شروع فرمادیں۔ اس کے لیے آپ کو تھمیلی لیٹر بھی بھیج رہا ہوں۔ آپ سے پہلے طب کے ادارے مجھے اپنے رسالے فری ارسال کرتے ہیں۔ اور ان رسالوں میں میرے لکھے ہوئے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (ہم مستفید کیوں نہ ہوئے؟)۔۔۔ رسالوں کے علاوہ آپ کا یہ رسالہ بھی اپنے نام لگوانا چاہتا ہوں (ارے! ارے!..... دیکھو لوگو!) اور تحریر بھی بھیجتا رہوں گا۔ اس خط کا جواب کسی اور کاغذ پر فرمائیں یہ خط واپس نہ بھیجیں۔ (آپ کا حکم ہے یہ؟)

☆: لیجیے ڈاکٹر صاحب! خط بغیر کالے پہلی بار شامل کر دیا ہے۔ اب اس سے آگے ہم بھلا اور کیا کہیں۔ لوگو سمجھا کرو۔ آپ کی کہانیاں ناقابل اشاعت تحریروں کی فہرست میں لگا دی گئی تھیں۔ امید ہے اب آپ گلہ نہیں کریں گے۔ لیجیے ساتھیو! اس خط کے ساتھ ہی ہماری آپ کی اس ماہ تک کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اگلے ماہ انشاء اللہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔

موہنجودڑو

برق سی حساس رگوں میں دوڑاتے
 ننگے پیروں میں خوب چبھتی ہیں
 تیرے ماضی کی جڑیں
 اے موہنجودڑو!
 میرے شہر میں پھر سے جھوم اٹھے ہیں بادل
 اور.....
 سچ میں مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے
 تیرے ماضی کی جڑیں
 کیا پھر سے تجھے جن رہی ہیں
 میرے شہر میں موسم بدل رہے ہیں
 اے موہنجودڑو!
 مجھے.....

موہنجو "کولاچی" نہیں بننا

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

اے موہنجودڑو!
 ہم نے تجھ سے کچھ نہ سیکھا
 بے جان خلاؤں سے گزرتے
 کہسار پر چڑھتے
 تیری ہی گلیوں سے گزرتے
 چیز کی صلیب پہ لٹکتے
 اپنی پہچان کی تصویریں
 سٹنگی پر سجاتے
 چمپنی دھوپ کو منہ پہ لگاتے
 آشیر باد کی دھونی روماتے
 خموشی کے اس جہاں کو
 ماضی سے حال میں بھگاتے
 ہم نے تجھ سے کچھ نہ سیکھا

پچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

▶..... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے جس کا گزشتہ بیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

▶..... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

▶..... اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

▶..... پوری دنیا میں پھیلے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

▶..... اس لیے کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

▶..... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

▶..... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔

▶..... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔

▶..... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں

اضافہ کرتی ہے۔ شعبہ اشتہارات: پچی کہانیاں

88-C II فرسٹ فلور، خیابان جامی کراچی، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

لائف بوائے انٹرنیشنل شیمپوز کو مت دلائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

”جلدی کرو بھئی۔“ عارش علینا کی چٹیا کھینچتے
ہوئے بولے۔

”اُف بھیا بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔“

علینا آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”چاہے کچھ کر لو رہو گی تو دیسی ہی.....“

سانپ سو سال بعد کینچلی بدلتا ہے اور اس حساب

سے تمہیں اپنا روپ بدلنے کے لیے مزید اسی سال

اور چاہیے ہیں۔ پھر جا کر کہیں بات بنے گی۔“

عارش نہایت ڈرامائی انداز میں آنکھیں گھما کر

ہاتھ پھیلا کر بولے۔

”اگر بات آپنی کوریسیو کرنے کی نہ ہوتی بھیا

تو میں ہرگز ہرگز آپ کے ساتھ ایئر پورٹ نہ

جاتی۔“ کوئل سی علینا رو ہانسی ہو گئی۔

”بس اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو آپ سے

سارے بدلے گن گن کر لوں گی۔ دیکھوں گی

بھابی کے سامنے کیسے جی جی میں تیرا غلام بن کر

کھڑے ہوتے ہیں۔“

میں پانچ سال بعد وطن واپس آ رہی تھی۔

شادی کے بعد وہ میاں کے ساتھ جو جدہ گئی تو بس

وہیں کی ہو رہی۔ مگر جب عارش کی شادی کے

ہنگامے پھوٹے تو اُسے مجبوراً آنا ہی پڑا۔ دیا ر غیر

سے ہفتہ بھر کے لیے دو بچوں کے ساتھ سامان

لیٹ کر آنا کیا آسان رکھا تھا۔ زاہد کو حسب

معمول چھٹی نہ مل سکی تھی اور اس نے شادی سے دو

دن قبل ہی آنا تھا۔ اور وہ بھی شادی ہو گئے بھائی

کی تو بھلا خالی ہاتھ کیا آیا جاتا ہے؟ سب کے

لیے تحفے تحائف لینے میں ہی مہینہ بھر لگ گیا تھا۔

امی جان نے جدہ سے خاص طور پر چار موم کے

دو پٹوں کے دو تھان بھی منگوائے تھے۔ خدا خدا

کر کے جب ایک حد تک وہ شاپنگ سے مطمئن

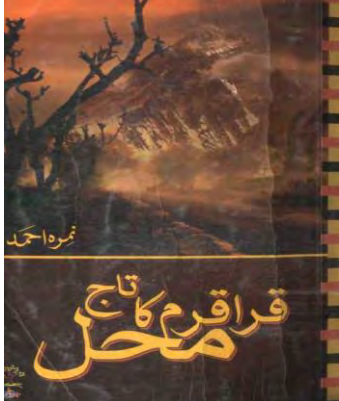
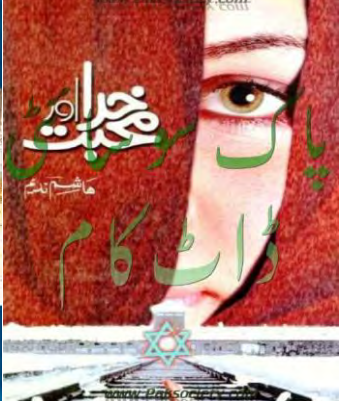
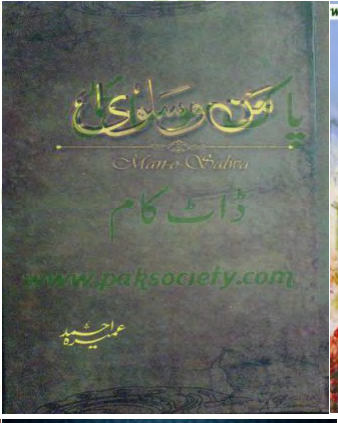
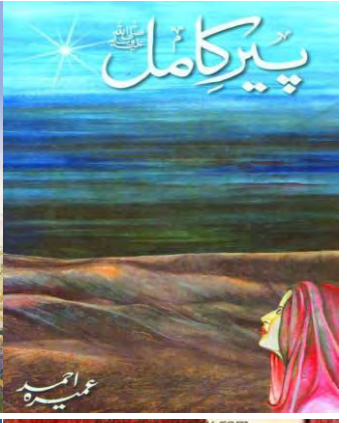
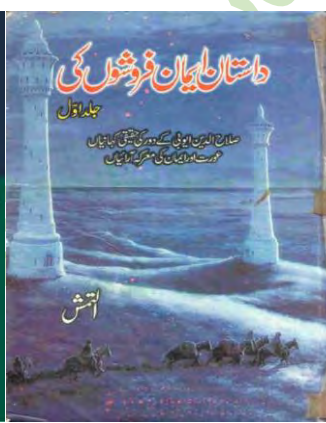
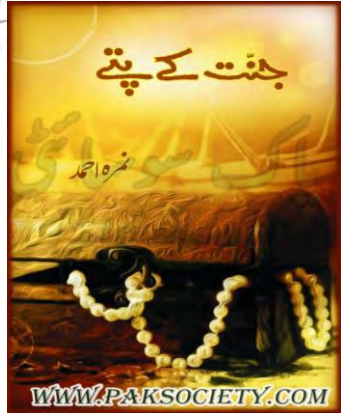
ہوئی تو کچھ شکھ کا سانس لیا۔

آج وہ جدہ سے پاکستان کے لیے روانہ

ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”انہیں دیکھیے پورا خاندان ہی ہماری بہنا کے سواگت کے لیے آٹپکا ہے۔“ عارش اپنی ہونے والی سالی عمارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولے۔

”آپ کو کوئی اعتراض ہے تو ہم چلے جاتے ہیں جی جی۔“ عمارہ شرارت سے بولی۔

”جائیں شوق سے جائیں۔“ عارش منہ آسمان کی طرف اٹھا کر گنگنا نے لگے۔

”تو بہ ہے عارش بھائی۔ آپ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔“ عمارہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

”ارے عمارہ پریشان کیوں ہوتی ہو۔ دیکھنا اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو بھیا کی کیسی کیسی خاطر میں.....“

”بھائی سے غداری۔“ عارش علینا کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

”بہت بری بات ہے۔ چیچ چیچ..... بھئی بہت افسوس ہے یعنی آج کل کی لڑکیاں اسکول کالج جا کر یہ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ سن رہے ہیں علیم صاحب۔“

عارش نے بیٹا کے دیور کو شہو کا مارتے ہوئے کہا جو بہت سنجیدگی سے ایک طرف کھڑے رن وے پر نظر میں جمائے ہوئے تھے۔

”جی جی ہاں..... بالکل سن رہا ہوں۔“ علیم ہڑبڑا کر اپنی عینک جمانے لگے۔

”وہ دیکھو بیٹا آ گئیں۔“

علینا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ تقریباً بھاگتی ہوئی وہ بیٹا کے گلے سے چھول گئی۔ بیٹا باری باری ہر ایک سے گلے مل رہی تھی۔ امی تو بار بار رومال کے کونے سے آنکھیں خشک کر رہی تھیں۔ پانچ سال بعد اُن کی بیٹی پردیس سے لوٹی تھی۔ اُن کی دہلی پتلی بیٹا کا جسم دو بچوں کی پیدائش سے بھر گیا تھا۔ اُس کا چہرہ..... لبوں پر مچلتی ہنسی اُس کی

”کیا کہہ رہی ہو علینا! تم نے اپنا بھیا کو کیا سمجھا ہے اس؟ ارے ہمارا نام عارش خان ہے جناب اور ہمارے سامنے بڑے بڑے شیر بھی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور تم بات کر رہی ہو کس کی، سارہ کی؟ اُسے تو میں یوں قابو کر لوں گا یوں۔“

بھیا چنگلی بجاتے ہوئے بولے۔

”چلو چلو.....!“ امی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

”کچھ تو خیال کرو بیٹا کے سُسرال والے سب ایئر پورٹ پہنچ گئے ہوں گے اور تم دونوں کو خانہ جنگی سے فرصت ہی نہیں ہے۔ عجیب بچے ہیں بھئی۔ صاحبزادے خیر سے اگلے ماہ گھر بسانے والے ہیں۔ مگر چھوٹی بہن سے یوں جھگڑتے ہیں جیسے اوپر تلے کے بچے اور چھوٹی بہن سے تو کوئی پوچھے ایم اے کی طالبہ ہیں۔ لیکن کوئی احساسِ ذمہ داری، کوئی ڈھنگ کی بات ہے ہی نہیں۔“ امی بڑبڑائیں۔

☆.....☆.....☆

ایئر پورٹ پر بیٹا کی سُسرال، عارش کی ہونے والی سُسرال، کچھ عزیز رشتے دار پہلے ہی موجود تھے۔ ایک دو عزیزوں کی کاریں آگے پیچھے آ کر رُکیں۔

”بس پانچ منٹ تک جہاز لینڈ کر جائے گا۔“

بیٹا کے سر محمد فہیم صاحب بولے۔

”ہاں لیکن سامان وغیرہ کلیئر کروانے میں گھنٹہ ایک تو لگ جائے گا۔“ ابو نے اظہارِ خیال کیا۔

”چھوٹے چھوٹے بچے بھی تو ہیں ساتھ۔“

امی بولیں۔

”گھبرا گئے ہوں گے بے چارے اتنے لمبے سفر سے۔“

ادھر نوجوان ٹولہ سب سے بے نیاز خوش گپیوں میں مگن تھا۔

اور کہاں بھانت بھانت کے رشتے دار جو اُسے اپنی ماما کے پاس ہی نہیں جانے دے رہے تھے۔ اور ماما بھی تو بالکل لفت نہیں کر رہی تھیں۔ سوٹ کیس کھول کر قالین پر دھرنا مارے مینا سب کے لیے تحفے نکال رہی تھی۔ امی نے جو چار موم کے دوپٹوں کا تھان منگوا یا تھا اُس کی کوانٹی کی تمام خواتین تعریف کر رہی تھیں۔

”بھابی! آپ کے صاحبزادے تو سو گئے۔“
علیم نے اپنی گود میں سوئے ہوئے عاشر کی طرف مینا کی توجہ دلائی۔

”علینا بہنا پلیز ذرا عاشر کے کپڑے بدل کر اسے لٹا آؤ۔“ مینا نے سوٹ کیس الٹ پلٹ کرتے ہوئے آواز لگائی۔

”لایئے علیم بھائی.....“ علیم نے عاشر پر جھکتے ہوئے کہا۔

”ایسے تو یہ جاگ جائے گا۔ میں اسے کمرے میں لٹا دیتا ہوں۔ پھر آپ اس کے کپڑے بدل دیں۔“
”چلیں.....“

”افوہ باجی تو لگتا ہے سارہ جدہ اٹھا لائی ہیں۔“ علینا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بڑبڑائی۔
”لائیں میں اٹھا دوں۔“ علیم عاشر کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے بولے۔

”نہیں بس رہنے دیں۔“ علینا عاشر کا شب خوابی کا لباس ڈھونڈنے لگی۔

”علینا.....“

”جی!“

”علینا.....“

”کیا ہے علیم بھائی؟“ علینا جھنجھلا گئی۔

”کچھ نہیں۔“ علیم گھبرا کر اپنی عینک جمانے لگے۔

علینا کو ہنسی آ گئی۔ سنجیدہ سے علیم ہمیشہ علینا

خوشگوار ازدواجی زندگی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ علینا نے مینا کے پیچھے چھپے گول مٹول سے تین سالہ عاشر کو اٹھا کر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ عاشر پیار کی اس اچانک بوچھاڑ سے گھبرا کر رونے لگا۔ عاشر کیا رویا کاٹ میں لیٹی دس ماہ کی عرشہ بیگم بھی گلا پھاڑنے لگیں۔ اور اُن کی دیکھا دیکھی ارد گرد کے بھی دو تین عدد بچے بسورنے لگے۔ امی عرشہ کو گود میں لے کر پچکارنے لگیں اور علینا عاشر کو بہلانے لگی۔

سامان کاروں میں بھر کر یہ سارا قافلہ مینا کے میکے کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ رات کا کھانا امی کی طرف تھا۔ بھیا کی شادی تک مینا کا ارادہ امی ابو کے پاس رہنے کا تھا۔

☆.....☆.....☆

”زابد شادی سے دو تین روز پہلے ہی آسکیں گے، بہت مصروف ہیں۔ زیادہ چھٹی مل ہی نہیں سکتی۔“ مینا اپنے سر کو بتا رہی تھی۔

”زابد کی صحت تو ٹھیک ہے نا بیٹا..... بالکل خیال نہیں رکھتا اپنا۔“ مینا کی ساس بولیں۔

”اب تم یہاں ہو تو کھانے پکانے کا کیا بندوبست کرے گا؟“

”جی..... وہ میں کافی ساری چیزیں بنا کر فریزر میں رکھ آئی ہوں۔ ویسے بھی آئی آپ تو زابد کی عادت سے واقف ہیں۔ کھانے کے تو بالکل شوقین نہیں، بس کتابیں جتنی مرضی ہو پڑھو الو۔“

”آئی! آپ کباب تو لیجیے۔“ علینا نے پلیٹ مینا کی ساس کی طرف سرکائی۔

”بس بیٹا! بہت کھا لیا۔ آج تو اور اینٹنگ ہوئی۔“
کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ عرشہ تو

نانی کی گود میں سو گئی۔ عاشر چڑچڑا ہورہا تھا۔ کہاں گھر میں صرف ماما، بابا اور ایک چھوٹی بہنا

”کچھ تو شرم کیجیے۔“

”شرم کیسی۔ آج ہی تو پیاری پیاری تتلیاں ہمارے ارد گرد منڈلائیں گی۔ پھر تو سارہ بیگم دور سے ہی سبز جھنڈی دکھا دیا کریں گی۔“

”اللہ بھیا آپ تو بس۔“

”اللہ میاں تو سنا تھا۔ یہ اللہ بھیا کیا ہوا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ عارش نے انتہائی متفکرانہ انداز سے علینا سے سوال کیا۔

”بھیا.....!“ علینا دونوں ہاتھوں کے مکے بناتی ہوئی عارش کے پیچھے دوڑی جو ہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

سفید کڑھا ہوا ملتان کی کرتا، کلف لگی لٹھے کی شلووار، تلے دار کھسے، عارش کا نکلتا ہوا قد چوڑا سینہ، گھنی سیاہ مونچھیں، اماں تو ہر نظر پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔

بینا اور علینا خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ زاہد جو صبح کی فلاٹ سے پہنچے تھے مسلسل عاشق کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھر رہے تھے۔

”یار زاہد! آیا گیری ختم کرو اور کچھ تصاویر غریب دولہا کی بھی اتار لو۔“ عارش زاہد کی ٹانگ کھینچتے ہوئے بولے۔

”بول لے میری بلبل، بس یہی دو دن کی چاندنی ہے پھر سمجھیں گے آپ کو۔“ زاہد کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔

”لایئے زاہد بھائی عاشق کو مجھے دے دیجیے۔“ علینا بہنوئی کی مدد کو پہنچی۔

”ہاں بھئی ہاں! کدھر ہے ہماری دلہن۔ پہلے تو ہماری ایک سیلفی ہو جائے۔“ زاہد نے عاشق کو علینا کے حوالے کر دیا اور بینا کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ڈرینگ روم میں پہنچا تو دیکھا ہنوز بیگم صاحبہ گولڈن غرارہ پہنے بالوں کا اسٹائل

سے بات کرتے ہوئے گھبرا جاتے تھے۔

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ علینا انہیں دیدہ دلیری سے گھورتی ہوئی بولی۔

”ہاں..... وہ پھر کبھی سہی۔“ علیم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگے۔

”اس طرح ڈرتے جھکتے رہے تو زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔“ علینا نے نعرہ لگایا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ علیم نے باہر نکل کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

ایک علیم ہی کیا علینا اور عارش کے سامنے بڑے بڑے طرم خان بھی بیگی بلی بنے نظر آتے تھے۔ دوسروں کو چھیڑ کر، اُلو ہنا کر دونوں بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ امی کو علینا کی اس قدر بے باکی بالکل نہیں بھاتی تھی۔

”ارے علینا! تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ ذرا اسے لگام دے کر رکھو بہت نقصان اٹھاؤ گی ورنہ۔“

”نقصان کیسا امی۔ جس کو سننا ہے سنے۔ نہیں سنا تو نہ سنے۔ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے۔“

”تمہارے بولنے کی یہی رفتار رہی تو ایک دن بھی سسرال میں گزارہ نہیں ہوگا۔“

”جب مجھے شادی ہی نہیں کرنی تو سسرال کی کیا فکر۔“

”ہاں تم ہمارے ہی سینے پر ساری زندگی موٹنگ دلتی رہنا۔“ امی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں۔

”باپ کے لاڈ پیار نے بالکل ہی بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔“

☆.....☆.....☆

اس شام عارش کی مہندی سارہ کے گھر لے جانی تھی۔

”آپ نہیں جائیں گے بھیا۔“

”کیوں نہیں جاؤں گا بھئی۔“

بنانے میں لگن تھیں۔ دیر اتنی زیادہ ہو گئی تھی۔ میاں صاحب کی آمد اور ایئر پورٹ کے چکر میں کہ پارلر جانے کا وقت ہی نہ مل سکا تھا اور اب نتیجہ یہ تھا کہ بال بن کر ہی نہ دے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”پلیز لائف بوائے شیمپو..... آج تمہارا مقابلہ ایک انٹرنیشنل شیمپو سے ہے۔ میرا یقین میرا بھروسہ نہ توڑنا۔“ علینا نے بچوں کی طرح ہاتھ اٹھائے دل ہی دل میں دعا کی۔

”اوہ جان! تم ویٹ کرو میں علینا کو بھیجتا ہوں۔ وہ شاید تمہاری ہیلپ کر دے۔“

مینا بال واش کر کے ڈرائر سے خشک کر رہی تھی اور لائف بوائے شیمپو کی معطر مہک نے اُسے اندر تک تازگی بخش دی تھی۔ اور مینا کی حیرت کی انتہا نہ رہی، منٹوں میں اُس کا من چاہا ہینر اسٹائل اُس کے حسن کو دو آتشہ بنا رہا تھا۔

”اس وقت کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ جلدی سے کسی کو بھیج کر بال پنوں کا پتا منگوا دیں۔ میں دوپٹہ سر پر جمالیتی ہوں۔“ مینا نے الجھ کر کہا۔

”علینا.....! کمال کر دیا تمہارے لائف بوائے شیمپو نے۔“ مینا جوش سے بولی تھی۔

”خبردار بیگم جو آپ نے اپنے یہ خوبصورت بال چھپائے۔“ زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور سالی کو بلانے باہر چلا گیا۔

”تھینک یو علینا۔“ مینا نے محبت سے بہن کا ماتھا چوما۔

”اوہ سوری آپ! میں بھی آپ کو بھول ہی گئی اس مہندی کے چکر میں۔ میری پیاری آپ! اس شان سے لڑکی والوں کے گھر جائیں گی کہ سب آپ کو دیکھتے ہی رد جائیں گے۔“ علینا یقین سے بولی تھی۔

”اونہوں..... آپ! تھینکس میرا نہیں..... میرے لائف بوائے شیمپو کا ادا کیجیے۔“

”ارے تم اتنی شیور کیسے ہو؟ اتنی جلدی بھلا کون جادو دکھا سکتا ہے۔ میں اپنا جدہ سے لایا شیمپو یوز کر چکی ہوں لڑکی!“ مینا اسی پریشانی سے بولی۔

کچھ دیر بعد سنہری ٹشو کے غرارے میں ملبوس چمکتی دکتی پینا ہنستی ہوئی خورد زاہد کے پہلو میں آکھڑی ہوئی۔ اپنائیت سے زاہد نے مینا کے شانے اپنے بازو کے حصار میں لے لیے۔ کلک.....

”جنگ جنگ۔“ علینا شرارت سے ایک شیمپو لے کر آئی اور چھپاتے ہوئے کھلکھلائی۔

کلک بہت سارے موبائلز نے محبت کے ان جیتے جاگتے لہنوں کو اپنی قید میں لے لیا اور ایک سیلفی علینا نے بھی لی تھی۔

”کیا ہے یہ؟“ مینا چلائی۔

”خدا یا! میرے چمن میں بہا میں ہمیشہ رقصاں رہیں۔“ امی کے دل سے دعا نکلی تھی۔ اور مینا کی اس خوشی میں آج لائف بوائے شیمپو نے زندگی بھر دی تھی۔

”یہ ہے ہمارا شیمپو!“ علینا نے لائف بوائے شیمپو کی بوتل اس کے آگے کر دی۔

☆☆.....☆☆

”تمہیں یقین ہے کہ یہ منٹوں میں میرے بالوں کی مشکل حل کر دے گا۔“

بیوٹی گائیڈ

شاہانہ احمد

اس ماہ ہم بیوٹی گائیڈ میں خوبصورتی کے بارے میں اہم معلومات اور گھر بیٹھے ایسی بہترین بیوٹی ٹپس دیں گے جو گھر اور بیوٹی پارلر جانے کے بعد آپ کے لیے نہایت اہم ثابت ہوں گی۔ میک اپ کی آگہی آپ کے حسن میں چار چاند لگا سکتی ہے۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ خوب صورت نہیں یا آپ واقعی خوب صورت ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے آپ کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب آپ اپنی دیوار پر لگے آئینے سے کریں اور اپنے آپ کا جائزہ لیں۔ آپ کو اس بات کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا اور اس بات کا سخی یا مثبت جواب مل جائے گا۔ اگر آپ کا جواب ”ہاں“ میں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ یا پھر آپ کی بیوٹیشن بہت آگہی ہیں جو بہتر طور پر آپ کے حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔

اگر اس کا جواب ”نہیں“ میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یا آپ کی بیوٹیشن آپ کی جلد پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ یہ ساری حقیقت آپ کے سامنے موجود ہے۔ سن بلاک کی آپ کو سب سے پہلے ضرورت ہے۔ اپنے میک اپ سے قبل اسے استعمال کریں۔ اس کے لیے آپ کو ایسے لوشن کی ضرورت ہے جس میں اینٹی آکسی ڈینٹ شامل ہو۔

آپ فاؤنڈیشن یا کنسیلر ضرور استعمال کریں مگر ایک بات یاد رکھیں کہ یہ دس ماہ سے زائد پرانی نہ ہو۔ اگر آپ کو کریم کے طور پر درکار ہو تو پھر فیز اینڈ لولی BB استعمال کریں۔

پُرکشش نظر آنے کے لیے: آپ کی ماہر آرائش حسن کو چاہے کہ وہ آپ کے حسن کے لیے بہتر مشورہ دے۔ چند ایک بنیادی آئی کلر اور بلشر سے ہٹ کر آپ کو بتائے۔ آپ اس سلسلے میں بھی توجہ دیجیے۔ کلرٹیس بلشر ایک عمدہ اور ہلکا آئی بلشر ہے۔ بنیادی نیلا سنہری تانے کی رنگت کا آئی شیڈو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آئی پینسل کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ یہ سیاہ براؤن اور ہلکی نیلی یا آسانی مل

Fair & Lovely

BB
CREAM

Fair & Lovely

BB

INSTANT FAIR LOOK
WATER-RESISTANT



MILLER LOWE RAUF

FAIRNESS CREAM
WITH A
MAKE-UP FINISH

WWW.PAKSOCIETY.COM

Fair &
Lovely

BB
CREAM

Fair &
Lovely

BB

INSTANT FAIR LOOK
MAKE-UP FINISH



MULLENLOVE RAUF

FAIRNESS CREAM
WITH A
MAKE-UP FINISH

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆.....☆☆

جاتی ہے اور خوبصورتی کا اہم حصہ ہے۔

آپ آئی بیٹنسل کو اپنی جلد پر پھیر کر اس کی روئی اور رنگ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مسکارا استعمال کیے بغیر آپ گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ آپ کی آنکھوں کے حن میں مزید اضافے کا باعث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آپ کے مجموعی تاثر کو زیادہ دلکش بناتا ہے۔

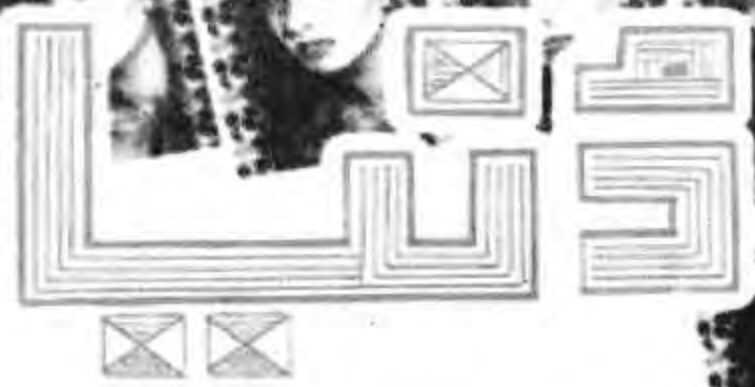
شاعروں نے ہونٹوں کے بارے میں بڑے قصیدے کہے ہیں۔ ہونٹوں کو لب گل اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حُسن کا تذکرہ کرتے ہوئے لبوں کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھولتے یہ چہرے کا وہ حصہ ہے جو بقول شاعر پھولوں کی پتیوں سے مشابہ ہے۔ لہذا اگر آپ حسین بننا چاہتی ہیں تو پھر اپنے لبوں کے حن اور ان کی حفاظت پر بھی توجہ دیں۔

خواتین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میک اپ میں مکمل فاؤنڈیشن کی کیا اہمیت ہے۔ یہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کہ درست شیڈز کا انتخاب کریں۔ ٹرو میچ پہلا میک اپ ہے جو آپ کی جلد سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ٹرو میچ کو چوبیس مختلف جلد کے مطابق تیار کیا گیا ہے جو کہ بالکل قدرتی لگتا ہے۔ اس میں یہ خاصیت ہے کہ یہ جلد کی مطابقت کے انتخاب کے بعد آپ کی جلد میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے چہرے کو بھی نکھارتا ہے۔ اس میں وٹامن بی ای اور گلیسرین شامل ہیں جو جلد میں جذب ہو کر اسے توانائی پہنچاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اہم چیز کو آپ اب تک نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ وہ چیز جو ڈریننگ ٹیبل سے میک اپ میں معاون ہوتی ہے لیکن میک اپ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے یہ ہر جگہ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ ہیں جنہیں پوری توجہ کی ضرورت ہے ایک اچھا لوشن آپ کے ہاتھوں کو ملائم نرم اور جوان رکھتا ہے۔ نیل پالش بیس آپ کے ناخنوں کی حفاظت کے لیے موجود ہے۔ اپنے لباس کے لحاظ سے آپ نیل پالش کا انتخاب کر سکتی ہیں جن میں سرخ، عنابی، سنہرا، تانبے کے رنگ عموماً شام کے اوقات میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یاد رکھیں نیل پالش ریپور آپ کے ناخنوں پر رنگوں کی بہاریں بدلنے میں فوری مدد کرتا ہے۔

www.paksociety.com

میں کس جگہ



سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اگر سچی کہانیاں کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں نگہ بھیجتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے مسئلہ نشی اور حقیقتوں کو جاننے کے لئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ذریعہ ہے۔ سچی کہانیاں میں آپ تیمان جگہ بتیاں، اعترافات، مجرم و مظلوم کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز کہانیوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دُریس کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کو بہت پسند ہے۔ وہ سچی کہانیاں ہیں۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد ذریعہ۔

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرنٹ پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان چائے کراچی۔ دہلی۔
پوسٹ آفس نمبر: 757 کراچی۔ فون نمبر: 021-35893122-35893121

اپنی سچائیوں کو جاننے کے لئے ہیں۔
pearipublications@hotmail.com
WWW.PAKSOCIETY.COM



امداد میری کرنے آجانا رسول اللہ



احمد سجاد بابر

دن رات گرزئی کا شکار ہونے والے اس قوال کی کہانی جس کی ایک دنیا بھر کی تھی

رور و کرپش کی تھی، دعا جو قبول ہو گئی تھی!!

☆☆☆

سُر اور فن کی یہ کہانی قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے علاقے روہنگ کے قصبے سے شروع ہوتی ہے جہاں 1930 میں مستقبل کے ایک بڑے فنکار نے جنم لیا، کے معلوم تھا کہ یہ آگے چل کر پوری دنیا میں نام پیدا کرے گا، اس کے خاندان کا سُر سنگیت سے رشتہ صدیوں سے جڑا تھا جس کی جڑیں مغل دور تک پھیلی تھیں، خاندان کے بڑوں کا دعویٰ تھا کہ وہ تان سین کی اولاد سے ہیں اور ان کی آواز کی اٹھان اس دعویٰ کی تائید بھی کرتی تھی۔ اس کے دادا محبوب بخش اور باقر حسین خان اپنے وقت کے مشہور ستار نواز اور فنکار تھے۔ چھ سال کی عمر میں بیچے نے اپنے والد عنایت سین صابری سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اسے ہارمونیم، قوالی اور کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دی جانے لگی۔ 1946 میں پہلی مرتبہ بیچے نے مبارک شاہ کے عرس کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے سامنے قوالی گائی اور داد سمیٹی۔

قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان بھی ہجرت

اے سبز گنبد والے منظور دعا کرنا میں قبر اندھیری میں گھبراؤں گا جب تمہا امداد میری کرنے آجانا رسول اللہ امداد میری کرنے آجانا رسول اللہ روشن میری تربت کو للہ ذرا کرنا جب وقت نزع آئے آقا، دیدار عطا کرنا مجرم ہوں زمانے کا محشر میں بھرم رکھنا رسوائے زمانہ ہوں کملی میں چھپا لینا رسوائے زمانہ ہوں دوزخ سے بچا لینا منظور دعا میری مقبول خدا کرنا جب وقت نزع آئے آقا، دیدار عطا کرنا صرف آنکھیں برس رہی تھیں، پرسوز آواز میں درد بھری التجا پیش کرنے والے کی آنکھیں بھی، پروگرام کو ہوسٹ کرنے والے میزبان کی آنکھیں چھٹی اور لاکھوں سننے والوں کی آنکھیں بھی جل تھل تھیں۔ رمضان کے مقدس مہینے میں ایسی رقت آمیز دعا دلوں سے نکل رہی تھی، شاید یہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ اور پھر وہ نہ رہا، اس کی روح ابدی منزل کو روانہ ہو گئی، ان اندھیروں کی جانب، جن میں مدد کی درخواست اس نے وجہ تخلیق کائنات کے حضور

کر کے کراچی آباد ہو گیا۔ ابتدائی ایام میں انہوں نے انتہائی کمپرسی کا وقت گزارا۔ اس خاندان کے بڑوں اور بچوں نے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے اینٹیں اور پتھر توڑنے کا کام بھی کیا۔ یہ بچہ راتوں کو اینٹ سے اینٹ جوڑتا رہا اور اپنے گھر کو چھاؤں مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہا، اسی دوران وہ شدید بیمار ہو گیا اور ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ پھیپھڑوں کی بیماری کے باعث وہ اب کبھی نہیں گا سکے گا۔ بچہ مایوسی کی حالت میں باپ کے پاس جاتا ہے جو اسے ایک ہی نصیحت کرتا ہے کہ مہاجر کمپ کے درمیان بیٹھ کر دو سال تک روزانہ چار گھنٹے ریاض کیا کرو اور اس بچے نے اس پر عمل کیا۔ اس کی آواز پہلے سے زیادہ موثر اور مضبوط ہو چکی تھی، کچھ عرصہ بعد اس نے استاد گلن خان کی قوال پارٹی کے ساتھ قوالیاں گائیں۔ انہوں نے لیاقت آباد چار نمبر کے علاقے میں رہائش اختیار کی اور تا حیات وہیں مقیم رہے۔ اب اس کا چھوٹا بھائی بھی قوالی کے سفر میں اس کے ہمراہ تھا۔

1960 کی دہائی میں قوال بھائیوں کی جوڑی نے ایک قوالی گا کر (جسے فلم عشق حبیب میں استعمال کیا گیا) دھوم مچادی۔ ان بھائیوں نے پنجاب میں راج طرز قوالی سے یکسر انحراف کرتے ہوئے اپنا انداز متعارف کروایا۔ ان کی پہلی قوالی کے بول تھے میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا۔

مجھے نظر کرم کی بھیک ملے
ان کی قوالی 'تاجدار حرم' نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دئے۔

قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے
ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ لکھ دے

یہ قوالی جب جب سنی جاتی لوگ وجد میں آ جاتے۔ آج بھی جبکہ اعلیٰ و ارفع روایتی موسیقی کا زبردستی خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس قوالی میں کوئی خاص کیفیت ایسی ہے کہ سننے والے وجدانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہر طلب کرنے والے کے دل کی آواز

ہے اور ان دعائیہ الفاظ کے ذریعے طلب کرنے پر یقیناً غیب سے مثبت جواب مل جاتا ہے۔ قوال بھائیوں کی اس جوڑی کی شہرت صابری برادران کے نام سے ہوئی، بڑے بھائی کا نام غلام فرید صابری اور چھوٹے کا نام مقبول صابری تھا۔

اسی کی دہائی میں مقبول احمد صابری اور ان کے بڑے بھائی غلام فرید صابری قوالی کے حوالے سے دنیا بھر میں انتہائی معتبر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کی مشہور قوالیوں میں "بھردو جھولی میری"، "تاج دار حرم" اور "خواجہ کی دیوانی" سدا بہار بھی جاتی ہیں۔ عام زندگی میں بھی غلام فرید صابری ایک قلندر صفت اور سادہ لوح انسان تھے۔ کثرت سے ذکر کرنا ان کی عادت تھی۔ خاص طور پر رات میں ہزار دانتوں والی تسبیح پر اللہ کا ذکر کرنا ان کے معمولات میں تھا۔ یہ تسبیح ان کی قوالی کے دوران ان کے گلے میں ملا کی طرح پڑی نظر آتی ہے۔ غلام فرید صابری نے 1956ء میں اپنے بھائی مقبول صابری کے ساتھ قوالی شروع کی۔ دونوں بھائیوں کا پہلا البم "میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا" 1958ء میں ریلیز ہوا اور دنیا بھر میں پھیل گیا۔ 1976ء میں انہوں نے امریکی شہر نیویارک میں لائیو کنسرٹ کیا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ یہ سمندر پار ان کا پہلا کنسرٹ تھا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنی قوال پارٹی کے ہمراہ بے شمار ممالک میں لائیو کنسرٹ کئے اور عالمگیر شہرت پائی۔ قوالی میں کوئی اور ان کے ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

سعودی شاہ فیصل مرحوم کے استاد زین العابدین صابری برادران کی قوالی کے مداح تھے۔ استاد صاحب ایک بار کراچی تشریف لائے اور صابری برادران کا سامع سنا اور انہیں سعودی عرب آنے کی دعوت دی۔ ستر کی دہائی میں صابری برادران حج کے دوران مدینہ منورہ گئے تو شاہ فیصل مرحوم کے استاد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا "سامان (ہارمونیم) ساتھ لائے ہو؟"

قوالیوں کی بدولت انہیں نہ صرف "صابری
برادران" کی حیثیت سے دنیا پھر میں منفرد پہچان ملی
بلکہ انہیں "پرائڈ آف پرفامنس" سے بھی نوازا
گیا۔ تاہم صابری برادران کی
جوڑی کو 15 اپریل
1994ء
کو اس
وقت

صابری برادران نے کہا "جی حضور لائے ہیں۔"
شاہ فیصل مرحوم کے استاد صاحب نے نصف
شب کو مسجد نبوی کے دروازے کھلوائے اور ان کی



خواہش پر صابری برادران نے روضہ
رسول کے سامنے بیٹھ کر "تاجدار حرم
ہو نگاہ کرم، بگردو جھولی میری یا
محمد"، مقبول کلام پیش کئے۔ یہ
تاریخی اعزاز فقط صابری
برادران کو نصیب ہے۔

مقبولیت کی بنا
پر صابری برادرزگی
قوالیاں پاکستانی اور
بھارتی قلموں کا
حصہ بھی
ہیں۔ صابری

برادران کی
انفرادیت یہ تھی کہ
اردو کے ساتھ
ساتھ پنجابی،

سرائیکی اور
سندھی
میں بھی
ان کی
قوالیاں
موجود

ہیں۔

میزبان نے پریشانی سے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، یہ تو بس ایسے ہی ہے۔ مجھے آج گفتگو کر کے بہت لطف آ رہا ہے، میں اپنے فن پر گہرائی سے بات کرنا پسند کرتا ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

ریڈیو شو کے بعد امجد صابری نے بتایا کہ چونکہ روزہ رکھنے کی وجہ سے دوا نہیں لے سکتا تھا، اس لیے زیادہ گفتگو کرنے کی وجہ سے مجھے پسینہ آ رہا تھا اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔“

یہ تھی قوت برداشت جو اس صابر شخص کے اندر مقید تھی۔ ایک کم عمر بچہ جو اس گھر کے صحن میں کھیلتا تھا، جہاں روز و شب قوالی کی ریاضت ہوتی تھی، صوفیائے کرام کے کلام کا ورد ہوتا تھا، جب پانچ ہوا تو خاندان کے ورثے کو لے کر چلا۔ پھر اس پر بزرگی اترنے لگی۔ اس کی نوعمری کی گفتگو میں پچھلی آنے لگی۔ اس کی آواز سے شیریں کلامی گونجنے کی آواز میں بڑھی ہوئی دعا ”کرم مانگتا ہوں، عطا مانگتا ہوں“ کسی جی بندے کی اپنے معبود کو پکارنے کی معراج ہے، اس سے زیادہ تاثیر اور سچائی ادا نہیں ہو سکتی، جس کو انہوں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ادا کر دیا۔ اس اکلوتی مناجات میں ہی وہ گہرائی اور وہ بلندی ہے جو انہیں حمد یہ کلام کی پڑھت میں لاقانی کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس مناجات میں اس قدر تاثیر کا سبب کیا ہے، تو ان کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ ان کے دل کی آواز ہے، اس لیے اس میں سچائی بھی ویسی ہی ہے، کہنے لگے ”شاید یہی میری مغفرت کا سبب بن جائے۔“

والدین کی تربیت، گھر کا ماحول اور ان کی اپنی جدوجہد انہیں یہاں تک لے آئی تھی کہ وہ اب نہ صرف خود اس فن میں یکتا تھے، بلکہ نئی نسل کی خوش نما آوازوں کو بھی حریف سمجھنے کے بجائے انہیں دل سے پسند کرتے تھے۔ نوجوان نسل کے مقبول گلوکار عاطف اسلم نے جب ان کے والد کی قوالی ”تاجدارِ حرم“ گانے کی خواہش ظاہر کی، تو نہ صرف اس کی اجازت دی، بلکہ ان کی اس کوشش کو بھی سراہا۔

نا قابلِ ستغافی نقصان غلام فرید صابری کے اچانک انتقال سے ہوا۔ مقبول صابری کا انتقال 21 ستمبر سن 2011ء کو ساؤتھ افریقہ میں ہوا جہاں وہ اپنے علاج کی غرض سے گئے تھے۔

دونوں بھائی کراچی کے پاپوش نگر قبرستان میں مدفون ہیں۔ لیاقت آباد میں ایک انڈر پاس غلام فرید صابری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

☆☆☆

صابری برادران کے گھرانے میں امجد صابری نے 23 دسمبر 1976ء کو آنکھ کھولی۔ ان کا پانچ بھائیوں میں تیسرا نمبر تھا، بچپن سے ہی سُر سنگیت کا ماحول تھا، صوفی ازم نے روحانی تربیت کا کام بھی کیا، گھر میں برگزیدہ ہستیوں کا کلام پڑھا جاتا تھا جس سے ان کی شخصی آبیاری ہونے لگی، اپنے والد غلام فرید صابری سے نو سال کی عمر میں قوالی کی تربیت حاصل کرنے والے امجد فرید کی پہلی پرفارمنس 11 سال کی عمر میں تھی، امجد کے والد انہیں صبح چار بجے بستر سے اٹھا دیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اتنے سخت تھے کہ چاہے وہ آدھی رات کو ہی سوئے ہوتے لیکن صبح چار بجے لازمی اٹھا دیا جاتا تھا۔ وضو کے بعد تہجد کی نماز اور اس کے بعد باجائے ہارمونیم پر راگ بھیرود کا ریاض کر دیا جاتا تھا۔ امجد صابری اپنے والد کی زندگی میں تو انہی کے ساتھ محافلِ سماع میں شریک ہوتے رہے، مگر 1994ء میں غلام فرید صابری کے انتقال کے بعد خود بطور مرکزی قوال پرفارم کرنا شروع کیا۔

وہ اکثر کہا کرتے ”میری کوشش ہے کہ میں اپنے بڑوں کی لاج رکھ سکوں۔“

امجد فرید صابری کو ذیابیطس کا مرض بھی لاحق تھا، مگر وہ اس کے باوجود اپنی مصروفیات میں خلل نہیں آنے دیتے تھے، اور نہ ہی کسی کو اس بارے میں بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ ریڈیو کی لائیو ٹرانسمیشن میں ان سے طویل گفتگو کے دوران میزبان نے دیکھا کہ ان کو پسینہ بہت آ رہا ہے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

والدہ نے اسے جانے کا کہہ دیا اور وہ ٹکٹ بنوانے کے لیے ٹریول ایجنٹ کے پاس جا پہنچا۔ ٹریول ایجنٹ نے امجد سے کہا کہ آپ اسی ٹکٹ میں عمرہ کرتے ہوئے چلے جائیں تو کیسا رہے گا۔ ٹریول ایجنٹ کے ایسا کہنے پر امجد اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور خوشی سے چیخ و پکار کی۔ ٹریول ایجنٹ نے پوچھا کہ لندن جاتے وقت عمرہ کریں گے یا واپسی پر تو اس نے کہا کہ واپسی پر کروں گا۔

امجد صابری نے لندن میں بمشکل 6 دن قیام کیا اور جدہ آ گیا جہاں ایک فاروق نامی بنگلہ دیسی ٹیکسی ڈرائیور ملا جس نے اسے ہوٹل تک کروا کر دیا۔ رات جدہ میں گزاری اور صبح فجر پڑھ کر احرام وغیرہ باندھ کر کعبہ کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ، پیرحتی کے پورا جسم کانپ رہا تھا کہ وہ اللہ کے حضور پیش ہونے جا رہا ہے اور یہ سوچ رہا تھا کہ کون کون سی دعائیں پڑھوں گا۔ جب وہ پہنچ گیا تو نظریں جھکا کر کعبہ کی جانب بڑھا اور جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ سب کچھ ہی بھول گیا اور بس آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جو طواف مکمل ہونے تک نہیں رکے۔

یہ تھے امجد صابری۔۔۔!!!

☆☆☆

عشق جیسے ہے اک آندھی، عشق جیسے طوفاں
عشق کے آگے بے بس ہے دنیا میں ہر انسان
عشق میں سب دیوانے ہیں، عشق میں سب حیراں
عشق میں سب مشکل ہے، عشق میں سب آساں
تم سے مل کے دل کا ہے جو حال کیا کہیں
ہو گیا ہے کیسا یہ کمال کیا کہیں

فلم ”میں ہوں نا“ کے گیت پر ہال میں سونوگم اور امجد صابری کی آواز نے جیسے سب کو پاگل کر دیا تھا، مسلسل تالیوں کی گونج، منچلوں کا رقص اور جھومتے حاضرین یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ سونوگم کی آواز کی بیچ، لے، اتار چڑھاؤ کا اگر پاکستان میں کوئی مقابلہ ہے تو وہ امجد صابری ہے، اس دن امجد صابری نے کلاسیکل اور جدت کا امتزاج پیش

نوے کی دہائی میں پی این سی اے نے بین الاقوامی موسیقی کانفرنس میں آخری شام قوالی کے لیے منسوب تھی۔ غلام فرید صابری اور ان کے بھائی نے قوالی کا سیشن شروع کرنا تھا، وہ بھی امیر خسرو سے۔ پروگرام شالیمار باغ میں رکھا تھا۔ ہزاروں لوگ تھے، یونیورسٹی کے بچوں کو کہیں جگہ نہیں ملی تو زمین پر بیٹھ گئے۔ کیا اچھے زمانے تھے۔ نہ کوئی بدتمیزی نہ فقرہ بازی، ممنون تھے لڑکے لڑکیاں کہ ان کو زمین پر ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی ہے۔

قوالوں کی نشست ختم ہونے کے بعد بھی اس صف میں سے ایک نوجوان لڑکا کام میں مدد کر رہا تھا۔ نشست رات دو بجے ختم ہوئی۔ جب شائقین نے اس نوجوان کا نام پوچھا تو تو صابری صاحب نے خوش ہو کر کہا ”میرا بیٹا ہے، خود بھی اچھی قوالی کر لیتا ہے۔“

حال ہی میں ان کی ایک قوالی بھارتی فلم بجرنگی بھائی جان میں عدنان مسیح خان نے گائی جس پر انہیں اعتراض کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ انہوں نے بغیر اجازت یہ قوالی چوری کر کے اپنے نام سے فلم میں شامل کی تھی۔

غلام فرید صابری کے بیٹوں میں امجد فرید صابری بالکل اپنے والد کے انداز میں قوالی گاتے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ اکثر مختلف ٹی وی چینلز کے مارننگ شو میں نظر آتے تھے۔ امجد صابری نے امریکا، برطانیہ اور کینیڈا سمیت دنیا کے مختلف ممالک میں ٹرن کا مظاہرہ کیا اور اپنے والد اور چچا کے انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

امجد صابری کو پہلی مرتبہ عمرہ پر جانے کا اتفاق 1997ء میں ہوا جب لندن میں موجود بڑے بھائی کی شادی تھی۔ شادی میں شرکت کے لیے والدہ نے جانا تھا لیکن پاکستان سے روانہ ہونے کے دو دن قبل ہی ڈاکٹرز نے انہیں سفر کرنے سے منع کر دیا۔ اب شادی کے لیے بہت سارا سامان لے کر جانا تھا اور انگلینڈ کا ویزا صرف امجد کے پاس ہی تھا اس لئے

”اماں دل بہت اداس ہو رہا ہے“

امجد نے بے ساختہ کہا۔

”کیا بات ہے منے تم اتنے بڑے ہو گئے کہ

اماں سے باتیں چھپاؤ گے“

ماں نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

کہا۔

یہ بات سنتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے۔

”امی بس دل بہت عجیب ہو رہا ہے اور پتا نہیں

بس اللہ خیر کرے، آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ کل تک

سب ٹھیک ہو جائے گا بس اپنا خیال رکھیں، آپ کو

اپنے پوتے پوتیوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں“

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور ماں کو تسلی دے کر

اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

مگر نہ جانے کیوں ماں کا دل بہت عجیب سا

ہو گیا، ایسا لگ رہا تھا کہ کبھی باہر آ جائے گا، وہ اُس

کے کمرے میں گئی اور امجد کو آواز دی۔

”امجد بیٹا ذرا بات سنو“

”اماں خیریت تو ہے کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟“

امجد کمرے سے باہر آیا، پھر وہ ماں کے پاس آیا

اور انہیں ان کے کمرے میں لے کر گیا اور تسلیاں

دینے لگا۔ ماں کی نظر جب گھڑی پر پڑی تو صبح کے

8 بج گئے تھے۔

”جاؤ تم سو جاؤ، تمہیں صبح جلدی اٹھنا ہے اور

پھر پورا دن مصروف رہو گے“

ماں نے دنیا جہان کی محبتیں لہجے میں سو کر کہا۔

”اماں ایک دو دن کی بات ہے پھر تو بس سکون

کی نیند سونا ہے، ساری تھکن دور ہو جائے گی اور یہ

جو آپ میری فکر کرتی ہیں نا اس کی عادت ختم کر دیں

یہ کہہ کر اُس نے ماں کی آنکھیں بند کروائیں

اور اپنے کمرے میں چلا گیا، اُس روز وہ اپنی حمد

”کرم مانگتا ہوں، عطاء مانگتا ہوں“ مستقل گنگنا تا

رہا۔

”اماں یہ مغفرت کا عشرہ چل رہا ہے نا؟“

جاتے جاتے امجد ماں سے پوچھنے لگا۔

کیا، جب وہ خاص انداز میں ”اللہ“ کہتے تو ہال میں

شور مچ جاتا۔ یہ 2004ء میں سونو کے دورہ

پاکستان کا واقعہ تھا اور یہ پرفارمنس کراچی میں پیش

کی گئی۔

”میں دنیا کے کئی ممالک میں پرفارم کر چکا ہوں

لیکن میری دلی خواہش ہے کہ مراکش میں منعقد

ہونے والے سالانہ صوفی فیسٹیول میں حصہ لوں۔“

امجد صابری نے اپنی مخصوص عاجزانہ مسکراہٹ

کے ساتھ کہا۔

”آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی میرے آفس

بھیج دیں، میں عید کے بعد مراکش جا رہا ہوں، انشاء

اللہ اس بار منعقد ہونے والے صوفی فیسٹیول میں

آپ کو ضرور ساتھ لے جاؤں گا“

مشہور صنعت کار اور مراکش کے اعزازی سفیر

مرزا اشتیاق بیگ نے امجد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آپ رمضان المبارک میں اتنے سارے

چینلوں کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے ہیں“

اشتیاق بیگ نے بات آگے بڑھائی۔

”میرے پاس وقت کم ہے، میں چاہتا ہوں کہ

جلد از جلد پیار و محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں۔“

امجد صابری نے سنجیدگی سے کہا۔

”انشاء اللہ ہم بہت جلد مراکش ساتھ چلیں

گے۔“

اشتیاق بیگ نے یقین کے ساتھ کہا

اگلا ہی دن امجد صابری کی زندگی کا آخری دن

ثابت ہوا۔ اس کے پاس واقعی وقت کم تھا!!

تجھے کچھ وقت چاہیے مری جاں

وقت ہی تو نہیں بچا مرے پاس

☆☆☆

اپنی زندگی کی آخری سحری ٹرانسمیشن میں امجد

صابری اشک پار ہو گئے، گھر آئے تو والدہ بے چینی

سے ان کی منتظر تھیں۔

”منے، کیوں دل بھر آیا تھا تمہارا، طبیعت تو

ٹھیک ہے؟“

ماں نے تڑپ کر امجد کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

Downloaded From Paksociety.com



ماں نے نماز سے فارغ ہو کر اُس سے پوچھا۔
”ابا کے پاس“

امجد نے بر جتہ جواب دیا۔ ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔

”صبح سے کیا فال تو بکے جا رہا ہے“

ماں نے حقل سے کہا۔
تو ہنستے ہوئے کہنے لگا ”اماں فکر نہیں کرو میں

واپس ضرور آؤں گا“

امجد ہنسنے لگا۔

”زیادہ دھوپ میں مت نکلنا گرمی بہت زیادہ

ہے“

ماں نے تاکید کی۔

”امی گاڑی سے نہیں اتروں گا اب خوش

ہو جائیں۔“

امجد نے ماں کو یقین دلایا۔

”بیٹے تم گارڈ رکھ لو اب، زمانہ بدل گیا ہے مٹے“

ماں نے کسی اندیشے سے ہولتے ہوئے کہا۔

”ارے ماں جی، یہ لیاقت آباد ہے، میرا اپنا

علاقہ، ایک آواز دوں تو لوگ کھنچے چلیں آئیں، ان

”ہاں بیٹے یہ مغفرت کا عشرہ ہے“

ماں نے جواب دیا۔

”اللہ ہماری عبادتوں کو قبول کرے اور ہم

سب کی مغفرت کا اعلان کر دے، آمین“

یہ کہتے ہوئے امجد کمرے سے باہر چلا گیا۔

صبح جب 11 بجے کے قریب ماں کی آنکھ کھلی تو

امجد اٹھا ہوا تھا اور کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا

تھا، ماں نے اُس سے طبیعت پوچھی تو کہنے لگا جی

ابھی تو ٹھیک ہے۔ اپنے بچوں کو اٹھایا اور کہا کہ مجھے

دادا کا کلام ”لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی“ سناؤ،

جس پر بیٹے نے کہا کہ بابا آج نہیں کل سنا دوں گا

آج میرا دل نہیں چاہ رہا، جس پر اُس نے بے ساختہ

جواب دیا کہ ”ابھی بابا فرمائش کر رہے ہیں کہ تو نہیں

سنا رہے پھر جب تمہارا سنانے کا دل چاہے گا تو میں

نہیں سنوں گا“

اسی اثناء میں ظہر کی اذان ہوئی اُس نے

فرمائش پر لال کڑتا نکلوا کر پہنا، نماز ادا کر کے کہیں

کام سے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

”بیٹا کہاں جا رہے ہو“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

مہیب سوراخ نمودار ہو چکے تھے، خون امجد کے جسم سے بہہ کر نقاہت پیدا کر رہا تھا، پھر اسے لگا کہ کسی نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا ہے، وہی قاتل سامنے تھے۔ سلیم صابری بھی زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

”میرا قصور کیا ہے، مجھے مت مارو، رسول پاک کا واسطہ مجھے مت مارو، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میری ماں مر جائے گی“

امجد کے منہ سے ٹوٹے الفاظ نکلے مگر سر پر کیپ پہنے سفاک قاتل نے مزید دو گولیاں اس کے جسم میں اتاریں، سر پر گولی مار کر اسے اپنا مشن مکمل ہونے کا یقین ہو گیا، وہ لا پرواہی سے بائیک پر بیٹھ کر اسی لیاقت آباد سے حسن سکوائر کی طرف فرار ہو گیا کہ جس کے بیٹے کو مان تھا کہ اس کی ایک آواز پر لوگ دوڑے چلے آئیں گے، آج اس کا تنہا جسدِ خاکی پکار پکار کر اپنا قصور پوچھ رہا تھا۔

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

☆☆☆

امجد کسی کام سے گھر سے روانہ ہو گیا، اس دوران ماں کا دل مستقل گھبرا رہا تھا، دوپہر گھر پر لائٹ نہ ہونے کے سبب پڑوسی نے اطلاع دی کہ امجد کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے انتقال کی خبر ملی تو ماں نے خدا سے دعا کی کہ اللہ کرے یہ خبر جھوٹی ہو مگر کچھ ہی دیر میں اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔

اب شہید کی والدہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ زار و قطار رونے لگیں، جھریوں والے ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپایا اور ہچکیوں کے ساتھ کہا۔

”امجد اپنے بابا کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا“

ایک قیامت تھی جو ایک ضعیف ماں پر گزر گئی۔ بچے سکتے میں تھے، آج انہیں پتا چلا کہ دھوپ کیا ہوتی ہے، شجر کا کٹ جانا کتنا بڑا سانحہ ہے، گھر میں ہزاروں آشنا اور نا آشنا جمع تھے مگر کتنا سناٹا

گلیوں کا بیٹا ہوں میں، ان تھڑوں پر پل بڑھ کر جوان ہوا ہوں، بھلا مجھے کیا ڈر ماں جی“

امجد نے بشارت بھرے لہجے میں تین سوتے ہوا کہا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ مگر ماں کے دل کو قرار نہیں تھا۔

☆☆☆

22 جون 2016، رمضان المبارک کا مقدس مہینہ، سہ پہر چار بجے کے قریب سفید رنگ کی لکڑی گاڑی BEE797 کی ڈرائیونگ کرتے ہوئے امجد مسلسل اپنی بے کلی کے بارے سوچ رہا تھا، جانے کیا بات تھی کی آج اس کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا، ہر شے سونی اور ہر رنگ پھیکا لگ رہا تھا، ماں کا چہرہ تو ہر وقت آنکھوں میں رہتا ہی تھا مگر ساتھ ہی آج جانے کیوں اپنے والد مرحوم شدت سے یاد آ رہے تھے۔ ساتھ والی سیٹ پر اس کا اسٹنٹ، طلبہ نواز سلیم صابری بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی، آج گم صدم کیوں ہو“

سلیم نے کہا۔

”بس یار، زندگی سے دل بھر گیا ہے اب“

امجد نے اپنی روایتی مسکراہٹ سے بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

”امجد بھائی، آج تو روزہ لگ رہا ہے مجھے“

سلیم صابری نے بات بدلی۔

لیاقت آباد 10 نمبر پر معمول کی طرح بہت زیادہ رش تھا، فلائی اوور سے ٹرن کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار معمول سے زیادہ آہستہ کی گئی تھی مگر یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ اچانک امجد صابری کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا، گاڑی کے سامنے ایک بائیک آچکی تھی، پیچھے بیٹھے شخص کے ہاتھ میں بور کا پستل جھانک رہا تھا۔ اس نے سنبھلنا چاہا مگر اسے لگا کہ جیسے اس کے جسم اور سر میں کسی نے انکارے انڈیل دیے ہوں۔ تکلیف اور درد کی شدت رگ و پے میں پھیلتی چلی گئی۔ ایک بے اختیار کراہ امجد کے ہونٹوں سے پھوٹی۔ اس کا اسٹنٹ بھی خون میں تر تھا۔ ونڈ سکرین پر تین



تھا، وہ چشموں جیسی ٹھنڈی آواز، وہ رونق محفل نہ رہا تو بھیڑ میں بھی تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔ امجد صابری کی والدہ کے ہونٹوں پر ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔
”میرے بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، میرے بیٹے کا کیا قصور تھا“

تیرا نعم البدل نہیں کوئی

تو فقط ایک ہی تو تھا میرے پاس

دنیا بھر میں اس خبر پر سکتے طاری ہو گیا۔ پاکستان میں ان کے قتل کی خبر پر شدید عوامی رد عمل دیکھا گیا۔ پاکستانی صدر وزیر اعظم اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ، سندھ کے وزیر اعلیٰ سمیت کئی سیاسی رہنماؤں نے مذمت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی اداکاروں، گلوکاروں نے بھی اس کی مذمت کی۔ امجد صابری کے قتل پر بڑوسی ملک بھارت میں بھی کئی سلیبریٹز نے افسوس اور مذمت کا اظہار کیا جن میں سونو نگم، عالیہ بھٹ، شہناز بھٹ، کیلاش کھیر، رضا مراد وغیرہ شامل تھے۔ امجد صابری کی میت سرد خانے سے لیاقت آباد میں ان کی رہائش گاہ لائی گئی تو گھر میں کہرام مچ گیا جب کہ اس موقع پر ہر آنکھ اشکبار اور انتہائی رقت آمیز مناظر دیکھے گئے۔ امجد صابری نے سوگواران میں 2 بیوائیں اور 5 بچے چھوڑے جن میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے شامل ہیں۔ امجد صابری شہید 23 دسمبر 1976ء میں پیدا ہوئے اور 23 جون 2016 کو ان کی تدفین کی گئی اس طرح تین اور چھ کا ہندسہ ان کی زندگی میں بہت اہم رہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بہت اہم بات رہی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو اس وقت بھی رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا تھا اور افطار سے پہلے ان کی زندگی کا آغاز ہوا اور یہ بھی قدرت کا کمال ہے کہ رمضان المبارک میں ہی ان کی زندگی اختتام کو پہنچی اور افطار سے تقریباً 4 گھنٹے پہلے انہیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔

23 جون 2016 کو امجد صابری کو پاپوش نگر قبرستان میں، پیر حیرت شاہ واری کے دربار کے

احاطے میں، والد کی پہلو میں دفن کیا گیا، نماز جنازہ لیاقت آباد روڈ پر ارم بیکری کے سامنے ادا کی گئی، نماز جنازہ دربار بابا فرید کے گدی نشین دیوان مسعود چشتی نے پڑھائی، شدید گرمی کے باوجود جانے کہاں کہاں سے لوگ جمع تھے، لگتا تھا کہ پورا کراچی ہی اُٹ آیا ہے، اتنا عظیم الشان جنازہ کہ جس پر موت بھی رشک کرے، لیاقت آباد میں سیاہ جھنڈے لہراتے ماتمی فضا بنا رہے تھے، عورتیں، بچے، بزرگ دھازیں مار مار کر رو رہے تھے، وہ شخص چلا گیا کہ جو غلام رسول تھا، جو ملنسار تھا، جو اخلاق کا پیکر تھا، مسکراہٹ اور انکساری جس کے وجود کا حصہ تھے، جو بڑوں اور چھوٹوں سے یکساں عزت سے ملتا تھا، جو عالمی شہرت کا فنکار تھا مگر مٹی میں مٹی بن کر اسے خوشی ملتی تھی، ظلمت کی گھنی رات نے آسمان کا سب سے روشن ستارہ نکل لیا، ستارے ٹوٹتے جا رہے ہیں، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے..... رہے نام اللہ کا۔ !!!

اندر بھی زمیں کے روشنی ہو

مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

☆☆☆

پہلی سچ بیانی
اپنے دل سے اپنے شہروں سے منسوب ہو گئے ہیں
جن کو پڑھ کر دل کی گئی کی خوشی اس پاس نہیں ہوتی ہے

چاندنی



محمد سلیم اختر

اس اداکارہ کی کہانی جو ہر مرد کو بے وقافتگی بھی مگر ایک پرستار نے اس کی سوچ ہی بدل ڈالی

بڑا۔ اس کی خوب چٹائی کی گئی اور اس کے ساتھ ہی شوٹنگ منسوخ کر دی گئی۔ اور اس نوجوان کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

☆☆☆

وہ واقعہ اگلے دن اخباروں میں چھپا۔ اور لوگوں میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ اور اس کو اسکینڈل بنا کر پیش کیا۔ اگلے دن ہیروئن نے پریس کانفرنس کی اور فلموں میں کام نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ اخبار والوں نے اس نوجوان کو ہیروئن کا نام محبوب ظاہر کیا تھا۔ جبکہ وہ تو اسے جانتی بھی نہ تھی۔ ہیروئن کے پرستار اس کے فلمی دنیا چھوڑنے پر پریشان ہو گئے۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔ اس ہیروئن کا فلمی نام ”چاندنی“ تھا۔ وہ بہت ہی حسین اور بہترین اداکارہ تھی۔ اس کا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت جانا جاتا تھا۔ ”چاندنی“ اس کا نام ہی انگ انگ میں رس گھول دینے والا تھا۔ جس طرح خوش رنگ پھول گلستان کی خوش نمائی بڑھا دیتے ہیں۔ لگتا تھا خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو۔ بڑی بڑی ہر نی جیسی آنکھیں، ایسی آنکھیں

بھور بن ہوئی مری کے جنوب میں ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کے ایک رومانی منظر کی فلم بندی ہوتی تھی۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ کیمرہ مین، لائن مین اور ڈائریکٹر کے علاوہ ہیروئن بھی لوکیشن پر پہنچ چکی تھی۔ ہیرو نے چھوٹی سی ٹیکری کی روڈ سے نمودار ہونا تھا اور ہیروئن کے سامنے آ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کہنا تھا۔

”شمع! میں تمہیں اپنے آپ سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں۔“

یہ منظر ہیرو اور ہیروئن کو رپرسل کر کے سمجھا دیا گیا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ”اشارت“ کی آواز گونجی۔ ہیروئن تیار ہو گئی۔ مگر ابھی تک ہیرو نمودار نہ ہوا تھا۔ اس کے منظر میں آنے سے پہلے ہی شوٹنگ دیکھنے والے ہجوم میں سے ایک حسین و جمیل نوجوان آگے بڑھا۔ اور تیزی سے ہیروئن کے قریب جا پہنچا۔ اس نے ہیروئن کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ فلم کا اصل ہیرو بھی آ گیا۔ ڈائریکٹر نے ”کٹ“ کی آواز لگا کر فلم بندی روک دی۔ پھر کیا تھا۔ یونٹ کا ہر فرد اس نوجوان پر پل

ملک اور ملک سے باہر بھی مچ گئی۔ اس کی ہر فلم سپر ہٹ ہونے لگی۔ وہ واقعی بہت بڑی فن کارہ تھی۔ مگر اس کی ہر فلم کا بنیادی موضوع عورت ہوتی تھی۔ اور ساری فلم مرد کے منفی کردار کے گرد گھومتی تھی۔ وہ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے مساوی حقوق دینے کی حامی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنی بے پناہ خوب صورتی کے بل بوتے پر مرد ذات کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا اور وہ اس محاذ سے مردوں کی فطرت، ہرجائیت، یو الہوسی اور انا نیت پر تازہ توڑ حملے کرتی

جن پر غزل نہیں پورا دیوان لکھا جاسکتا تھا۔ پلیس اتنی گھنٹی تھیں کہ اپنے ہی بوجھ سے جھکی جھکی لگتی تھیں۔ رنگت ایسی کہ جیسے میدے کے پیڑے میں سرخ گلاب مل دیا ہو کسی نے۔ ہنتے ہوئے اس کے رخساروں میں گڑھے بڑ جاتے تھے۔ بال اتنے گھنے اور سیاہ تھے جن پر نظر پڑتے ہی ساون کی گھٹائیں بھی شرماتی تھیں۔ اس کے پرستار بے شمار تھے۔ میں بھی اس کا پرستار تھا۔ اور اس کی ہر فلم ایک بار نہیں کئی بار دیکھتا تھا۔ وہ اداکاری میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی اداکاری پر

Downloaded From
Paksociety.com



رہتی تھی۔ اس کی ہر فلم میں عورت کو مظلوم اور مرد کو ظالم ہی دکھایا جاتا تھا۔ اور فلم کے کلائمیکس میں وہ مرد کو اتنا تنگ کر دیتی تھی کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس نے ایک فلم ایسی بھی بنائی جس میں مرد کا کوئی کردار ہی نہ تھا۔ اور وہ فلم سپر ہٹ ہوئی تھی۔ اس کے اس انتقامی اور غیر معمولی رویے کی وجہ وہی بھور بن ہوئل والا واقعہ تھا۔ وہ اکثر اپنے

حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ چاندنی کے فلمی دنیا چھوڑنے کے اعلان سے کئی دن مر جھا گئے۔ اس نے وہ فلم مکمل کی تھی اور اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسی فلم میں کام تو نہ کیا مگر اس نے فلم سازی اور ہدایت کاری شروع کر دی۔ اور اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا اور اس کی بنائی ہوئی فلموں کی دھوم

انٹرویو میں صاف کہتی تھی کہ وہ صرف مخالف سے متنفر ہو چکی ہے۔ اور اس کی فلموں کی کامیابی اس کی مردوں سے نفرت کی عکاسی کرتی ہیں۔

☆☆☆

میں پھر بھی اس کا پرستار تھا اور اس کی فلمیں شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی کئی تصویریں میرے البم کی زینت بھی بنی ہوئی تھیں۔ میرے گھر میں میرے علاوہ میری چھوٹی بہن شیزی بھی اس کی پرستار تھی۔ ہم دونوں اکٹھے اس کی فلمیں دیکھا کرتے اور پھر اس کے حسن اور اداکاری کی تعریفیں کرتے۔ پھر شیزی کی شادی ہو گئی مگر چاندنی اس کی ہم سفر ہی رہی۔ شیزی کی زندگی نہایت ہی خوش گوار گزر رہی تھی۔ پھر چاندنی کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلمیں اس کی نجی زندگی پر اثر انداز ہونے لگیں۔ مردوں کے خلاف بنا کی ہوئی فلمیں اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے لگیں۔ شوہر کو مجازی خدا سمجھ کر اس سے نباہ کرنے والی شیزی صبر کی نعمت سے محروم ہو گئی۔ اس کی زبان چاندنی کی زبان بن کر کھلنا شروع ہو گئی۔ اس کا شوہر کمال احمد محبت کرنے والا۔ مگر ایک سخت گیر شخص تھا۔ شیزی کے رویے نے اسے روایتی شوہر بنا دیا۔ ان کی ازدواجی زندگی تہس نہس ہو گئی۔ محبت کی بھلوانی نفرت کی آگ میں جلنے لگی۔ بالآخر کمال نے شیزی کو طلاق دے ڈالی۔ شیزی نے گھر واپس آ کر بہت ہنگامہ کیا اور مجھے کمال کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ میں نے کمال سے لڑائی جھگڑا کیا۔ اس لڑائی میں میرے ہاتھوں کمال کا قتل ہو گیا۔ اور میں گھر سے فرار ہو گیا۔ قانون اور پولیس سے بچنے کی خاطر میں بھاگتا بھاگتا علاقہ غیر جا پہنچا۔ یوں میں پولیس سے بچ کر محفوظ تو ہو گیا مگر مجھے کس پل چین نہ تھا۔ کمال کو قتل کر دینے کا مجھے افسوس تھا اور پچھتار ہا تھا کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ اس قتل کا ذمہ دار میں ہوں شیزی یا پھر چاندنی؟ تین ماہ علاقہ غیر میں گزر گئے۔ اس عرصہ میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سارے

وقوعہ کی ذمہ دار چاندنی ہے۔ لہذا میں نے چاندنی کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔ یہی سوچ اور فیصلہ مجھے علاقہ غیر سے واپس لے آیا۔ میرے پاس اسلحہ بھی تھا اور جیب میں پیسے بھی تھے۔ میں پوری تیاری اور احتیاط کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے چاندنی کی رہائش کا بخوبی علم تھا۔

☆☆☆

رات کے ٹھیک دس بجے تھے۔ جب چاندنی کی خواب گاہ کی کھڑکی کھلی اور میں دھم سے اندر کود گیا۔ نرم قالین نے میرے قدموں کی آواز کو جذب کر لیا۔ میں نے دیکھا نائٹ بلب کی روشنی میں ایک قیمتی مسہری پر ایک حسین جسم سجا ہوا تھا۔

”چاندنی عزیز، عمر 28 سال۔ دراز قد، سفید رنگ دکش چہرہ۔ غیر شادی شدہ“ وہ اپنے ادھیڑ عمر باپ کے ساتھ اس کونٹھی میں تنہا رہتی تھی۔ دو تین ملازم تھے جو سرورنٹ کو آرٹرز میں سو رہے تھے۔ چونکہ چاندنی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میں اسے ایک کونٹھی میں چھوڑ کر باہر سے کنڈی لگا آیا تھا۔ کچھ نیم خاناماں کے سر پر میں نے چونکہ چاندنی سے چھینی ہوئی بندوق کا ایسا بٹ مارا کہ وہ صبح سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے کھڑکی کی چھتی چڑھائی۔ دروازے کی چھتی تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ بندوق دائیں ہاتھ میں تھام کر میں نے پایاں ہاتھ چاندنی کے منہ پر جمادیا۔ وہ کسمسا کر جاگی اور خوف ناک منظر دیکھ کر پوری قوت سے چلائی۔ لیکن وہ آواز اس کے حلق کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ پھر اس کا ہاتھ نہایت تیزی سے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہ کال ٹیبل کا بٹن دبانے چاہتی تھی۔ لیکن میں نے پھرتی سے ٹانگ مار کر ٹیبل دور کھسکا دی۔ چاندنی پھٹی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس حالت میں بھی اس کا جسم قیامت ڈھار ہا تھا۔ میں نے کہا۔

”جان من! کھڑکی سے باہر دیکھو۔ زبردست بارش شروع ہو گئی ہے۔ تمہارے نوکروں کی کونٹھیاں اتنی دور ہیں کہ چیخ چیخ کر تمہارے

لیکن اس کا ہاتھ چٹھی تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا مضبوط ہاتھ اس کی نازک کلائی پر پڑا۔ ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ اڑتی ہوئی مسہری پر جا گری۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے نہایت ہی سفاکی سے بندوق کی نالی اس کی گردن پر رکھ دی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے کہا۔

”میں جرم کے جس درخت کا پھل کاٹنے والا ہوں۔ اس کی جڑیں تم تک پہنچتی ہیں میڈم۔“ میری بہن کی زندگی بڑی خوش گوار گزر رہی تھی اور پھر اس کی زندگی میں تم اور تمہاری فلمیں آئیں اور اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول گئیں۔ میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ گیا تو میں نے اپنے بہنوئی کا خون کر ڈالا۔ اب میں پولیس اور قانون کی نظروں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ میں اب جلد گرفتار ہو جاؤں گا اور سزا بھی بھگتوں گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی سزا تمہیں ملے لیکن اس میں جتنا قصور تمہارا ہے اس کی سزا تو تمہیں ضرور ملنی چاہیے۔ میں تمہارا پرستار تھا اور اب بھی ہوں۔ تمہاری اداکاری اور حسن پاگل کر دینے والے تھے۔ آج تمہارے حسن کا جی بھر کر دیدار تو کروں گا۔“

چاندنی اب بُری طرح سہم گئی تھی۔ وہ میرے آگے بے بس ہو گئی تھی۔ میں نے خود ہی فریج کھولا اور کچھ پھل لے کر دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ کچھ سے انگور نوتے ہوئے میں نے بندوق کو حرکت دی اور سردوسفاک لہجے میں کہا۔

”چاندنی جی! اٹھو اور ڈریسنگ روم میں جا کر اپنا سب سے پسندیدہ لباس پہنو اور ایسا بھرپور اور جاندار میک اپ کرو۔ کہ آج تمہارے ترکش کا کوئی تیر باقی نہیں بچنا چاہیے۔ چلو شاباش جلدی کرو۔“ میرے لہجے میں کچھ ایسی دھمکی پوشیدہ تھی کہ چاندنی خوف زدہ ہو کر زرد پڑ گئی۔ وہ لرزاں قدموں کے ساتھ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ تو میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”فلموں والی کوئی ہوشیاری نہیں چلے گی میڈم! میرے ہاتھ میں بندوق ہے۔ اور میں تمہیں بتا چکا

پھیپڑے بھی چاک ہو جائیں تو تمہاری آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔ رہا چوکیدار تو وہ رسیوں سے بندھا ایک اندھیری کوٹھڑی میں پڑا ہے اور تمہارا خانساں باورچی خانے کے کیلے فرش پر گہری نیند سو رہا ہے۔ باقی رہا تمہارا بوڑھا باپ تو اس کو انٹر کام پر بلانے کی حماقت تم یقیناً نہیں کرو گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ دل کے مریض ہیں۔ انہیں دو ایک ہو چکے ہیں اور آج کی رات تیسرا ایک ان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ لہذا مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹالوں تو تم چپ چاپ بیٹھی رہو گی۔

چاندنی کی آنکھوں میں نظر آنے والی پریشانی مزید گہری ہو گئی۔ اسے میری باتوں کا یقین ہو گیا تھا۔ میں نے بندوق کو جنبش دی اور اس کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور کھڑکیوں کے آگے ویزر پر دے کھینچ دیے۔

”میں شاہ جہاں ہو میڈم!“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”مم..... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ چاندنی کی لرزاں آواز اب بھری۔

”تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا..... لیکن تمہاری فلموں نے میری زندگی برباد کر دی ہے چاندنی عزیز۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ کھٹکھٹائی۔

”میڈم چاندنی۔ میں ایک پڑھا لکھا شخص ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں اور کروں گا اس کے لیے میرے پاس ایک معقول جواز ہوگا۔ آج رات میں تمہارا مہمان ہوں۔ اور تم میری میزبانی کرو گی۔ اگر فریج میں کچھ کھانے پینے کے لیے ہے تو نکال لاؤ۔“ میرا لہجہ کچھ ایسا تکمسانہ تھا کہ وہ خود بخود بستر سے اتر آئی۔ فریج کھول کر اس نے اندر جھانکا اور اپنے بڑھتے ہوئے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ فریج سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے تیزی سے سوچا اور ایک فوری حرکت کے تحت دروازے کی طرف لپکی۔

ہوتے۔ تم اپنی نئی فلم میں یہ تذکرہ ضرور کرنا۔ ایک ایسے مرد کا۔ جو کنوارا جوان تھا۔ اور مجرم بھی تھا۔ وہ ایک رات تمہاری خواب گاہ میں آیا تھا۔ اس نے تمہارے حسن اور دلکشی کے تمام تیر اپنے سینے پر جھیلے تھے اور اپنی زندگی کی سب سے حسین رنگین اور مہربان رات تمہیں یہ بتانے کے لیے قربان کر دی تھی کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے ہر کا اپنا اپنا طرف ہوتا ہے۔

ملک کی سب سے مصروف اور ذہین ہدایت کار جو فلم کو مشن سمجھ کر بناتی تھی۔ بے دم ہو کر مسہری پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہ نکلے۔ ”کٹ..... کٹ!“ وہ دل میں چلائی۔ لیکن اشکوں کا سیلاب۔ شاید نفرت کے سارے قلعوں کو بہا لے جانے کی قسم کھا چکا تھا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔ تو اس نے پکارا۔ ”شاہ جہاں۔“ مگر میں نہ رہ سکا۔ میرا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ جہاں میں نے گرفتاری دے دی۔

☆☆☆
جیل میں مجھے ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے۔ کہ میری رہائی کا حکم آ گیا۔ میں جب جیل سے باہر نکلا۔ تو چاندنی کو پھولوں کے ہار اٹھائے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ہار ڈالا اور مبارک دی۔

”میڈم یہ سب کیسے ہو گیا؟“ میں نے آنکھوں میں حیرانی کے سائے لہراتے ہوئے کہا۔
”میں نے کمال کے گھر والوں کو خون بہا ادا کر کے تمہاری معافی کرائی ہے۔ کیوں کرائی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تم مجھے ساری دنیا کے مردوں سے مختلف لگے ہو۔ اتنے مختلف کہ میرے دل میں بس گئے ہو۔“

چاندنی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو مجھے یوں لگا کہ میرے چاروں طرف رنگ برنگ پھول کھل اٹھے ہوں۔

☆☆☆

ہوں کہ میں قاتل ہوں۔“

چاندنی نے میری بندوق کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور ایک گھنٹے بعد بن سنور کر باہر نکلی۔ وہ سچ سچ کی دلہن لگ رہی تھی۔ اس نے کسما کر آنکھیں کھولیں۔ منظر وہی لگ رہا تھا۔ جیسا فلموں میں اس وقت دکھائی دیتا ہے۔ جب ہیروئن عروسی جوڑے میں ملبوس صبح کے وقت بیچ سے اٹھتی ہے اور سوچتی ہے کہ رات بھر اس کا دولہا کیوں نہیں آیا۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ چاندنی کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ بن سنور کر مسہری پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا سراپا اس وقت قیامت ڈھار ہا تھا۔ میں بندوق گود میں رکھے اسے دیکھتا رہا۔ پتھر کی طرح ساکت اور بے حس و حرکت۔ اس کے حسن لازوال نے مجھے مہبوت کر ڈالا تھا۔ اس کا حسن و شباب دو آتشہ بن گیا تھا۔ میرا جسم جلنے لگا۔ دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں اور میں دہکتے جذبات کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اس کے جسم کی تپش اور مہک میرے وجود میں رچ بس گئی تھی۔ پوری رات ایک بے جنبش خاموشی کے سائے میں گزر گئی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کس وقت اونگھ آگئی اور وہ تکیے سے ٹیک لگائے سو گئی۔ اس نے اپنا آپ گویا مجھے سوپ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ ہر طرح سے میری دسترس میں تھی۔ میرا انتقام کہہ رہا تھا کہ میں اسے روند ڈالوں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ شاید میں بزدل تھا۔ صبح ہو گئی تھی۔ مؤذن کی آواز واضح سنائی دینے لگی۔ تو میں نے بندوق کے بٹ ہی سے اس کو جگایا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور اپنے لباس اور اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ دونوں ہی سلامت تھے۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ میں نے اس کے جسم کو چھوا تک نہیں تھا۔ میں اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی بولا۔

میڈم چاندنی! صبح ہو گئی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ یقین جانو میں نے تمہارے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تمہیں یہ بتانے اور احساس دلانے کے لیے کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں

دوسری سچ بیانی

جائے مسکون



ضرفام محمود

حسد کی آگ میں اپنے ہی گھر کا سکون برباد کر دینے والی ایک عورت کا کارنامہ بند

میں ہمت کر کے بستر سے اٹھی میرا سر بے حد
بھاری ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرے
سر پر منوں بوجھ لا دیا ہو۔ میرا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا
حالانکہ رات میں ٹھیک ٹھاک سوئی تھی مگر صبح مجھ سے

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”کیا ہوا کنول بیٹا؟“ امی جان نے فکر مندی سے پوچھا۔

”امی..... امی..... وہی خواب جو میں کئی دن سے دیکھ رہی تھی مگر آج تو جاگتی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت میرا گلابا بنا چاہتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹا! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے آپ کا وہم ہو گا۔“ چچی سلٹی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی کو کسی اللہ والے کے پاس لے جائیں۔ یہ ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہے۔“ امی جان ابا جان کی جانب مڑتے ہوئے بولیں۔

”کیسی احمقوں والی بات کر رہی ہو۔ اس کو دوا پلاؤ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ابا جان نے جواب دیا اور کمرے سے چلے گئے۔ امی جان نے مجھے ڈاکٹر کی دی ہوئی کڑوی دوا پلائی۔ ان ہی کی زبانی پتا چلا کہ میں جاہ نماز پر بے ہوش پائی گئی تھی اور تقریباً دس گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا، دوا پی کر مجھ پر پھر غنودگی چھانے لگی اور میں سو گئی۔

☆☆☆

”جائے سکون“ اس سے آپ کیا سمجھے۔ کچھ نہیں۔ یہ میرے گھر کا نام ہے ”جائے سکون“ یہ بڑا سا گھر دادا جان نے بنوایا تھا کہ ان کی تمام اولاد سکون سے ایک گھر میں رہے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دادا جان کی سات میں سے پانچ اولادیں جوان ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں، بس میرے ابا جان حاجی منظور احمد اور میرے چاچو حاجی ضمیر احمد ہی باقی بچے۔ دادا جان کے انتقال کے بعد بھی ابا جان اور چاچو نے دادا کی خواہش کا احترام کیا اور اس گھر میں ساتھ ساتھ رہے۔ اس جائے سکون میں ابا جان، امی جان اور میرے علاوہ میرے بڑے بھائی دانیال بھائی رہتے ہیں جب کہ چاچو اور سلٹی چاچی کے دونوں بچے قمر اور مہک بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ قمر مجھ

اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھی اور صحن میں لگے تل تک پہنچی، میرا مقصد وضو کرنا تھا۔ فجر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں نے تل کھول کر وضو کرنا شروع کیا پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا تھا میں بار بار وضو کرنا کیوں بھول رہی ہوں۔ مندھونے جانی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ میں نے کلی نہیں کی، میں نے بار بار سر کو جھٹک کر پریشان کن خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا، جیسے تیسے وضو کر کے میں نے جاہ نماز بچھائی اور نماز کے لیے کھڑی ہوئی اچانک شدید بدبو کے بھکے میری ناک میں گھسنے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا مجھے ابکائی آگئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے ابکائی روکی مجھے ایسا لگا جیسے کسی انجانی قوت نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ میں اپنی جگہ سے ایک انچ نہ اٹھ سکی۔ اچانک مجھے سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ وہ خوب صورت اور دراز قد عورت تھی مگر..... مگر اس کے جسم سے اٹھتی بدبو میری سانس روک رہی تھی۔ اس عورت کی آنکھوں میں شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس کے ہاتھوں سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ وہ عورت میرے اور قریب آگئی۔ اس کے سنہری بال میرے گالوں سے نکل رہے تھے۔ اچانک اس عورت کی صورت بدلنے لگی۔ اس کے موتی جیسے دانت باہر کو نکلنے لگے ذرا سی دیر میں اس کی شکل بدل گئی۔ وہ ایک خوب صورت عورت سے ایک گریہ صورت چڑیل بن چکی تھی۔ اس کے پاس سے کھنک کی ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا نہ جانے کتنے دنوں پرانا گوشت سڑ گیا ہو جس میں کیڑے لگ گئے ہوں مگر وہ عورت نہایت اطمینان کے ساتھ میرے پاس کھڑی تھی۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پھر میرا سراتی زور سے چکرایا کہ میں جاہ نماز پر ہی گر گئی اور مجھے ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو تمام گھر والے میرے اطراف کھڑے تھے۔ ابا جان، امی جان، چاچو، چچی جان، دانیال بھائی، قمر اور مہک سب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔

گئی۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی ہی تھی کہ میری ناک میں بدبو کی ایک لہر گھس گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہی تھی۔ وہ عورت جس نے میری زندگی جہنم بنا دی تھی۔ وہ کھلی کھڑکی سے کسی دھوئیں کی مانند کمرے میں آئی اس کے جسم سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا وہ اپنی انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“ اس کی آواز گونجی۔

میں نے کسی معمول کی طرح کتاب اس کی طرف بڑھائی مگر پھر بے اختیار چیخ پڑی۔ میرے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی بلکہ میرے ہاتھ پر انتہائی گندے اور غلیظ کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور دونوں ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر کیڑوں کو خود سے دور کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

”اب اگر تم نے کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تو.....“

”خدا کے لیے میرا بچھا چھوڑ دو۔“ میں چیخی مگر وہ قہقہہ لگاتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے، اس کے ہاتھوں سے نکلنے والی گندی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس عورت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑ لی۔ میری گردن کی ہڈی پھینکنے لگی۔ اس عورت کی گرفت بہت سخت تھی۔ مجھے لگا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں نے کلمہ پڑھنا چاہا مگر مجھے کلمہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تو میرے منہ سے کلمہ طیبہ بلند ہوا۔ کلمے کے الفاظ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا ہو۔ اس عورت کے ہاتھوں سے میری گردن چھوٹ گئی اور اس عورت کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ وہ ایک خوب صورت عورت سے بھیانک اور کریمہ چہرے والی چڑیل بن گئی۔ جس کے سارے دانت باہر تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بہت بڑی اور باہر کونکلی ہوئی تھیں۔ اس کے جڑے انتہائی حد تک بڑے تھے کہ اس کا حلق تک نظر آ رہا

سے دو ماہ بڑا تھا اور ہبک مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارا گھر واقعی جائے سکون ہے اس گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا کوئی چیخ نہیں ہے حالانکہ ابا جان اور چاچو کا کاروبار الگ الگ ہے مگر گھر میں سب شرد و شکر ساتھ رہتے ہیں۔ ابا جان کی مارکیٹ میں چلتی ہوئی بڑی سی گارمنٹس کی دکان ہے۔ دانیال بھائی ابا جان کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں جب کہ چاچو گاڑیوں کے اسپئر پارٹس کا کام کرتے ہیں۔ میری اس گھر میں ایک الگ شان ہے۔ وجہ کیا ہے یہ آپ سوچ رہے ہوں گے۔ چلیے میں بتاتی ہوں۔

ہمارے گھر میں تعلیم کا کوئی زیادہ رواج نہیں ہے۔ امی اور چاچا نے تو شاید اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ ابا جان اور چاچو بھی پرائمری تک ہی پڑھ سکے۔ دانیال بھائی نے جیسے تیسے میٹرک کیا اور کاروبار میں ابا جان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ قمر نے بھی دو سال فیل ہونے کے بعد اس سال میٹرک کیا ہے جب کہ مہک ابھی نائن کلاس میں ہے مگر وہ بھی پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں ہے۔ اگر اس خاندان میں کوئی پڑھائی میں اچھا ہے تو وہ میں یعنی کنول منظور احمد ہوں۔ میں نے میٹرک میں بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب انٹر میں بھی میری پوزیشن آئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر میں بے حد محنت کر رہی ہوں۔ دو ہفتوں بعد میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ ہونے والے ہیں مگر پچھلے تین دن سے میری حالت بہت بری ہے۔ میں کتاب اٹھاتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرا دماغ جکڑ لیا ہو۔ دو دو گھنٹے پڑھنے کے باوجود میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

ایک دن آرام کے بعد میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میڈیکل کے ٹیسٹ میں چند دن رہ گئے تھے۔ میں نے اپنی تمام کتابیں صاف کیں اور یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لیے کمرہ بند کر کے بیٹھ

نے ماموں کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

”کنول کی طبیعت کئی دن سے خراب ہے اور مجھے خبر تک نہیں کی۔ اگر آج صبح قمر مجھے فون کر کے کنول کے بارے میں نہ بتاتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔“ ماموں جان نے امی سے گلہ کیا۔

”ہم لوگ اس کی طبیعت کی وجہ سے اتنے پریشان تھے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہا۔“ امی جان نے عذر پیش کیا۔

”کیسا ہے میرا بیٹا۔“ ماموں جان نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تو میں ہلکے سے مسکرا دی۔ ماموں جان بغور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے میری آنکھوں کا معائنہ کسی ڈاکٹر کی طرح کیا۔ پھر ہولے ہولے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے۔

”بھائی جان میری بیٹی کو کیا ہوا ہے؟“ امی جان نے ماموں سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کسی نے اس پر گنداعلم کروایا ہے جیسے جادو ٹوٹا یا سٹپنی وغیرہ۔ میں نے یہاں آنے سے قبل اپنے پیرو مرشد سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کنول کو ان کے پاس لے کر آؤ لہذا میں کنول کو لینے آیا ہوں۔“

”ہاں..... ہاں بھائی جان ضرور لے کر جائیں میری بیٹی کو۔ اللہ اس کو تندرستی دے۔“ امی جان بولیں۔

”جلدی سے کنول کو تیار کر دو میں اسے ابھی حیدرآباد اپنے مرشد کے پاس لے کر جاؤں گا۔“

”حیدرآباد..... اتنی دور۔“

”دو گھنٹے کا راستہ ہے حیدرآباد کا۔ شام تک واپس آجائیں گے۔“ ماموں جان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور قمر، ماموں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھے حیدرآباد کی جانب جا رہے تھے۔ راستے میں ماموں جان نے بتایا کہ ان کے مرشد جنہیں سب شاہ جی کہتے ہیں بڑے اللہ والے بزرگ ہیں۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد ماموں نے گاڑی شاہ جی کے گھر کے سامنے روکی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر

تھا۔ اس کے سر کے بال نہ سفید تھے نہ کالے وہ انتہائی کر یہ صورت تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لاکھی پکڑی ہوئی تھی جس سے ایک سائب لپٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے پھر ایک قہقہہ نکلا اس کا قہقہہ میرے کانوں میں پھلے ہوئے سیسے کی مانند گھس رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا پھر بھی اس چڑیل کی آواز میرے کانوں میں گھس رہی تھی۔ ”نہیں چھوڑوں گی تجھے نہیں چھوڑوں گی۔“ یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

☆.....☆

”خدا کے لیے میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے کر جاؤ۔“ امی جان ابا جان سے بولی تو ابا جان نے فکر مندی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”دیکھو ذرا دو دن میں کیسی ہلدی کی طرح پیلی ہو گئی ہے۔ کہاں تو اس گھر میں اس کے قہقہے گونجتے تھے اور اب قہقہے کی خاموشی چھا گئی ہے۔“ امی منسلل بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کی بڑبڑاہٹ سے تنگ آکر ابا جان کمرے سے باہر چلے گئے۔

”ہائے اللہ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں کیا کروں۔“ امی جان رونے کے انداز میں بڑبڑائیں۔ میں انتہائی نقاہت کی حالت میں بستر پر لیٹی تھی کہ اسی وقت قمر کمرے میں داخل ہوا اور امی جان کو سلام کرتے ہوئے بولا۔

”مائی امی..... کنول کے ماموں آئے ہیں۔“

”ہاشم بھائی..... ہاشم بھائی آئے ہیں۔“ امی جان نے قمر سے پوچھا۔ اسی وقت ہاشم ماموں کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“

”کیسی طبیعت ہے کنول کی۔“ ماموں جان نے پوچھا۔

”بھائی جان۔“ امی جان دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگیں۔

”ماموں..... کنول کی حالت کئی دن سے خراب ہے مگر دونوں سے تو اس کی طبیعت میں کوئی سدھار نہیں آ رہا۔“ امی جان سے جب بات نہ کی گئی تو قمر

آ رہا ہے وہ آپ کو خود حل کرنا ہوگا۔ میں آپ کو صرف راستہ بتا سکتا ہوں۔ اس راستے پر چلنا، مشکلات اٹھانا آپ کی ذمہ داری ہے اگر آپ نے میرے بتائے ہوئے طریقہ کار پر عمل کیا تو انشاء اللہ آپ کا یہ مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔“

میں غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے جو بات ان کی طرف کھینچ رہی تھی وہ ان کے چہرے کا تقدس تھا ان کی شخصیت میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ انہوں نے تفصیل سے مجھے سے سارے حالات سنے۔

”کیا آپ کا خیال ہے، مجھ پر کسی نے جادو وغیرہ کر دیا ہے۔“ تمام حالات بتانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

”یقیناً جادو برحق ہے۔ ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو کیا گیا تھا اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے امت کو معوذتین کا تحفہ دیا، معوذتین یعنی سورہ اللہ اور سورہ الناس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے لیے تحفہ ہیں۔ جادو اور سفلی کا توڑ ان دو سورتوں میں موجود ہے۔“

”شاہ جی جادو کیسے ہوتا ہے؟“ قمر جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا۔

”جادو عموماً شیاطین سے مدد مانگی جاتی ہے مطلب غیر اللہ سے مدد طلب کی جاتی ہے اسی لیے جادو کو شرک جیسے گناہ نے گناہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر یہ اہم بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی پر جادو یا سفلی کروانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ عموماً قریبی لوگ ہی مہیا کر سکتے ہیں۔“

”کنول پر ہمارے گھر میں سے کسی نے جادو کروایا ہے؟“ قمر نے حیرت سے پوچھا۔

”ضروری نہیں ہے اکثر کوئی گھر والا نادانی میں کسی باہر والے کی مدد کر بیٹھتا ہے۔ تم بلاوجہ شک نہ پالو۔“ شاہ جی نے قمر سے کہا پھر میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے۔ ”باقاعدگی سے نماز پڑھا کرو اور باوجود رہنے کی کوشش کرو۔ معوذتین پڑھتی رہو جو

نیچے اترے اور گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی میں تم کا سہارا لے کر گاڑی سے اتری اور گھر کی جانب بڑھی۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کسی طاقت نے میرے قدم جکڑ لیے ہوں، مجھ سے ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہو گیا۔ میں مضبوطی سے قدم جما کر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا۔ آگے کیوں نہیں بڑھ رہی ہو۔“ قمر بولا پھر اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ گھبرا گیا۔ میرا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں انکارہ بنی ہوئی تھیں۔

”ماموں.....“ قمر زور سے چیخا تو ماموں جان نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا اسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور ایک نورانی صورت کے بزرگ جن کی لمبی لمبی سی سفید داڑھی تھی۔ سفید کرتا پا جامہ پہنے اور سر پر سفید کروشے کی ٹوپی پہنے گھر سے باہر نکلے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ساری صورت حال سمجھ گئے۔ انہوں نے قمر سے میرا ہاتھ چھوڑنے کا کہا اور قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے میرے قدم چھوڑ دیے ہوں۔ میرے قدم خود بخود گھر کی جانب اٹھنے لگے۔ شاہ جی نے گھر کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی تو ایک بڑی عمر کی عورت گھر سے نکلی۔ شاہ جی نے اسے کچھ کہا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر کے اندر لے گئی۔ گھر کے اندر پہنچ کر اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا۔ کمرے میں ہر چیز سفید تھی۔ درو دیوار سے لے کر کمرے کا فریجچر تک سفید تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے پاکیزگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ تھوڑی دیر میں شاہ جی بھی کمرے میں داخل ہوئے اور باواز بلند سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ شاہ جی زمیں پر پچھی فرشی دری پر بیٹھ گئے۔ میں، ماموں اور قمر ان کے سامنے ادب سے دوڑانو ہو کر بیٹھ گئے۔

”کنول پٹنا! پہلے تو یہ بات آپ سمجھ لیں کہ میں آپ کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا جو مسئلہ آپ کے ساتھ پیش

خصوصاً اسی مقصد کے لیے اتاری گئی ہے۔ رات کو سوتے وقت با وضو سونے کی کوشش کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر سویا کرو اور کوشش کیا کرو کہ فجر کی نماز کے بعد قرآن ضرور پڑھا کرو اس سے تمہارا دماغ روشن ہوگا اور تمہیں سکون میسر آئے گا اور اٹھتے بیٹھتے آیت الکرسی اور معوذتین کی تلاوت کی عادت ڈال لو، اللہ تمہارے سامنے سارے بھید کھول دے گا۔ بس وہ ہی پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی ہمارا مددگار، یالن ہار نہیں ہے۔ اس یقین کے ساتھ دعا مانگو گی تو کبھی بارگاہ الہی سے خالی ہاتھ نہیں لوٹائی جاؤ گی۔ ہر تکلیف میں صبر اور کلام الہی سے مدد حاصل کرو یقیناً کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔“

شاہ جی نے دعا دے کر ہمیں رخصت کیا۔ میرا دل جو ایمان سے خالی ہو رہا تھا۔ آج پھر بھر گیا جب میں شاہ جی کے گھر سے باہر نکلی تو ایک دم ہلکی پھلکی تھی۔ شاہ جی کی رہنمائی نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔ شاہ جی کے گھر سے لوٹنے کے بعد میں ذہن میں این کی ہر بات دھرا رہی تھی۔ اب میری کوشش ہوتی تھی کہ میں ہر وقت با وضو ہو کر کبھی آیت الکرسی پڑھتی اور کبھی معوذتین کی تلاوت کرتی، قرآن اور مہک نے میرا بہت ساتھ دیا جب میں خاموش ہوتی تو مہک پاؤں بلند قرآن کی تلاوت کرنے لگتی۔ میں نے شیخ وقتہ نماز کو اپنی عادت بنا لیا، میری کوشش ہوتی کہ میں زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کروں۔

☆.....☆

ایک رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں تھوڑی دیر ہی سوئی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بے انتہا بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جب سے میں شاہ جی کے گھر سے واپس آئی تھی میری طبیعت بہت بہتر تھی۔ مجھے اس چڑیل نے تنگ نہیں کیا تھا مگر آج رات بے چینی اپنے عروج پر تھی میں تھوڑی دیر خالی الذہن بستر پر لیٹی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر میں انھی اور وضو کر کے تہجد کی نماز کے لیے جاؤ نماز پر کھڑی ہو گئی۔ اب میں نماز مکمل یکسوئی اور خلوص کے ساتھ پڑھتی تھی۔ قرآن کا ایک ایک لفظ پوری طرح سمجھ کر ادا کرتی تھی اب مجھے نماز

میں لطف آنے لگا تھا۔ مجھے نماز میں سکون ملتا تھا۔ میں سورہ فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ سورہ فاتحہ جس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی بڑائی بیان کی ہے کہ وہ رب ہے تمام جہانوں کا وہ رحمن و الرحیم ہے، وہ مالک ہے یوم حساب کا اور پھر سورہ فاتحہ کے آخر میں انسان اپنے لیے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے سیدھے راستے چلانا۔ اس راستے پر جو تیری خوشنودی کا راستہ ہے۔ نماز ادا کر کے میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”اے اللہ! اپنی اس ناچیز بندی کو معاف فرما۔ اے اللہ تو دلوں کا بھید خوب جانتا ہے دل میں موجود راز تیرے سامنے آشکار ہے۔ اے اللہ تو ہماری شہ رگ سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ اے اللہ تو ستر ماؤں سے زیادہ اپنی مخلوق سے پیار کرنے والا ہے۔ اے اللہ اگر مجھ ناچیز بندی سے کبھی دانستگی یا نادانستگی میں کوئی غلطی کو تباہی کوئی لغزش ہو گئی ہو تو معاف فرما۔ اے اللہ مجھے ہر قسم کی تکلیف سے نجات دے اور جو میرے لیے بہتر ہو ویسا میرے لیے ماحول پیدا فرما دے۔ اے اللہ! مجھ پر سچائی ظاہر کر دے۔ اے اللہ! مجھ پر سچائی ظاہر کر دے۔ اے اللہ! مجھ پر سچائی ظاہر کر دے۔“

میرا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنسو میرے چہرے سے ٹپک ٹپک کر جاؤ نماز پر گر رہے تھے اسی وقت مجھے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔

”رات کے اس پہر کون ہے؟“ میں نے سوچا اور جاؤ نماز سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ ایک سایا جو مکمل طور پر سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا ہمارے گھر کے پیچھے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک بڑا سا میدان تھا۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہاں جا بجا خود رو جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ میں دبے قدموں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے اس سائے کا پیچھا کرنے لگی۔

یہ شخص کون ہے اور ہمارے گھر میں کیا کر رہا تھا اور اب کہاں جا رہا ہے۔ میرے ذہن میں مختلف سوالات کلبلا رہے تھے۔ میں آیت الکرسی کا ورد

اس شخص نے گڑیا کو برگد کے درخت کی چڑیاں مٹی ہٹا کر دفنایا اور واپسی کے لیے مڑا تو اس شخص کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

”یہ.....“ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ساری شیطانی کارستانی کے پیچھے یہ شخصیت ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج مجھ پر جج آشکار کر دیا تھا۔

میں لرزتے وجود کے ساتھ کمرے میں واپس آئی۔ میرے پورے جسم پر چوٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔ ”یا اللہ! یہ کیسا بھانک بچ ہے۔“ آگہی کا عذاب مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ آج احساس ہوا کہ اچھا ہے اللہ نے ہر چیز پوشیدہ رکھی ہے۔ کل کیا ہوگا ہمیں نہیں معلوم اگر ہمیں کل کی آگہی ہو جائے تو شاید ہم آج ہی مر جائیں۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے آگہی کا ذرا سا دروازہ کھولا تو میں یہ برداشت نہ کر سکی۔ کیسا دردناک رہا ہے سینے میں..... میں بے اختیار کتنی دیر بستر پر بیٹھی رہی اس کا مجھے اندازہ نہیں جب موذن نے فجر کی اذان دی تو میں چوکی۔

میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ میرے سجدے کتنے لمبے ہو گئے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا میں جاہ نماز پر بیٹھی خدا کی کبریائی بیان کرتی رہی۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ اسی وقت امی جان کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے اس طرح جاہ نماز پر روتا دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی سے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

”کیا ہوا..... کیا ہوا..... میرا بچہ۔“

”امی جان..... امی جان.....!“ میں با آواز بلند رونے لگی۔ میرے رونے کی آواز سن کر تمام گھر والے دوڑے چلے آئے۔

”کیا ہوا..... کیا ہوا.....؟“ سب کے منہ سے نکلا۔

”ابا جان..... امی جان..... اللہ تعالیٰ نے مجھ پر روزن کھول دیا۔“ میں امی جان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

”اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دکھا دیا۔ دانیال

کرتے ہوئے اس سائے کا پتہ چھپا کرتی رہی۔

کچھ دور ایک بوڑھے برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اسی وقت ایک اور سایا اس درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا میں نے خود دو جھاڑیوں کی آڑ میں خود کو اچھی طرح چھپا لیا، چاند کی گیارہ یا بارہ تاریخ تھی اس لیے روشنی اتنی تھی کہ منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ برگد کے درخت کے پیچھے سے نکلنے والا سایا ایک بڑھیا کا تھا اور اس کے ہاتھ میں کپڑے کی بنی ایک گڑیا تھی، جس کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی تھی بلکہ وہ گڑیا جس کپڑے کی بنی ہوئی تھی وہ میرا پرانا نہیں تھا جسے میں نے ناقابل استعمال ہونے پر پھینک دیا تھا۔

میں نے اس بڑھیا کو بغور دیکھا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اس بڑھیا کی شکل اس چڑیل سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی جس نے میرے دن کا سکون اور رات کی نیند حرام کر دی تھی۔ بڑھیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کے سر پر چند نہیں لگائی اس دوران وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی، تھوڑی دیر میں بڑھیا نے وہ گڑیا اس دوسرے شخص کو دے دی اور اس شخص نے ایک ہاتھ میں گڑیا پکڑی اور دوسرا ہاتھ چادر میں ڈال کر جب باہر نکلا تو اس ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی دور سے مجھے اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ کتنی رقم تھی۔ بڑھیا رقم لے کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ شخص جو ہمارے گھر سے یہاں آیا تھا وہ گڑیا لے کر برگد کے درخت کے پاس بیٹھ گیا اور مسلسل کچھ پڑھتے ہوئے گڑیا کے سر میں سوئیاں لگاتا جا رہا تھا۔ نہ جانے یہ کون ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا۔

”عموماً ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو یا سفلی کر دیتے ہیں۔“ شاہ جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ شخص جو بھی تھا پوری طرح چادر میں لپٹا ہوا تھا اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

”اے اللہ! اے مالک کائنات! اے ہماری جانوں کے مالک! مجھے یہاں تک لایا ہے تو یہ بھید بھی کھول دے۔“ میں نے صدق دل سے دعا کی۔ آیت الکرسی کا ورد مسلسل منہ سے جاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

اختیار نکلا۔

”امی جان..... آپ.....“ قمر اور مہک ہکا بکارہ گئے۔

”سہلی تم..... تم نے یہ کیوں کیا.....“ چاچو چیخے۔

”نفرت ہے مجھے اس سے جسے دیکھو کنول کنول کرتا ہے۔ میرے بچوں کی طرف تو کسی کا دھیان جاتا ہی نہیں۔ سب ڈاکٹرنی صاحبہ ڈاکٹرنی صاحبہ کہتے ہوئے کنول کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ بس اسی جلن اور حسد میں، میں نے یہ سب کیا۔“ سہلی چچی نے پہلے نفرت سے پھر بے چارگی سے کہا۔

”امی..... آپ..... آپ کو ذرا احساس ہے کہ اس کی وجہ سے ہم لوگ کتنا پریشان تھے۔ آپ..... آپ کو ذرا رحم نہیں آیا کنول پر۔“ قمر بولا۔

”میں..... میں حسد میں اندھی ہو گئی تھی۔ میں نے تم دونوں کی محبت میں یہ سب کیا۔“

”محبت..... آپ کو محبت کا پتا بھی ہے۔ آئی ہیٹ یوامی..... آئی ہیٹ یو۔“ قمر چیخا۔

”نہیں۔“

”مجھے نفرت ہو رہی ہے اپنے آپ سے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔“ مہک بھی بول اٹھی اور روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی قمر بھی چلا گیا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

”کنول..... کنول مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے بچوں کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔“ سہلی چچی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”سہلی تم محبت میں نہیں حسد میں اندھی ہو گئی تھیں۔ محبت کبھی برے کام نہیں کرواتی۔ حسد آدمی سے ایسے گھناؤنے کام کرواتا ہے۔ تم اپنا سامان باندھو اور فوراً اس گھر سے چلتی نظر آؤ۔ ورنہ میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے۔“ چاچو طیش میں بولے تو سہلی چچی روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☆.....☆

نجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے قرآن مجید

بھائی..... قمر ہمارے گھر کے پیچھے جو برگد کا پرانا درخت ہے اس کی جڑ میں ایک گڑ یا دن ہے اسے لے کر آؤ۔“

دانیال بھائی تو میری بات سن کر خاموش کھڑے رہے مگر قمر بچی کی تیزی سے بھاگا جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گڑ یا تھی۔ گڑ یا دیکھ کر سب کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

”اس گڑ یا کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ اس گڑ یا کے پیٹ میں میرے کئے ہوئے ناخن، بال اور میرے استعمال میں رہنے والی چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ لاؤ مجھے دو، میں اسے جلا دوں گی۔“

میں نے قمر کے ہاتھ سے گڑ یا لی۔ سورہ الفلق اور سورہ الناس کی تلاوت میرے منہ سے جاری تھی۔ میں نے گڑ یا کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ چاچو نے آگے بڑھ کر لائٹر جلا یا اور اس گڑ یا کو آگ لگا دی۔ گڑ یا کے جلنے سے ناقابل برداشت بد بو اٹھ رہی تھی۔ جیسے جیسے گڑ یا جل رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قید سے آزاد ہو رہی ہوں۔ میرے منہ سے قرآن کی تلاوت جاری تھی۔

”یہ بھی وہ گڑ یا جس کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا تھا۔“ میں نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”شاہ جی صحیح کہتے تھے کہ ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو کرواتے ہیں۔“

”کس نے کی یہ حرکت کیا تم اسے جانتی ہو۔“ ابا جان دہاڑے۔

”کاش..... کاش میں یہ نہ جانتی.....“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”کون ہے وہ؟“ چاچو اور ابا جان ایک ساتھ بولے۔

”آپ خود بتانا پسند کریں گی یا میں سب کو بتاؤں..... آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ میں رات میں آپ کو اس بڑھیا جادو گر نی کے ساتھ دیکھ چکی ہوں لہذا آپ ہی سب کو سچ سچ بتادیں چچی جان!“

میں نے سہلی چچی کو مخاطب کیا۔

”سہلی تم.....!“ امی جان کے منہ سے بے

”ہرے.....“ قمر، مہک اور وائیل بھائی نے نعرہ لگایا۔

”چاچو.....! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو گیا تو آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔“ میں نے چاچو سے کہا۔

”ہاں ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ کہو تمہیں کیا چاہیے کپڑے، گاڑی یا کچھ اور.....“ چاچو نے جواب دیا۔

”مجھے سلٹی چاچی چاہئیں۔“ میرے جواب کے ساتھ ہی گھر میں سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے سب لوگ خوش ہو رہے تھے۔ اب سب کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ چاچو نے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورا۔

”چاچو..... سلٹی چچی دل کی بہت اچھی ہیں، بس تھوڑی کمزور ثابت ہوئیں اس لیے شیطان نے ان پر غلبہ پالیا۔ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بدلہ لینے سے معاف کرنے والا بہتر ہے۔ میں نے اللہ کے لیے انہیں معاف کر دیا، آپ لوگ بھی انہیں معاف کر دیں اور عزت کے ساتھ گھر لے آئیں۔ پلیز چاچو۔“ میں نے چاچو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے سوچیں گے۔“ چاچو نے دامن چھڑانا چاہا۔

”نہیں چاچو..... وعدہ کریں۔“ میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... اچھا وعدہ۔“ چاچو بولے تو میں نے گھوم کر قمر اور مہک کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ خوشی کے آنسو تھے۔

☆.....☆

رات کو ہم سب ابا جان کی گاڑی میں سوار پیزاہٹ کی جانب اڑے جا رہے تھے مگر چاچو ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ میرے پوچھنے پر ابا جان نے بتایا کہ وہ پیزاہٹ ہی میں ملیں گے۔ پیزاہٹ میں ہماری میز ریز روٹی، ہم سب میز کے گرد بٹھلی کر سیوں پر بیٹھ گئے۔

”چاچو کہاں ہیں ابا جان؟“ میں نے ابا جان

کھولا اور سورۃ رحمن کی تلاوت کرنے لگی۔ اس واقعے کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ سلٹی چچی اسی دن اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ میرا میڈیکل کالج کا انٹری ٹیسٹ اچھا ہوا تھا اس واقعے کے بعد میری طبیعت کبھی خراب نہیں ہوئی۔ میں جو کبھی کبھی نماز پڑھتی تھی میں نے باقاعدہ نماز پڑھنے کو اپنی عادت بنا لیا اور ہر روز فجر کے بعد سورج نکلنے تک قرآن کی تلاوت کرنا میرا معمول بن گیا۔ قمر اور مہک نے اس واقعے کے بعد کئی دفعہ مجھ سے معافی مانگی، میں نے انہیں بتا دیا کہ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ میں نے انسانوں سے توقع رکھنی ہی چھوڑ دی ہے۔ جب میرا اللہ میرے ساتھ ہے تو ساری دنیا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میں قرآن کی تلاوت کر رہی تھی کہ چاچو کی خوشی سے لبریز چیخ سنائی دی۔ میں نے قرآن مجید بند کیا اور اسے اٹھا کر اونچی جگہ پر رکھا اور کمرے سے باہر نکلے۔

”آئیے..... آئیے ڈاکٹرنی صاحبہ! آپ کا انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آیا ہے۔“ چاچو ہاتھ میں اخبار لیے مجھے کمرے سے نکلتا دیکھ کر بولے۔

”کیا ہوا۔ کیا رزلٹ ہے؟“ میں نے دھڑکتے

دل کے ساتھ پوچھا۔

”کیا ہوگا، اب ہماری آپنی ڈاکٹر کہلائیں گی۔ ڈاکٹر کنول منظور احمد۔“ مہک نے مجھے گلے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”سچ۔“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”بالکل سچ! یہ رہا اخبار۔“ چاچو نے اخبار میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ میں نے جلدی سے اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈا۔ سب سے اوپر میرا نام اور رول نمبر تھا۔

”اس خوشی میں گھر میں پارٹی ہونی چاہیے۔“ چاچو بولے۔

”نہیں چاچو پارٹی وارٹی نہیں۔“ میں نے فوراً انکار کیا۔

”اچھا پارٹی نہیں مگر آج رات کا کھانا میری طرف سے پیزاہٹ میں ہوگا۔“ چاچو پھر بولے۔

”اور کیا چاہیے تمہیں۔ تمہاری چاچی گھر واپس آ تو گئی۔“ ابا جان بولے۔

”چاچو نے میری خواہش پوری کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مگر آپ کو بھی تو میری کم از کم ایک خواہش پوری کرنا چاہیے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب گھر والے میری جانب متوجہ ہو گئے۔

”شکر ہے ہماری بیٹی مسکرائی تو۔ اچھا بتاؤ تمہیں اور کیا چاہیے؟“ ابا جان بولے۔

”ابا..... جا..... جان..... وہ میں چاہتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ عمرہ کرنے چلیں، ایک ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کریں، ایک ساتھ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمارے گھر کو دوبارہ سے خوشیوں کا گہوارہ بنایا۔“ میں نے تفصیلاً جواب دیا۔

”سبحان اللہ۔“ بے ساختہ سلمیٰ چاچی کے منہ سے نکلا۔

”سبحان اللہ..... سبحان اللہ۔“ ایک ایک کر کے سب کے منہ سے تعریفی کلمات نکلے۔

”ابا جان! پھر ہم سب چلیں گے نا؟“ میں نے ابا جان سے تصدیق چاہی۔

”انشاء اللہ ضرور۔ تمہاری کلاسز شروع ہونے سے پہلے ہم سب خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیں گے۔“ ابا جان نے آمادگی ظاہر کی۔

”تھینک یو..... ابا جان.....“ میں نے ابا جان کا شکر یہ ادا کیا اور پیزا کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے مگر یہ تشکر کے آنسو تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میری مشکل آسان کی اور ہمارے ”جائے سکون“ کو دوبارہ خوشیوں کا گہوارہ بنایا۔ میں جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں کم ہے۔ اس نے اپنے خزانے سے مجھے کتنی ہی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور پیزا کھانے لگی۔

☆☆☆

”آتا ہوگا۔ تمہارا چاچو۔“ ابا جان نے جواب دیا۔

”آپ کب سے یہی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر چاچو کہاں گئے ہیں۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”لو وہ آگئے تمہارے چاچو۔“ ابا جان نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو میں نے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں چاچو کے ساتھ سلمیٰ چچی بھی تھیں۔ وہ لوگ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ سلمیٰ چچی کو دیکھ کر میں بے اختیار کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلمیٰ چچی میز کے پاس پہنچ کر رکیں اور پھر میری کرسی کی طرف آئیں اور بولیں۔

”کنول بننا! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بری ہوں۔“ سلمیٰ چچی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے جلدی سے ان کے ہاتھ پکڑے اور ان کو گلے سے لگایا۔

”چاچی آپ بری نہیں ہیں، برا تو شیطان ہے جس نے آپ پر غلبہ پالیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے آپ کو اس کے چنگل سے رہائی دلائی۔ اللہ آپ کی اور ہم سب کی حفاظت کرے۔“ میں نے سلمیٰ چچی کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو چچی نے مجھے زور سے اپنے ساتھ لپیٹ لیا۔

”ارے بھئی یہ چاچی تہیٰ کا ملاپ شتم ہو گیا ہو تو کچھ کھانے وغیرہ کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے۔“ چاچو نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”سچ لچ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔“

”ہاں کنول باجی۔ پیزا ہٹ کی خوشی میں تو میں نے دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔“ مہک بھی بول اٹھی۔ سلمیٰ چچی نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد اپنے دونوں بچوں قمر اور مہک کو پیار کیا۔ میں نے سلمیٰ چچی کو اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

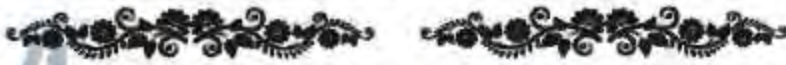
”ابا جان..... چاچو نے تو میری خواہش پوری کر دی۔ آپ بھی تو میری ایک خواہش پوری کریں۔“ میں نے پیزا کھاتے ہوئے ابا جان کو مخاطب کیا۔

ماں رکی...



جو اد احمد

اُس عورت کی آبلہ پائی، جو ماں بن کے بھی ماں نہ بن پائی



ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔
”سائرہ! کیا بات ہے آج تم پریشان سی لگ رہی ہو۔“

سائرہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے چلچلاتی دھوپ میں اسے سایہ فراہم کر دیا ہو۔ پریشان اور تنہا انسان کے لیے ہمدردی کے دو بول بھی صحرا میں بارش کے مانند ہوتے ہیں۔ سائرہ گزشتہ کئی مہینوں سے احساس تنہائی کا شکار تھی۔ میاں بیوی کی کشیدگی نے دونوں کی زندگی اچیرن بنا دی تھی۔ یہ شادی دراصل ایک سمجھوتہ تھی جو ایک ہی سال بعد محض کاغذی کارروائی بن کر رہ گئی۔ سائرہ عمر سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھی لیکن ماں کی شدید بیماری کے باعث خاندان والوں کے دباؤ میں آ کر اسے اپنے پھوپھی زاد عمر سے شادی کرنی پڑی۔ اس کے والد بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے لہذا اس کی ماں نے اسے پالا پوسا۔ اس نے بھی اپنی ماں کی خاطر اپنے تمام خواب قربان کر دیے۔ وہ پر عیش زندگی کے خواب دیکھتی اور متوسط طبقے کی چھوٹی چھوٹی اجنبیوں سے نکلنے کی خاطر زندگی میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

سائرہ حسب معمول دفتر آ کر اداس اور پریشان ہی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج پھر کسی بات پر عمر سے مخی ہو گئی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کی ٹکراؤ سن کر اُن کی معصوم بیٹی فاطمہ رونے لگی۔ اب سائرہ کورہ رہ کر اپنی بیٹی کے آنسو یاد آ رہے تھے۔ وہ کبھی خود کو کونسی بھی عمر کی چڑچڑی عادت کو قصور وار ٹھہرا کر خود کو مطمئن ہونے کی کوشش کرتی لیکن اسے کسی بل چین نہیں مل رہا تھا۔ فاطمہ کی سسکیاں اور اس کے بہتے آنسو اس کا ہر احساس زخمی کر رہے تھے اور ذہن کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب وہ بیٹی سے مل کر اپنی غلطی کی معافی مانگے گی۔ اچانک گھنٹی بجی سائرہ کے آفیسر رضوان صاحب کا فون تھا۔ انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ سائرہ نے اپنی حالت درست کی اور فائل اٹھا کر اُن کے کمرے میں چلی گئی۔

چند لمحے دفتری معاملات پر بات ہوتی رہی۔ خلاف معمول اس روز سائرہ کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی کیونکہ اس کا ذہن جو بھٹکا ہوا تھا۔ رضوان صاحب نے اس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر

Downloaded From Paksociety.com

تھے کہ ماں کے لبوں تک اپنی انٹسٹ خواہش آگئی۔
”سائرہ بیٹی! میں چاہتی ہوں کہ تم عمر کے
ساتھ شادی کے لیے ہاں کہہ دو۔ اس ذمہ داری
سے فارغ ہو کر میں مطمئن ہو جاؤں گی۔ میری
زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں اور میں اپنے رب کے
حضور سرخرو ہو کر جانا چاہتی ہوں۔“

”مگر امی.....“

”اگر مگر کچھ نہیں تمہاری پھوپھو کا اصرار بڑھ گیا
ہے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے مہینے شادی
کر دوں۔“

”اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ابھی مجھے بہت
کچھ کرنا ہے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں تب
شادی کر لوں گی۔“

”سائرہ بیٹی! شادی کے بعد اپنے پیروں پر
کھڑی ہوتی رہنا، مجھ سے اب مزید تمہاری ذمہ داری
نہیں نبھائی جاتی۔ عمر روشن خیال لڑکا ہے، تمہیں ہر
طرح کی آزادی دے گا۔ میں نے اس سے بات

اسی غرض سے اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور
ایک نئی ادارے میں ملازمت کرنے لگی۔ محنت اور
لگن سے کام کرتی رہی اور ترقی کی سیڑھیاں
چڑھنے لگی۔ دفتر کی انتظامیہ اور سب ہی لوگ اس
سے بہت خوش تھے۔ مگر وہ مزید آگے جانے کی
خواہاں تھی۔ جب بھی ماں شادی پر اصرار کرتی وہ
یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابھی اسے اپنا مستقبل بنانا ہے۔
پھر اچانک ایک روز خبر ملی کہ اس کی ماں کینسر جیسے
موذی مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اب اس کی بیٹی
خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کو ہر خوشی اور ہر اطمینان
دے۔ والد کے انتقال کے بعد ماں ہی اس کا واحد
سہارا تھی۔ اس نے اسے ماں کا پیار بھی دیا اور
باپ کی شفقت بھی! اب سائرہ یہی چاہتی تھی کہ
اپنی ماں کی ہر امنگ کو اسی طرح پورا کرے۔ جس
طرح اس نے بچپن سے جوانی تک اس کی ہر چھوٹی
بڑی خواہش کو خود تکلیف اٹھا کر پورا کیا تھا۔ سائرہ
کے ارادے قربانی دینے کے جذبے تک پہنچے ہی

کر لی ہے کہ وہ تمہیں گھر میں نہ قید کرے۔“

سائرہ نے ہزار عذر پیش کئے مگر ماں نے ایک نہ سنی اور یوں اس کی شادی ہو گئی۔ عمر کی شکل و صورت تو عام سی تھی لیکن اس نے سائرہ کو اتنی محبت دی کہ سائرہ کو بھی اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ترغیب ملی۔ سائرہ کے لیے یہ بات بڑی اہم تھی کہ عمر نے اسے ملازمت کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ہر طرح سے معاونت بھی کی۔ ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک چاندی بیٹی دی جس کا نام انہوں نے فاطمہ رکھا۔ عمر کا خیال تھا کہ فاطمہ کی پیدائش کے بعد سائرہ کی پہلی ترجیح فاطمہ ہوگی لیکن وہ تو پر عیش زندگی گزارنے کے خیال سے جنون کی حد تک وابستہ تھی اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا اس کا مطمح نظر تھا۔

اسے فاطمہ سے بے حد محبت تھی لیکن وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا چاہتی تھی۔ فاطمہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس کی ترقی ہو گئی اور اس کی مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ اب وہ عمر اور فاطمہ کو بہت کم وقت دیتی۔ اس سے عمر کو وقت میں جتلا ہو گیا۔ رات گئے تک سائرہ کا باہر رہنا اور مردوں کے ساتھ دوسرے شہروں کا سفر کرنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا مگر اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سائرہ کو گھر کس طرح لائے؟ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ سائرہ کی والدہ بڑھاپے سے واپس آ گئیں جو اپنے علاج کی خاطر کئی مہینے سے وہاں مقیم تھیں۔ عمر نے مسئلے کا ہر پہلو تفصیل سے انہیں بتایا تا کہ وہ سائرہ کو سمجھا سکیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنی بیٹی کو لے کر بیٹھ گئیں۔

”سائرہ! فاطمہ کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ تم اپنی باہر کی مصروفیات کم کرو اور گھر اور بچی کو زیادہ ٹائم دو۔“

سائرہ نے حیرت سے کہا۔ ”امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ دنیا میں فاطمہ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے مگر اس کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ موجود ہے اور پھر میں تمام تر محنت اس کا مستقبل

بہتر بنانے کے لیے ہی کرتی ہوں۔“

”بیٹی! بچوں کی بہترین پرورش ماں ہی کر سکتی ہے مگر تم ملازموں کے ذمے ہر کام چھوڑ کر خود ملازمت کے پیچھے پڑی ہو۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے؟ عمر اتنا تو کما ہی لیتا ہے کہ تم دونوں کی گزر بسر آسانی سے ہو سکے۔“ اس بات میں بڑا وزن تھا مگر سائرہ ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

”امی! مجھے اچھی طرح وہ وقت یاد ہے جب میری فیس کا انتظام کرنے کے لیے آپ کو ہمیشہ کسی نہ کسی سے قرض لینا پڑا۔ میرے کپڑے ہمیشہ سب سے پرانے ہوتے۔ ہمیں اکثر فاقے بھی کاٹنے پڑے۔ میں فاطمہ کو ان محرومیوں سے دور رکھنا اور اسے زندگی کی ہر سہولت دینا چاہتی ہوں۔“

”سائرہ! تم بھول رہی ہو کہ معصوم بچی کی سب سے بڑی ضرورت ممتا ہے جس سے وہ محروم ہے۔ فیس اور کپڑوں وغیرہ کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ زندگی پر آسائش طریقے سے بسر ہونی چاہیے۔ بڑی ہو کر فاطمہ بھی میرے اس خیال سے اتفاق کرے گی اور اسے پتا چلے گا کہ اس کے تباہ کن مستقبل کی خاطر میں نے دن رات محنت کی۔“

سائرہ کسی طرح اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔ اس کی ماں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔ عمر نے بھی اپنی ہر کوشش کر دی تھی لیکن سائرہ کو نوکری چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پیشے میں کامیابیاں حاصل کرتی چلی گئی لیکن اس کی گھر کی بنیاد کمزور پڑتی گئیں۔ عمر اس سے کھنچا کھنچا سار ہتا وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ لیکن عداوت کے زیر اثر چلی بھنی رہتی۔ ایسے تناؤ والے ماحول میں دو سال گزر گئے۔ دونوں مہاں بیوی تھے لیکن دونوں کے مابین وہ چاہت بھرا تعلق عبقاق تھا جو پیار کرنے والے جوڑے کی خاصیت ہے ایک دن اچانک سائرہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ چند روز اسے اپنی ماں کی بات نہ ماننے کا ملال ہوا لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن

ہو گئی کہ اس نے اپنی ماں کا حکم مان کر شادی جیسے بندھن کو قبول کیا تھا۔ اس کے نزدیک یہی بہت بڑی قربانی تھی۔

رفتہ رفتہ معمولی سی بات پر دونوں کے طویل جھگڑے ہونے لگے۔ ان کی روز روز کی نوک جھونک سے فاطمہ کا معصوم ذہن متاثر ہو گیا۔ ایک روز اس کی ٹیچر نے سائرہ اور عمر کو بلا کر فاطمہ کی کاپی دکھائی جس میں اس نے جلتی آگ، ٹوٹے برتن اور مردہ پرندوں کی تصویر بنا رکھی تھیں۔ فاطمہ کی ٹیچر نے بتایا کہ فاطمہ ہر وقت سہمی ہوئی اور الگ تھلگ رہ کر اس قسم کی خوفناک تصاویر بناتی رہتی ہے۔ ماہر نفسیات سے مشورہ کرنے پر پتا چلا کہ فاطمہ کے غیر فطری رویے کی وجہ اس کے والدین کی ناچاقی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے وحشت ناک ماحول کو محسوس کر کے اپنا خوف کاغذ پر منتقل کرتی ہے۔ اس واقعے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سائرہ اور عمر اپنی چینی لاڈلی کی خاطر گھر میں خوشگوار فضا قائم کرتے لیکن دونوں کے رویوں میں لچک نہ ہونے کے باعث حالات مزید ابتر ہوتے چلے گئے۔

ایک دفعہ سائرہ کو دفتر کے کسی کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر جانا تھا۔ اس دورے کے بعد سائرہ کی ترقی متوقع تھی۔ عمر نے اسے کہا کہ وہ نہ جائے کیونکہ فاطمہ کے امتحان قریب ہیں۔ وہ کہنے لگی۔

”فاطمہ کا معمولی سا امتحان ہے۔ اس کی ٹیچر نے مکمل تیاری کر دادی ہے اور آ یا بھی بڑھی لکھی ہے اسے پڑھنے میں مدد کرتی رہے گی لیکن اس دورے پر میرے سہرے مستقبل کا انحصار ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا، اس دفعہ اگر تم گئیں تو میرے گھر کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے۔“

عمر نے غصے سے کہا اور دفتر روانہ ہو گیا۔

سائرہ پریشاں ہو گئی۔ وہ ہر صورت جانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ساتھ اسے عمر کی دھمکی نے بھی ڈرا دیا۔ اسی شش و پنج میں اس نے اپنے پاس کو

فون کیا اور ساری صورت حال بتا کر جانے سے معذرت کر دی مگر رضوان صاحب نے خشک لکڑی کو جلتی تیلی دکھاتے ہوئے کہا۔

”سائرہ! تم بھی کمال کرتی ہو۔ ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔ رہی تمہارے شوہر کی دھمکی کی بات تو وہ ایسی دھمکیاں پہلے بھی کئی بار دے چکے ہیں۔“

”مگر انہوں نے واقعی مجھ پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے تو کیا ہوگا؟“

”سائرہ! گھر تمہارا ہے۔ شاید تم بھول گئی ہو اس کا کرایہ تمہارے دفتر والے دیتے ہیں اور گھر میں اکثر اشیاء بھی تمہاری آمدنی سے خریدی گئی ہیں۔ عمر تمہیں کس طرح نکال سکتا ہے؟“

یوں رضوان کی شد سے سائرہ کے ذہن میں بغاوت نے جنم لیا۔ وہ پُر آسائش زندگی کے سپنے میں کھو کر جلدی سے بولی۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میرا انتظار کریں۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچتی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے کے بعد جب سائرہ واپس آئی تو گھر کے دروازے پر تالا لگا تھا، وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس کے ذہن میں عمر کا یہ جملہ گونجنے لگا۔

”اس دفعہ اگر تم گئیں تو میرے گھر کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے۔“ اس نے متبادل چابی نکال کر تالا کھولا اور اندر چلی گئی۔ سامنے میز پر کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ کر وہ رُک گئی، یہ خط عمر کا تھا۔

سائرہ!

میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے ساتھ چل سکوں لیکن تم جس تیز رفتاری سے مخالف سمت سفر کر رہی ہو اس سے ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور اب ہمارے درمیان ہماری معصوم بیٹی بھی کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اسے ہم دونوں کا مشترکہ پیار تو کیا ملتا، ہمارے اختلافات اور لڑائی جھگڑے اس کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں اکٹھے رہ کر اس کے ذہن پر منفی اثرات ڈالیں گے جبکہ ہماری علیحدگی سے وہ صرف

”اگر مگر نہ کرو میں نہیں منٹ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ ہم کسی ہوٹل میں کھانا بھی کھائیں گے اور تمہارے ساتھ بات بھی ہو جائے گی۔“
رضوان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

سارہ اور رضوان عالی شان ہوٹل کے میز پر بیٹھے تھے۔ سارہ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہ رہے تھے۔ رضوان نے اپنے جیب سے رومال نکال کر اسے دیا۔ پہلے سارہ کو تھوڑی جھک محسوس ہوئی لیکن رضوان نے اصرار کیا تو اس نے رومال لے لیا۔ عین اسی لمحے عمر اور فاطمہ بھی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ عمر نے دونوں کو ایک ساتھ ہوٹل میں دیکھا تو سخت طیش میں آ گیا۔ اسی لمحے اس کے دل سے وہ نرم گوشے ختم ہو گئے جو دونوں کو پھر ایک کر سکتے تھے۔ اس نے قہر آلود نظر سارہ پر ڈالی اور فاطمہ کو بازو سے پکڑ کر واپس لے گیا۔

”فاطمہ..... فاطمہ..... عمر..... عمر..... خدارا میری بات سنو۔“ سارہ پکارتی رہ گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ عمر فاطمہ کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”ابو! آپ مجھے واپس کیوں لے آئے؟ میں تو امی سے ملنا چاہتی تھی۔“ فاطمہ نے عمر سے سوال کیا۔

”بیٹی! اب ہم کبھی آپ کی امی سے نہیں ملیں گے کیونکہ وہ بھی ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔“
عمر نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔
”ابو! اب وہ کہاں رہیں گی؟“ فاطمہ نے تو تلی زبان میں سوال کیا۔

”بیٹی وہ جو صاحب ہوٹل میں ان کے ساتھ بیٹھے نا! ان کے ساتھ۔“ عمر نے جذبات میں آ کر بے اختیار کہہ دیا۔

اب سارہ گھر میں تنہا رہنے لگی۔ ہوٹل والے واقعے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بیٹی کا سامنا کرتی لہذا اس سے کٹ کر رہ گئی۔ جب

کسی ایک کی محبت سے محروم رہے گی۔ میں فاطمہ کو اپنے ساتھ امی کے گھر لے جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں مصروفیات میں سے وقت ملے تو اپنی بیٹی سے ملنے آ سکتی ہو۔

وسلام

عمر

خط پڑھ کر سارہ شاکڈ رہ گئی۔ جسم جیسے بے جان سا ہو گیا، بے اختیار اس کے آنسو نکل آئے مگر وہاں کوئی نہیں تھا جو تنہائی کے گھب اندھیرے میں اسے راستہ دکھاتا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر اکیلی بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ بعض حادثے وقت گزرنے کے احساس تک سے بے خبر کر دیتے ہیں۔ وہ رات گئے تک ایک ہی زاوے میں ایک ہی کرسی پر بیٹھی رہی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور دھیمے لہجے سے سلام کیا۔

”وعلیکم اسلام رضوان بول رہا ہوں۔“
”جی سر! آپ۔“ سارہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جیسے رضوان اس کے سامنے کھڑا ہو۔

”کیسی ہیں آپ۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”دراصل مجھے پوچھنا تھا کہ فائل نمبر دو سو چودہ آپ کے پاس ہے۔“

”جی! میرے پاس ہے، آپ نے خود ہی تو گاڑی میں فائل میرے حوالے کی تھی۔“

”مجھے یاد تو تھا پھر بھی سوچا تسلی کر لوں۔“
”جی اچھا۔“ سارہ نے مختصر جواب دیا۔

”سارہ! خیریت ہے نا؟ تم پریشان لگ رہی ہو، تمہاری آواز میں پہلے جیسی کھنک نہیں۔“

”نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ سارہ نے پُر تکلف جملہ بولا۔

”سارہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو، بھئی میں تمہارا پاس ہی نہیں، ہم دونوں اچھے دوست بھی

ہے۔ اگر تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔“
”مگر جناب.....“

تہجائی اسے کاٹ کھانے کو وہ ڈرتی تو وہ رضوان کو فون کر دیتی۔ رضوان نے اسے ایسے کڑے وقت میں سہارا دیا جب وہ اپنے شوہر اور بیٹی کی نفرتوں کا شکار ہو کر تہجائی اور پریشانی کی دلدل میں دھنسی جا رہی تھی۔ رضوان نے ایک بار پھر اسے آنے والی کامیابیوں کی چمک دکھا کر دفتری معاملات میں مصروف کر لیا۔ سائرہ کو رضوان میجا نظر آنے لگا اور اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی۔ جب کبھی اسے اپنے شوہر کی بے رخی اور بیٹی کی ناراضی کا خیال آتا تو وہ رضوان کے پاس پہنچ جاتی اور وہ اسے گھمانے پھرانے لے جاتا۔ وہ بھی ان وقتی سہاروں سے بہلتی رہی۔ رضوان اس پر احسانات کی بارش کر رہا تھا۔ اور وہ اس میں بھیگتی چلی گئی آخر ایک روز رضوان نے اس سے اپنی محبت کا خراج مانگ ہی لیا۔

”سائرہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
سائرہ اپنے باس کا یہ جملہ سن کر جیسے گھبرا سی گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رضوان اُسے یوں اچانک پروپوز کر دیں گے۔
رضوان نے اس کی پریشانی محسوس کر کے کہا۔
”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک بار میری محبت کا بھرم رکھ لو میں تمہارے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔“
”مگر آپ کی بیوی.....؟“ سائرہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔
”میں نے اس سے اجازت لے لی ہے۔ اسے اولاد کی شدید خواہش ہے اور ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی اس لیے ہماری شادی برآمدہ ہو گئی ہے۔“
”لیکن اس طرح میری فاطمہ مجھ سے اور بھی دور ہو جائے گی۔“ سائرہ نے بے بسی سے کہا اور زار و قطار رونے لگی۔
رضوان نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ”تم کسی بھی وقت اپنی بیٹی مل سکتی ہو۔ وہ بڑی ہو کر آسانی سے سمجھ جائے گی کہ کن نازک حالات نے

ہمیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔“ اور رضوان آہستہ آہستہ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
☆.....☆.....☆
رضوان کی بیوی کوئل نے سائرہ کا محبت سے استقبال کیا اور اسے اپنے گھر میں بڑی عزت کے ساتھ رکھا۔ کوئل چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اولاد کی نعمت سے محروم نہ رہے لہذا اس نے اپنی سوتن کے ساتھ بھی سمجھوتا کر لیا۔ کوئل کو حقیقی معنوں میں اپنے گھر سے محبت تھی۔ شوہر کی خوشی کی خاطر وہ سائرہ سے بھی خوشدلی سے ملتی۔

سائرہ کم سن اور خوب صورت تھی اس لیے رضوان بھی اس کا دیوانہ تھا۔ پہلے پہل تو دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار رہے تھے لیکن جوں جوں وقت گزر رہا رضوان کی خواہش تقاضہ بننے لگی۔ شادی کو تین برس ہو گئے سائرہ رضوان اور کوئل کی خواہش پوری نہ کر پائی۔ ان بگڑتے حالات میں سائرہ کو غیر اہم ہونے کا احساس ہونے لگا۔ وہ رو رو کر رب سے دعا مانگتی۔

خلاف معمول ایک روز رضوان گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ سائرہ کے پوچھنے پر رضوان نے بتایا۔
”سائرہ! تم اندازہ نہیں کر سکتی کہ آج میں کس قدر خوش ہوں۔ میری زندگی میں صرف ایک ہی کمی تھی جسے میرے رب نے پورا کر دیا۔“
سائرہ کا دھیان فوراً اپنے طبی معائنے کی طرف چلا گیا۔ چند روز قبل اس نے اپنا معائنہ کرایا تھا اور ڈاکٹر نے ان دونوں کو بہت تسلی دی تھی۔
”رضوان! کیا رپورٹ آگئی ہے؟“ سائرہ نے بے چینی سے پوچھا۔
”ہاں آگئی ہے۔“ رضوان بچوں کی طرح کی کھلکھلاتے ہوئے بولا۔

”میں باپ بننے والا ہوں۔ میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔“ سائرہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔
”رضوان مجھے بتاؤ! ڈاکٹر نے کیا کہا؟“ اسی

کے باوجود اپنے بیٹے کی خود دیکھ بھال کرتی اور رضوان یہ دیکھ کر بہت خوش تھا۔

ان حالات نے سائرہ میں بیک وقت احساس جرم، احساس ندامت اور احساس کمتری کو جنم دیا۔ وہ غم غلط کرنے کے لیے دفتری معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگی مگر فطری تقاضوں کو مصنوعی حیلوں سے نہیں بہلایا جاسکتا۔ وقت تو جیسے تیسرے گزرتا گیا مگر سائرہ ذہنی انتشار کے باعث شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئی اور اسے افسردگی کے دورے پڑنے لگے۔ آخر رضوان نے اسے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کروا دیا۔

شروع میں تو رضوان نے اس کا خیال رکھا پھر وہ اپنے کاموں اور بیوی بچے میں مگن ہو گیا۔ یوں سائرہ وارڈ میں بے یار و مددگار پڑی رہتی۔ رضوان کبھی کبھار اس سے ملنے آ جاتا اور ضرورت کی چیز دے کر چلا جاتا۔ کول کا بیٹا اب اسکول جاتا تھا۔ لہذا اس کی بھی مصروفیات بڑھ گئیں وہ بھی کبھی کبھار اس سے ملنے آتی۔ سائرہ گھر میں بھی رہ سکتی تھی لیکن رضوان کا خیال تھا کہ نفسیاتی امراض کی علاج گاہ میں رہنا اس کے لیے مناسب ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے بیٹے کو نفسیاتی مریضہ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

تہائی اور احساس جرم نے سائرہ کی مزید حالت رگاڑ دی۔ ہر وقت کے شدید ذہنی دباؤ سے اس کی شکل و صورت بھی بگڑ گئی۔ ڈاکٹر اور نرسیں اگرچہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن پیشہ ورانہ ذمے داری اس محبت اور چاہت کا بدل نہیں جو انسان کو صرف خونی رشتوں سے میسر آتی ہے۔

☆.....☆.....☆

آج یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کی طالبات اسپتال کا دورہ کر رہی تھیں۔ ہر طالبہ ایک مریضہ کے ساتھ گفتگو کرنے لگی۔ وہ نازک سی لڑکی سائرہ کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ سائرہ خلاف معمول اس روز قدرے بہتر حالت میں تھی لہذا وہ لڑکی کے تمام سوالات کا دل جمعی سے جواب دے رہی تھی۔

وقت کول بھی کمرے میں داخل ہو گئی رضوان ایک دم اپنی نشست سے اٹھا اور کول کے قریب جا کر بولا۔

”کول تمہارا بہت بہت شکریہ! تم نے میری زندگی کا سب سے بڑا غلطی پر کر دیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تم ماں بننے والی ہو۔“ اسی کو مجزہ کہتے ہیں کول..... ”یہ سن کر سائرہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اس کا سر چکرانے لگا۔ شادی کے بیس برس بعد اللہ تعالیٰ نے کول پر اپنا کرم کیا تھا۔ رپورٹ تو مثبت آئی تھی لیکن سائرہ کی نہیں کول کی!

رضوان اور کول کے لیے یہ بے حد خوشی کا لمحہ تھا اب رضوان کی تمام تر توجہ کول کی جانب مرکوز ہو گئی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے گن گانے لگا۔ وہ اکثر دفتر سے چھٹی کرتا اور سائرہ اسی کی جگہ فرائض نبھاتی۔ ایک دو دفعہ سائرہ نے شکوہ کیا تو اس نے کہا۔

”کول نے تین سال تمہاری خدمت کی ہے اب وہ ماں بننے والی ہے تو تمہیں اس کی خدمت کرنی چاہیے۔“

کول ایک بیٹے کی ماں بن گئی، یوں اس کی ذات ایسے ڈھنگ سے مکمل ہوئی کہ مسکراہٹ تک میں جا ذبیت آ گئی۔ رضوان اس کا ممنون احسان مند تھا۔ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ بیٹے کی پیدائش نے ان کے ازدواجی تعلق کو بہت مضبوط کر دیا تھا۔ رضوان کو کول کی قربانی اور مصروفیت کا بھی قائل ہونا پڑا۔ اسے اپنی بیوی اتنی اچھی لگنے لگی کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں سے بے خبر ہو گیا۔ ایسی صورت حال میں سائرہ بھی نظر انداز ہونے لگی۔ وہ سر توڑ کوشش کے باوجود رضوان کو اپنے وجود کا احساس دلانے میں قاصر رہی۔ شوہر کی لاپرواہی اسے بار بار گھسیٹ کر ماضی میں لے جاتی جب اسے اپنے بارے میں عمر کا فکر مند ہونا تک ناگوار گزرتا تھا۔ کول اپنے بچے کو پیار کرتی تو اسے وہ وقت یاد آتا جب وہ فاطمہ کی رونے کی آواز سنتے ہی اس کی طرف لپکنے کے بجائے آیا کو پکارنے لگتی تھی۔ کول کئی ملازم ہونے

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

800/-	ایم اے راحت	جادو
300/-	شازیہ اعجاز شازی	تیری یادوں کے گلاب
500/-	غزالہ جلیل راؤ	کانچ کے پھول
500/-	غزالہ جلیل راؤ	دیا اور جگنو
500/-	غزالہ جلیل راؤ	انانیل
500/-	فصیحہ آصف خان	جیون جھیل میں چاند کرنیں
500/-	فصیحہ آصف خان	عشق کا کوئی انت نہیں
500/-	عطیہ زاہرہ	سلگتی دھوپ کے صحرا
300/-	محمد سلیم اختر	یہ دیا بھجنے نہ پائے
400/-	ایم اے راحت	دش کنیا
300/-	ایم اے راحت	درندہ
200/-	ایم اے راحت	تتلی
200/-	ایم اے راحت	بھرم
400/-	خاقان ساجد	چمپون
300/-	فاروق انجم	دھواں
300/-	فاروق انجم	دھڑکن
700/-	انوار صدیقی	درخشاں
400/-	اعجاز احمد نواب	آشیانہ
500/-	اعجاز احمد نواب	جزیرہ
999/-	اعجاز احمد نواب	ناگن

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لکھناری، کہنیں اپنا ناول شائع

کر ڈانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

باتوں باتوں میں وہ طالبہ ساڑھ کی ساری کہانی جان گئی اور اسے اس بد قسمت عورت کی بیماری کا سبب بھی معلوم ہوا۔ ساڑھ نے ماضی کا لمحہ لمحہ اس کے آگے کھول کر رکھ دیا لیکن گفتگو ختم ہوتے ہی اس نے سرد لہجے میں ساڑھ سے ہاتھ ملایا اور بے پروائی سے اٹھ کر چل دی حالانکہ اسے کم از کم ساڑھ کی بد قسمتی پر افسوس ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اس کے جانے کے بعد ساڑھ نے وہ پمفلٹ کھول کر دیکھا جو ہر طالبہ اپنی اپنی موکل کو دے گئی تھی۔

ہر پمفلٹ پر طالبہ کی تصویر اور نام بھی لکھا تھا۔ جب ساڑھ نے طالبہ کا نام پڑھا تو اس کی سانس اکٹھی گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھا گیا اور دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی وہ حواس باختہ ہو کر باہر کی طرف دوڑی اور پکارنے لگی۔

”فاطمہ..... فاطمہ..... میری بیٹی، میری بات سنو۔“

ساڑھ دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ فاطمہ نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے مگر چہرے پر چھائی سرد مہری صاف پیغام دے رہی تھی کہ وہ اس کی ماں کیسے ہو سکتی ہے جس نے اپنی خواہشات پوری کرتے ہوئے اسے اس ممتا، چاہت، شفقت اور راہنمائی سے محروم رکھا جو ہر ماں اپنے بچوں پر نچھاور کرتی ہے۔ ساڑھ نے ایک بار پھر پکارا۔

”فاطمہ، میری بیٹی، میری بات تو سنو۔“

لیکن فاطمہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ساڑھ وہیں ساکت کھڑی رہی۔ اسے تب احساس ہوا کہ پُر آسائش زندگی کے حصول میں وہ ایسی محو ہوئی کہ اپنے ہاتھوں اپنا ہنستا ہنستا گھر تباہ کر بیٹھی۔ اگر وہ اپنے شوہر کی بات مان لیتی اور تن من دھن سے بیٹی کی پرورش کرتی تو وہ خوشیاں اس کے نصیب میں ہوتیں جن کی تمنا ہر عورت کرتی ہے۔ اب تو اسے سوجھ اذیت میں رہنا تھا..... شاید مرنے کے بعد بھی!

☆☆.....☆☆

ایک یہی حقیقت ہے



محمد یوسف لغاری

اُس نوجوان کی کہانی جس نے جو بویا وہی کاٹا

مجھے کے لوگوں کو دیکھنا چاہیے اور پھر اللہ کا شکر ادا اور صبر کرنا چاہیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر اور شکر کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ تم اپنی توجہ پڑھائی پر دو، محنت کرو تو اللہ آپ کو اس کا صلہ ضرور دے گا۔“

ابو کی کہی گئی باتیں میں ماجد سے کہتا تو وہ تلخی سے ہنس دیتا اور کہتا کہ یار ہمارے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ پڑھائی سے ہمیں کچھ نہیں ملنے والا بلکہ ہم بھی پڑھ لکھ کر دوسروں کی طرح بیروزگار ہی رہیں گے۔ ہم نے ہمیشہ ایسے ہی رہنا ہے اور یہ (آسان بات) سب امیروں کے ہی نصیب میں لکھی ہیں۔ ماجد کی ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔

چند دن گزرنے کے بعد ماجد بڑیک کے وقت کھانے پینے کی بہت ساری چیزیں لے آیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ آج اتنی رقم کہاں سے آئی۔ تو ماجد نے کہا کہ جب کھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو پھر ٹیرھی انگلیوں سے نکالنا پڑتا ہے۔“

”کیا مطلب میں تمہاری بات سمجھا نہیں؟؟“

میں نے حیرانی سے کہا۔

دوست میں جس دکان پر کام کرتا ہوں وہاں

ماجد اور میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے ہم دونوں غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے ماجد کے ابو ایک اسٹور پر کام کرتے تھے جب ماجد چھٹی کر کے گھر جاتا تو وہ ابو کی جگہ کام پر چلا جایا کرتا اس کے ابو چند گھنٹوں کے لیے گھر آجاتے تھے جبکہ میرے ابو ایک فیکٹری میں کلرک تھے جس سے ہمارے گھر کا بس گزر بسر ہی چل رہا تھا۔

ماجد اور میرا گھر ساتھ ساتھ تھا تو کلاس میں بھی ہماری جوڑی ایک جیسی تھی۔ ماجد جب اسٹور سے شام کو گھر واپس آتا تو پھر ہم دونوں مل کر اسٹڈی کرتے تھے اور ماجد مجھے ہر روز اپنے گھر کی غربت کی کہانی سناتا اور بہت حسرت سے کہتا کہ نہ جانے اُس کے حالات کب ٹھیک ہوں گے اور پھر وہ بھی امیروں جیسی زندگی گزارے گا۔ جو ماجد کی تمنا تھی یہ میرے بھی دل کی آواز تھی مگر میرے ابو صبر و شکر والے تھے ابو ہمیں یہی کہتے کہ بیٹا ہر حال میں شکر ادا کرو اور ان لوگوں کو بھی تو دیکھو جن کے پاس روٹی صرف ایک ٹائم کے لیے ہوتی ہے اور دوسرے ٹائم کی نہیں ہوتی پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہوتے، آپ اُن سے تو بہتر ہو اور ہمیشہ اپنے سے اوپر نہیں بلکہ

وقت گزرتا رہا۔ میں کالج میں داخل ہو گیا جب کہ ماجد نے آگے داخلہ نہ لیا حالانکہ اُس کے ابو ماجد کو بہت کہتے رہے کہ داخلہ لے لو مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔

اب میری اور ماجد کی ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں کیونکہ میں پڑھائی پر پوری توجہ دے رہا تھا کیونکہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میرے والد جس مشقت سے مجھے پڑھا رہے ہیں تو میں بھی محنت کر کے انہیں اس کا صلہ دوں۔

میں ایک دن پڑھائی کر رہا تھا کہ گھر کا دروازہ بچ اُٹھا۔ میں باہر گیا تو باہر ماجد کھڑا تھا۔ اُس سے کافی عرصہ بعد ملاقات ہو رہی تھی ہم دونوں باہر ایک جگہ بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے تو ماجد نے بتایا کہ اُن کو دادا کی طرف سے زمین کا حصہ ملا ہے وہ اس کا کچھ حصہ بیچ کر اسی جگہ شور بنارہے ہیں تاکہ پرانی مزدوری سے جان چھوٹے۔

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی تو میں نے ماجد کو کہا کہ یار یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر میں تمہیں

سے میں نے پیسے چوری کیے ہیں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوہ ماجد تم نے چوری کی ہے یا تم نے یہ کیا کر دیا۔ کل ہم نے کیا پڑھا تھا چوری ایک بہت بڑا گناہ ہے اور چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے افسوس بھرے لہجے میں اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جانتا ہوں یار مگر ہم جس دکان پر کام کرتے ہیں اس کی ایک دن کی کمائی بیس ہزار سے پچیس ہزار روپے ہے تو سوچو اس کی ماہانہ کمائی کتنی ہوگی جبکہ وہ ہمیں ماہانہ تنخواہ صرف نو ہزار روپے دیتا ہے تو اس لیے میں نے یہ کام شروع کیا ہے۔“ ماجد نے اطمینان سے جواب دیا۔

”یار یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کام ہیں تم حسد نہ کیا کرو بلکہ رشک کیا کرو ہمیں اللہ کی رضا پر راضی ہونا چاہیے اور اپنے رب سے دعا کیا کرو کہ وہ بھی ہمیں اس طرح سے نوازے۔“ میں نے ماجد کو کہا۔ مگر ماجد نے میری بات ان سنی کر دی۔



Downloaded From
Paksociety.com

صاحب نے فائل کے مطالعہ سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اب میری حیرانی مزید بڑھ چکی تھی نہ جانے کیا معاملہ ہے۔

ارمان صاحب نے فائل ایک طرف رکھی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ کے والد ہمارے صرف کلرک ہی نہیں تھے بلکہ اُن کے ساتھ میری دوستی بھی تھی وہ اس وقت سے ہمارے ساتھ رہے جب ہمارے بزنس کو عروج نہیں تھا مگر انہوں نے کلم تنخواہ پر ہمارا بہت ساتھ دیا، اُن کے ہاتھوں ہی میرا بڑا بیٹا نعمان کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ آج بھی نعمان آپ کے والد کو بہت یاد کرتا ہے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ فیکٹری کی خدمت کی ہے اور ایسی خدمت کو بھلایا نہیں جاسکتا ان کی وفات کے بعد جب تمہیں ملازمت دی گئی تو میں نے تمہاری تعلیمی اسناد دیکھی تھیں بہت ہی شاندار ریکارڈ ہے تمہارا مگر جو تمہیں ملازمت دی گئی وہ تمہاری تعلیم کے شایان شان نہیں تھی مگر یہ ہماری مجبوری تھی ہم تمہیں اتنی جلدی کوئی بڑی پوسٹ بھی نہیں دے سکتے تھے اس لیے جس پوسٹ پر تم کام کر رہے ہو ہماری مینجمنٹ ٹیم نے تمہیں چھ ماہ چیک کیا ہے تم ہماری توقعات کے سے بڑھ کر ہمارے معیار پر پورے اُترے ہو تا تم پر آنا، تا تم پر جانا ڈیوٹی کو ایک فرض سمجھ کر ادا کرنا اور اہم بات یہ کہ تمہارے پاس ایسی پوسٹ تھی جس سے تم تھوڑی بہت بے ایمانی کر سکتے تھے مگر تم اس معیار پر بھی پورا اُترے اس لیے تم نے سوچا ہے کہ ان سب کے بدلے تمہیں کیا ملنے والا ہے۔“ صاحب نے منسلل بولتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر میں کوئی اندازہ نہیں کر رہا۔“ میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا، حالانکہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ غالباً مجھے ترقی ملنے والی ہے۔

”بیٹا، ہم آپ کو اپنی دوسری فیکٹری جس کو میرا بیٹا نعمان دیکھتا ہے اس میں جنرل مینجر کے طور بھیج رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ اسی ایمانداری کے ساتھ کام کرو گے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے

ایک نصیحت کروں گا کہ اپنی دوکان پر آنے والے گاہکوں کو مہنگی اشیاء دے کر لوٹنا۔ مت ہمیشہ حلال کی روزی کرنا کیونکہ حلال کمانے میں ہی برکت ہے۔“

ماجد میری بات سن کر مسکرا دیا اور بولا کہ میں اپنے دوست کی بات پر ضرور عمل کروں گا۔“

☆☆☆

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا ابا جان کا انتقال ہو گیا اور میں نے کسی نہ کسی طرح ایم بی اے کر لیا تھا مجھے ابو کے فیکٹری مالک نے ابو کی جگہ نوکری پر رکھ لیا تھا۔ اس دوران ماجد سے میرا رابطہ مکمل کٹ گیا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے شروع میں وہ مہینے میں ایک چکر گھر لازمی لگاتا مگر پھر اس نے بھی اپنے والد کی وفات کے بعد آنا چھوڑ دیا تھا میں دوسرے شہر آ گیا تھا اس لیے ایک دوسرے کی حالات کی خبر نہ تھی کہ ماجد کے حالات کیسے ہوں گے۔ کیونکہ میرے حالات ویسے کے ویسے ہی تھے۔ غربت جوں کی توں موجود تھی معمولی تنخواہ سے بہت مشکل سے گزارا چلتا تھا جس سے میں اکتا جاتا تھا مگر پھر ابو کی نصیحتیں یاد آتیں تو صبر کرتا کہ اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور اس کا پھل دے گا۔

میں ایک دن بیٹھا کام کر رہا کہ مجھے بڑے صاحب نے اپنے پاس بلا لیا۔

میں حیران ہوتا ہوا ارمان صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گیا کہ انہوں نے مجھے کیوں یاد کیا ہو گا اُن کے پاس نہ ہی اتنا تا تم ہوتا تھا اور نہ وہ ملازمین سے ملتے تھے کیونکہ تمام معاملات جنرل مینجر دیکھتا تھا۔

”سر میں اندر آ سکتا ہوں؟“

میں نے کمرے کے دروازے کو ذرا کھول کر پوچھا، حالانکہ مجھے گاڑ کے ذریعے اندر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔

”جی جی میاں آ جاؤ۔“

میں کنفیوز ہوتا ہوا کرسی کے قریب کھڑا ہو گیا۔

ارے کھڑے کیوں ہو کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کہا۔

”جی سر بہت شکریہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گا۔“ اتنی بڑی پوسٹ کا نام سن کر خوشی کے مارے میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

☆☆☆

اب زندگی نئے رخ پر چل پڑی تھی کیونکہ میں اللہ کے فضل و کرم سے خوشحال ہو چکا تھا۔ کیونکہ نئی پوسٹ میں بہترین زبردست پیکیج تھا اور دوسرا بزنس اور دیگر معاملات۔ میرا ذہن بہت تخلیقی تھا میں آئے روز نئے نئے آئیڈیاز دیتا تھا، ملازمین کے ساتھ میرا رویہ بہت دوستانہ تھا میں نے نعمان صاحب سے آتے ہی کہا تھا کہ ملازمین کو جب تک ہم اپنے بھائی جیسا نہیں سمجھیں گے اور ان کے مسائل کو اپنا مسئلہ نہیں جانیں گے اس وقت تک ہم ان کا اعتماد نہیں جیت سکتے اور پھر سب ملازمین کی تنخواہیں پہلے کی نسبت کافی حد تک بڑھوا دی تھیں، اور اسی وجہ سے ہماری فیکٹری پہلے کی نسبت بہت آگے چلی گئی۔

اس جنرل منیجر کی نئی پوسٹ پر مجھے کام کرتے تقریباً آٹھ ماہ گزر چکے تھے کہ ایک دن نعمان صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ ہماری دینی کی جس براچ کے ساتھ ہمارے شینیئر ہیں اُس میں جو ہم نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں مل نہیں رہے اس لیے ابو اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے اگر تم راضی ہو تو وہاں تمہیں بھیجا جائے تاکہ ہم نے جو رقم شیئر کی ہوئی ہے اس کے مطابق ہمیں منافع مل سکے۔“

یہ میرے لیے ایک خوشخبری بھی تھی اور ایک قسم کا حکم بھی تھا جس کو نالنا میرے لیے ممکن نہ تھا اس لیے میں ہاں کر دی۔

☆☆☆

دینی میں مجھے ایک شاہانہ آفس دیا گیا اور ایسی پرکشش تنخواہ کہ جس کے لیے لوگ ترستے تھے وہ مجھے اتنی جلدی مل جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا شاید یہ میرے والدین کی دعائیں تھیں اور میرے صبر کا بھی نتیجہ تھا کہ اک نہ اک دن اللہ تعالیٰ

محنت کا پھل ضرور دیتا ہے۔

میں نے آتے ہی اس براچ میں مختلف معاملات کو دیکھا اور جہاں جہاں مجھے غلطی نظر آئی وہ میں نے دور کی اور لچھ بہ لچھ نعمان صاحب کو رپورٹ دیتا رہا ہر روز منافع و خسارہ کی رپورٹ کو میں خود دیکھتا ایک ایک انٹری کو ملاتا جس سے ہمارے منافع میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس دوران کبھی کبھی مجھے ماجد بہت یاد آتا کہ کسی طرح اُس کو تلاش کروں اس سے رابطہ کروں مگر میں کیا کرتا مصروفیت اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ میں صرف ماجد کو سوچتا ہی رہ جاتا۔

☆☆☆

چند دنوں کے بعد میں مجھے ایک نئے (پراجیکٹ) کے لیے پاکستان واپس بلایا گیا۔ نئے (پراجیکٹ) کے بارے میں جب میں نعمان صاحب سے ملا تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے غریبوں اور معذروں کے لیے ایک این جی او بنانی ہے جس کا مقصد ان کی امداد کے ساتھ ساتھ ان کو کوئی ہنر سکھا کر معاشرے کا ایسا فرد بنانا ہے کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنیں اس کے لیے پہلے مختلف شہروں اور دیہاتوں کا وزٹ کر کے سب کی لسٹ بنانی ہوگی اور یہ سب ذمہ داری تمہاری ہوگی، اور اس کے لیے تمہیں عملہ اور گاڑیاں مہیا کر دی جائیں گی۔ نعمان صاحب نے مجھے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ہم نے چند دنوں کے بعد وزٹ شروع کر دیے اور لسٹیں مرتب کرنا شروع کر دی۔ ایک دن ہم ایک دیہات میں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ میں گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا مجھے ایک اسکول نظر آیا جس کے باہر ایک ریڑھی کھڑی تھی جس کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا جب میری نظر اس پڑی تو میں اچانک چونک اٹھا، بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

ماجد!!!!

”گاڑی روکو جلدی۔“ میں نے ڈاریور سے فوراً کہا۔

نے میری باتوں پر عمل نہیں کیا لیکن جب سر سے پانی گزر جاتا ہے تو پھر ہم افسوس کرتے ہیں۔“ میں نے افسوس بھرائے لیجئے میں کہا۔

”ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو مگر کاش میں نے تمہاری باتوں پر عمل کیا ہوتا تو آج شاید میرا یہ حال نہ ہوتا۔“ اُس نے کہا۔

”ماجد اب جو ہونا تھا وہ چکا ہے اب افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا اب تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنی فیکٹری میں نوکری دلوادوں گا۔“ ماجد کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی تو میں نے اس کو آفر کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں یار میں کہیں نہیں جانا چاہتا میں چل پھر کر جو تھوڑی سی روٹی کما لیتا ہوں یہ میرے لیے بہت ہے بس اب ہر وقت یہی دعا کرتا ہوں کہ میں جو بے ایمانیاں کرتا تھا بس وہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں۔“ ماجد نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

مگر میں ماجد کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بہت اصرار کرتا رہا مگر ماجد بس سے مس نہ ہوا تو مجبوراً مجھے اُس کو چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

☆☆☆

ہم کافی دن اس نئے (بروجیکٹ) میں مصروف رہے مگر میرا ذہن مسلسل ماجد کی طرف ہی رہا کہ کسی طرح اس کو اس فیکٹری میں لے آؤں مگر مصروفیت اتنی تھی کہ اس کا نام ہی نہ نکلتا۔

پھر اک دن بمشکل ٹائم نکالا میں ماجد کو تلاش کرنے اس جگہ پہنچ گیا۔ مگر اس سکول کے باہر ماجد موجود نہ تھا۔ میں نے سکول کے باہر کھڑے اہلکار سے ماجد کے بارے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نوجوان کافی عرصہ سے باقاعدگی سے آ رہا تھا مگر اب تقریباً دس دن ہو گئے ہیں وہ نہیں آیا۔“

”کیا اُس کے بارے آپ کو کچھ پتا ہے کہ اس کا گھر یا کوئی ٹھکانہ وغیرہ کدھر ہے۔“ میں نے اس پریشان ہو کر پوچھا۔

”نہیں مجھے تو کچھ پتا نہیں ہاں البتہ تھوڑا آگے جا کر دائیں طرف ایک دوکان آئے گی وہ شاید وہاں

گاڑی رکی تو میں جلدی سے نیچے اتر کر اس نوجوان کی طرف بڑھا۔

”ماجد۔“ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور پھر اچانک اُس کے منہ سے آواز نکلی۔

”یار..... تم!!!!“

”ہاں میں، لیکن تم ماجد ہونا۔“ جذبات شدت سے میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

”ہاں یار میں ماجد ہی ہوں آپ کا پرانا دوست۔“

”مگر ماجد یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے تم تو اپنا سٹور بنانے والے تھے پھر یہ کیا۔“ میں نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”ہاں دوست میں نے اپنا اسٹور بنایا تھا مگر.....“ یہ کہہ کر اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”مگر کیا؟؟؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے مجھے کہا تھا کہ حق حلال کی روزی کمانا کسی کو مت لوٹنا، مگر یار میں نے یہ سب کچھ کیا میں نے بے ایمانی کی کیونکہ میرا جس علاقے میں سٹور تھا وہاں کوئی اور سٹور نہیں تھا۔ میں نے ان کی مجبوری سے قائدہ اٹھایا اور بے فکر ہو کر خوب بے ایمانی

کی، شروع میں میرا کام بہت اچھا تھا پھر آہستہ آہستہ کام ختم ہونا شروع ہو گیا مگر میں نے اپنے اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے گاؤں کو اور زیادہ لوٹنا شروع کر دیا مگر کام بالکل ختم ہوتا جا رہا تھا پھر ساتھ کسی اور نے سٹور بنا لیا سبھی اس کے پاس جانے لگے اب میرا کام بالکل ختم ہو چکا تھا پھر میں نے بنک سے ادھار لیا اور نئے سرے سے اسٹور شروع کیا مگر پھر بھی کچھ نہ ہوا میرا کام بالکل ختم ہو گیا بنک کو دینے کے پاس میرے لیے کچھ نہ تھا تو بنک نے بدلے میں میری دوکان ضبط کر لی اور میرا سب کچھ تباہ ہو گیا اور آج میری حالت تمہارے سامنے ہیں۔“ ماجد نے گلوگیر لہجے میں مجھے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”ماجد میں تمہیں ہر وقت یہی سمجھاتا تھا لیکن تم

چند لمحے تک تو میری حالت ایسی ہو گئی جیسے کاٹو تو لہو نہیں میں افسوس کے مارے اک لفظ بھی نہ کہہ سکا، جب میری حالت کچھ حد سنبھلی تو میں نے اس سے ماجد کی قبر تک چلنے کو کہا۔

قبرستان ساتھ ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ماجد کی قبر پر موجود تھے یہاں میرا صبر جواب دے گیا میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں نے بمشکل ٹھوٹے پھوٹے لہجے میں فاتحہ خوانی کی اور اٹھ آیا۔

میں نے ادھر ادھر طرف نظر گھما کر دیکھا قبریں ہی قبریں تھیں کوئی نئی، کوئی پرانی، شکستہ حال ٹوٹی پھوٹی مگر سب کی سب خاموش اور اس کے اندر لیٹے انسان کوئی جوان، بزرگ تو کوئی بچے مگر سب کے سب خاموش۔ زندہ انسانوں کی کل حقیقت انہی قبروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن تھی۔

میں نے گاڑی میں بیٹھ کر اپنے دوست کی قبر کی طرف آخری دفعہ دیکھا اور یہ سوچتا ہوا واپس چل پڑا کہ ہم نے تمہاری طرف آنا ہے تم نے نہیں۔

☆☆☆

سے بیچنے کے لیے سامان وغیرہ خریدتا تھا کیونکہ میں نے اس کو کئی دفعہ وہاں کھڑے دیکھا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد میں اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر موجود تھا۔

میں نے دوکان پر بیٹھے آدمی سے ماجد کے بارے پوچھا تو پہلے وہ چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا اور پھر افسردہ لہجے میں بولا کہ ماجد کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”کگ۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ مگر کب کیا ہوا تھا اس کو۔“ میں چلا اٹھا۔

”یہی کوئی دس دن قبل، آگے پیچھے شاید کوئی نہیں تھا بے چارے کا۔ اکثر میرے پاس ہی بیٹھا رہتا رات کو ادھر میری دوکان کے شیڈ کے نیچے سوتا تھا اچانک بخار ہوا بے چارے کو جس نے ایک ہی دن میں ادھ موا کر دیا۔ میں نے دوائی لا کر دی اور اس کہا کہ جب تک بخار ہے میرے گھر رہو مگر وہ نہ مانا اور ادھر شیڈ کے نیچے ہی سو گیا اور جب میں اگلے دن صبح آیا تو وہ انتقال کر چکا تھا۔“ دوکاندار نے مجھے بتلاتے ہوئے کہا۔

اقبال بانو کے جادوگر قلم سے نکلا وہ شاہکار جولانہ زوال ٹھہرا۔

دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل 20 ماہ شائع ہونے والا یہ انمول ناول اقبال بانو کی پہچان بنا۔

”شیشہ گر“ وہ ناول، جس کا ہر ماہ انتظار کیا جاتا تھا۔ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

کتاب ملنے کا پتا:

القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ اردو بازار لاہور۔



مکافاتِ عمل

سید ملازم حسین شیرازی

اُس مجرم کا بیان جس کی سزا مجرموں کو بیس برس بعد ملی تھی

تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام ملک فیاض تھا۔ 50/55 سال کے بیٹے میں تھے۔ گٹھا ہوا بدن، کاٹن کے سفید کلف زدہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ سر پر سفید پگڑی، کندھے پر بیچ کرٹی چادر تھی بات چیت میں پختگی اور ٹھہراؤ تھا۔

وہ عا سلام ہوئی انھوں نے میرے استفسار پر بتایا کہ وہ خود پنواری صاحب کے انتظار میں دو گھنٹے سے بیٹھے ہیں اور اب وہ شاید نہ آئیں۔ مجھ سے میری آمد کا پوچھا میں نے انھیں اراضی سے متعلق بتایا انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ میرا پروگرام اور فیصلہ بہت مناسب اور صائب ہے۔ اگر اراضی مذکورہ جگہ یا قرب وجوار میں خریدی جائے تو آنے والے وقت میں بہت فائدے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے آفر دی کہ موٹر وے کے ساتھ درپائے راوی کے کنڈے (کنارے) ان کی کافی زمین ہے اگر دلچسپی ہو تو دیکھی جاسکتی ہے۔ پسندیدگی کی صورت میں اگر خریدنا چاہیں گے تو وہ بخوشی فروخت کریں گے۔“

میں تو خود یہی چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں پنوار

میرا تعلق صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کے خوب صورت شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ چند سال پیشتر وہی میں کافی عرصہ رہنے کے بعد اپنے شہر واپس آیا تھا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد خواہش تھی کہ لاہور میں کسی اچھی جگہ زرعی زمین خریدوں کھیتی باڑی اور پھل دار درخت لگا کر سکون و آرام سے زندگی گزاروں اس سلسلے میں لاہور گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ایک مناسب ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لیا اور اراضی خریدنے اور دیکھنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی۔ کسی نے بتایا تھا کہ ملتان روڈ سے قدرے ہٹ کر ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب موٹر وے کا منصوبہ ہے۔ جس کی وجہ سے آنے والے وقت میں زمینوں کی ویلیو بہت بڑھ جائے گی۔ اگر آج زمین خریدی جائے تو مستقبل قریب میں کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔

ایک دن میں ساندہ پنوار خانے گیا کسی نے بتایا تھا کہ وہاں مظہر پنواری ہوں گے جو متعلقہ علاقے کو ڈیل کرتے ہیں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ صاحب کسی زمین کی نشان دہی کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک صاحب جو پہلے ہی پنواری کے انتظار میں

وغیرہ میں کوئی مسئلہ تو نہ ہے۔ انہوں نے کاغذات چیک کیے اور تصدیق کی کہ اراضی پاک صاف ہے کوئی جھگڑا یا Litigation نہیں ہے ٹائٹل کلیئر ہے۔

تسلی ہونے کے بعد میں ملک صاحب سے ملا۔ زمین کا سودا طے پایا۔ پچاس ہزار روپے فی کنال کے حساب پچیس لاکھ بنتے تھے مبلغ دو لاکھ روپیہ بطور ایڈوانس دیا اور بقایا رقم بوقت انتقال اراضی رجسٹرار کے روبرو ادا کی جائے گی۔ یوں ملک صاحب سے ایک رشتہ قائم ہوا۔ اکثر ان کے گاؤں جانا ہوتا تھا۔ بہت خاطر مدارت کرتے تھے۔ ان کے اہل خانہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے دو ایک مرتبہ میرے گھر والے لاہور آئے، زمین دیکھی ملک صاحب کے گھر والوں سے تعارف کرایا بہت خوش ہوئے کہ علاقہ خوب صورت اور سرسبز ہے۔ میں نے ان دنوں ماڈل ٹاؤن میں دفتر کرایہ پر لیا تھا جہاں زمین کی خرید و فروخت اور رینل اسٹیٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ میرا قیام ابھی تک ہوٹل میں تھا۔ ہوٹل مالکان سے تعلقات اچھے تھے آمد و رفت اور کھانے پینے کی کوئی

خانے کیا تھا۔ وہاں ایک معزز مالک اراضی سے ملاقات ہوئی تو میں کیسے انکار یا اعتراض کر سکتا تھا۔ فوراً پروگرام بنایا اور انہی کی جیب میں زمین ملاحظہ کرنے روانہ ہوئے۔ ان کے گاؤں گئے جو دریائے راوی کے نزدیک تھا۔ اپنے گھر لے گئے۔ ساگ مکی کی روٹی، لسی سے تواضع کی اور پھر ان کی محبت میں پیدل زمین دیکھنے گیا۔ وہ علاقہ سرسبز اور شاداب تھا ہر طرف ہریالی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر موٹر روے کا سروے ہو چکا تھا۔ آس پاس کے علاقہ میں پتھی اور دوسرے پھلوں کے باغات تھے۔ زمین پسند آئی پچاس کنال زمین خریدنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ پچاس ہزار روپے فی کنال زمین کا سودا طے پایا۔ انہوں نے زمین سے متعلق فرد ملکیت میرے حوالے کی تاکہ میں پٹواری سے چیک کراؤں۔ ایک مرتبہ پھر ساندہ پٹواری خانے گیا۔ پٹواری سے ملاقات ہوئی میں نے مذکورہ اراضی کے جملہ کاغذات دکھائے اور گزارش کی کہ وہ بتائیں زمین کا ٹائٹل کیا ہے؟ زمین کلیئر ہے؟ کوئی قانونی سقم تو نہیں؟ ملکیت

Downloaded From
Paksociety.com

کہ ابھی نہ جائیں نہ جانے وہاں کیا صورت حال ہوگی لیکن بقول ملک صاحب چونکہ ان کا اس قتل سے واسطہ نہیں ہے اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ ملک صاحب کل شام پانچ بجے سے میرے ساتھ تھے۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے یعنی پچھلے چودہ گھنٹوں سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے علیحدہ نہ ہوئے۔ پھر ہوٹل والے سارے اس بات کے گواہ تھے کہ رات کے کسی وقت جبکہ ہوٹل کا مین گیٹ بند ہو جاتا تھا کیسے ممکن ہے کہ کوئی ان کی نظروں سے بچ کر جائے۔ پھر ہوٹل سے ان کا گاؤں پچیس کلو میٹر دور تھا۔ رات بارہ سے صبح چار بجے تک اس وقت ٹریفک بھی زیادہ نہ ہوتی تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ رات کو نکلیں، اتنی دور جائیں قتل جیسا سنگین جرم کریں اور پھر واپس چھپ چھپا کر آجائیں۔ بہر حال ملک صاحب میرے منع کرنے کے باوجود اپنے گاؤں روانہ ہوئے شام تک رابطہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن میں ان کے گاؤں گیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس انھیں اور منشی نیاز (ان پر بھی مذکورہ قتل کا الزام تھا) کو گرفتار کر کے تھانہ چوہنگ لے گئی ہے متعلقہ تھانے پہنچا ملک صاحب اور منشی نیاز تھانے کے لاک اپ میں بند تھے۔ ایس ایچ او صاحب سے ملاقات ہوئی انھیں صورت حال سے آگاہ کیا کہ وقوعہ کے وقت وہ میرے پاس تھے جن کے لیے کافی گواہان اور شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایس ایچ او صاحب کا بھی قدرے یقین تھا انھوں نے دفعہ 302 کے تحت گرفتار کر کے دوسرے دن عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے 5 دن کا ریمانڈ دیا پھر جیل بھیج دیا گیا۔ کیس تقریباً ایک سال چلتا رہا ان کے بیٹوں نے ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ کی ضمانت سیشن میں اور پھر ہائی کورٹ میں خارج ہوئی۔ اب ملک صاحب اور منشی نیاز کوٹ لکھپت جیل میں بند تھے۔ مقدمہ چل رہا تھا۔ سماعت جاری تھی ان کے خلاف گواہان پیش ہوتے رہے میں نے بھی ملک

تکلیف نہ تھی۔ ملک صاحب اکثر دفتر یا ہوٹل آ جاتے تھے اور کبھی کبھی ہوٹل میں قیام بھی کر لیا کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے درمیان اعتماد و خلوص اور بھائی چارہ تھا اس لیے وقتاً فوقتاً زمین کی بابت کچھ رقم بھی لے لیتے تھے چونکہ ہمارا سودا پچیس لاکھ روپے کا ہوا تھا اسی ضمن میں مجھ سے پندرہ لاکھ لے چکے تھے۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ زمین کا انتقال / ٹرانسفر جلد ہو جائے لیکن بقول ملک صاحب ان کے اپنے بھائی سے اس بابت کچھ معاملات طے کرنا تھے۔ مجھے تسلی دیتے تھے کہ فکر کرنے کی چنداں ضرورت زمین آپ کی ہے اور کوئی مسئلہ ہوگا۔

ایک دن کا ذکر ہے ملک صاحب میرے دفتر ماڈل ٹاؤن تقریباً پانچ بجے شام آئے وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سات بجے تک آفس میں رہے دفتر بند کرنے کا وقت ہوا ملک صاحب سے گھر جانے کو تیار ہوئے میں نے انھیں دعوت دی کہ چونکہ آج ہفتہ ہے کل اتوار چھٹی ہوگی کیوں نہ میرے ساتھ ہوٹل چلیں۔ رات قیام کریں۔ انھیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا میرے ساتھ ہوٹل روانہ ہوئے۔ ہوٹل پہنچ کر تھوڑا آرام کیا نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر رات کا کھانا وہیں ہوٹل میں کھایا باتیں کرتے رہے اور تقریباً گیارہ بجے سونے کے لیے اٹھے۔ رات کوئی دو بجے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹ آن تھی اور ملک صاحب تہجد پڑھنے میں مصروف تھے۔ پانچ بجے دوبارہ اٹھے صبح کی نماز پڑھی ناشتا منگوا لیا ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ دروازے کو کسی نے Knock کیا دروازہ کھولا تو ملک صاحب کے بیٹے ریاض تھے۔ جو اس وقت بہت جلدی میں اور بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ملک صاحب کے پوچھنے پر بتایا کہ گاؤں میں ان کے پرانے دشمن کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور اس قتل کے سلسلے میں پولیس آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ واقعہ رات گیارہ بجے پیش آیا۔ ملک صاحب فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے منع کیا

غاروں والا شہر

روسی ریاست جارجیا میں ایک ایسا قدیم شہر موجود ہے جس کے کلیں زیر زمین تراشے گئے پتھریلے غاروں یا گچھاؤں میں رہتے تھے۔ یہ غار آج بھی موجود ہیں مگر یہ کافی شکستہ ہو چکے ہیں۔ زمانے کے سرد و گرم نے ان غاری رہائش گاہوں کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہے مگر جارجیا کی حکومت نے ان کی مرمت بھی کی اور تزیین و آرائش بھی کی، کیوں کہ یہ ان کی ثقافت کا ورثہ ہے اور دنیا بھر کے سیاح ان غاروں کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ پتھریلے مکانات والے اس قدیم شہر کا نام Uplistsikhe ہے جس کا مقامی زبان میں مطلب ہے: ”دیوتاؤں کا قلعہ“ گویا یہاں کی روایات کے مطابق کبھی ان مکانوں میں دیوتا رہتے تھے تاکہ آسمانی دیوتا دنیا کے لوگوں کے ہنگامے اور شور و غل سے بچ کر یہاں سکون سے رہیں۔ یہ قدیم طلسماتی شہر مشرقی جارجیا میں واقع ہے۔

حسن انتخاب۔ راز عدن۔ بحرین

زور دار بارش شروع ہوئی۔ ہم راہ سے بے راہ ہو گئے اور راستہ بھٹک گیا۔ دور کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ مناسب سمجھا کہ اس آبادی میں رات گزاری جائے۔ تھوڑی دیر مسافت طے کرنے کے بعد اس قصبہ میں داخل ہوئے۔ کچے کچے مکانات تھے۔ آبادی زیادہ نہ ہونے کے آثار تھے۔ چونکہ رات کا وقت تھا موسم بھی بہت خراب تھا۔ خاموشی ہی خاموشی تھی ایک گھر سے روشنی دکھائی دی ہم نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بزرگ لائٹی کے

صاحب کے حق میں سیشن جج کے سامنے اپنی گواہی پیش کی تفصیلاً ساری صورت حال بتائی۔ ہوٹل والوں کو بھی شہادتوں کے لیے پیش کیا۔ اور پھر ایک سال بعد عدالت نے ملک صاحب اور منشی نیاز کو پچیس پچیس سال قید با مشقت کی سزا دی۔

یہ میرے لیے پریشانی اور دکھ کے ایام تھے ایک تو ملک صاحب کو کافی پیسہ دے چکا تھا اور ہنوز زمین ابھی تک ان کے نام تھی۔ میرے نام سوائے ایک ایگریمنٹ کے اور کچھ نہ تھا۔ دوسرا ان کا مذکورہ اراضی کے سلسلے میں بھائی سے کیس چل رہا تھا۔ مزید برآں زمین کے علاوہ بحیثیت انسان اس لیے بھی پریشان تھا کہ انھیں ناکرہہ جرم اور گناہ میں سزا ہوتی ہے وہ بے قصور اور بے گناہ تھے یہ میرے لیے لمحات فکر یہ تھے۔

میں ان سے افسوس کرنے اور ملاقات کرنے چیل گیا۔ ملاقات ہوئی میں نے ملک صاحب کو بتایا کہ آپ پر ظلم ہوا ہے نا انصافی ہوئی ہے۔ بغیر کسی ارتکاب جرم کے اتنی سزا ہوئی۔ ملک صاحب نے جواباً بتایا کہ نہیں ایسی بات نہیں۔ انھیں قتل کی سزا ہوئی ہے۔ انھوں نے واقعی قتل کیا اور اس قتل کی سزا کے حق دار تھے۔ یہ اور بات کہ اس قتل میں وہ ملوث نہ تھے اس سے ڈور ڈور کا بھی واسطہ نہ تھا یہ تو دراصل اس قتل کی سزا ہوئی جو آج سے بیس سال پہلے ایک بے گناہ اور بے خطا بزرگ کو دونوں یعنی ملک صاحب اور منشی نیاز نے مل کر قتل کیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا اور ان سے تفصیلاً معلومات جاننے کی خواہش کی۔

ملک صاحب گویا ہوئے۔ میں اور منشی نیاز پیشہ ور چور تھے۔ لڑائی جھگڑے، چوری چکاری ٹھگ بازی ہماری فطرت میں شامل تھیں۔ ایک دفعہ بغرض چوری ساہیوال گئے۔ ساہیوال سے پندرہ کلومیٹر ایک قصبہ تھا جس میں ہم نے چوری کرنی تھی۔ ہمارے مخبر کی اطلاع کے مطابق وہاں ایک گھر میں کافی مال تھا اور ٹارگٹ بھی آسان تھا۔ ہم قصبہ روانہ ہوئے موسم سرد تھا۔ رات کا وقت تھا اور پھر

بھی کپڑے اور سونے کے زیورات دکھائی دیے۔ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ چونکہ ہم دونوں چور تھے ایسی ہی واردات کے لیے نکلے تھے اور یہ موقع ہمیں بڑی آسانی سے مل گیا تھا ہم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس بزرگ نے ہم پر کتنا بڑا اعتماد کیا۔ مہمان نوازی کی۔ خاطر مدارات سے نوازا۔ بڑی عمر ہونے کے باوجود ہماری خدمت میں لگ گئے۔ لالچ اور خود غرضی نے ہمیں جکڑ لیا تھا۔ انسانیت سے دور ہم درندہ صفت بن گئے تھے۔

ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو مال سمیٹنے کے اشارے کی۔ بڑی سے چادریں لیں اور ان میں مال سمیٹنے لگے۔ بزرگ ہتھوڑ تہجد میں مصروف تھے۔ آوازیں سن کر سلام پھیرا اور حیرانگی کی حالت میں پوچھنے لگے کہ ہم کیا کر رہے ہیں کیوں میری پوتی کی شادی کا سامان پُچار ہے ہو۔ میں نے تم لوگوں کا کیا بکاڑا ہے۔

ہم نے ایک نہ سنی جب وہ شور مچانے لگے تو میں نے جائے نماز کے قریب پڑی ان کی لاٹھی اٹھائی اور ان کے سر پر دے ماری۔ چونکہ وہ بہت کمزور و نحیف تھے اور میری ضرب بھی شدید تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مگر بڑے۔ ان کی نظروں میں حسرتوں کے آثار واضح تھے۔ گرتے ہیں ان کی روح جسم سے نکل گئی۔ وہ بے گناہ، معصوم، بے خطا ہمارے لالچ، حرص، جرم کی بھیشت چڑھ گئے۔

ہمیں کوئی ڈر، خوف افسوس نہ ہوا۔ مال سمیٹا اور فوراً گھر سے نکل گئے۔ وہاں سے واپس ساہیوال آئے پھر ملتان پہنچے۔

دوسرے دن سارا سامان زیورات فروخت کیے اور اگلے دن واپس لاہور آ گئے۔

صاحب! یہ جو سزا ہمیں ملی ہے اسی بزرگ کو قتل کرنے کی ملی ہے جو بیس سال پہلے ہم سے سرزد ہوا تھا۔ موجودہ قتل سے کوئی واسطہ تعلق نہیں ہے یہ ہے مکافاتِ عمل جس سے ہم گزر رہے ہیں۔

☆☆☆

سہارے دروازے پر آ موجود ہوئے اور دروازہ کھول دیا۔ 65/70 سال کی عمر ہوگی۔ سفید باریش تھے۔ چہرہ نورانی تھا جسم قدرے لاغر تھا۔ بیمار دکھائی دے رہے تھے اس لیے بار بار کھانس رہے تھے۔ دعا سلام ہوئی ہم نے اپنا مدعا بیان کیا کہ راستہ بھول چکے ہیں یا تو سیدھے راستے کی نشان دہی کی جائے وگرنہ مہربانی ہوگی ہمیں رات یہیں گزارنے کی سہولت مل جائے۔ وہ بزرگ یہ سن کر فرمانے لگے کہ رات کے اس وقت کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے گھر والے میری پوتی کی رسم منگنی کے سلسلے میں دوسرے گاؤں گئے ہیں۔ گھر میں اکیلا ہوں۔ آپ لوگ برس و چشم اندر آئیں۔ آپ کی مہمانداری میں بہت خوشی ہوگی۔ وہ بہت تخلص اور مہمانداری کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ رات بزرگ کے گھر رہا جائے۔ وہ اندر لے گئے تین کمرے ساتھ ساتھ بنے تھے ان کے آگے دالان تھا اور تینوں کمروں میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے کے لیے دروازے تھے۔ کھن میں مال مویشی بندھے تھے صاف ستھرا مکان تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں لے گئے وہاں تین چار پائیوں پر صاف ستھرے بستر تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے اندر لکڑیاں ڈال دیں۔ آگ کا لاکڑ روشن کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرے میں سالن، مکھن، روٹیاں اور دودھ لے آئے۔ معذرت کر رہے تھے کہ اس وقت گھر میں یہی کچھ موجود تھا وگرنہ اچھی مدارت کا اہتمام ہوتا۔ ہم نے کھانا شروع کیا اور ان کے خلوص و محبت کو بہت سراہا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں سو گئے بزرگ دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ رات کے پچھلے پہر کچھ کھٹ پھٹ کی آواز سنائی دی اندرونی کمرے سے جھانکا تو اندر کمرے میں روشنی تھی اور وہ بزرگ غالباً تہجد کے لیے اٹھے تھے۔ کمرے میں مزید دیکھا تو دو چار پائیوں پر پہلے آن پہلے قیمتی کپڑوں کے سوٹ شادی کا دیگر سامان اور تین عدد سوٹ کیس نظر آئے۔ انھیں کھول کر دیکھا تو ان میں

جب دولت گھر کی باندی تھی

فرزانہ نگہت

اُس سیٹھ کی زندگی کا زہریلا باب جو کبھی دولت کے مینار پر براجمان تھا

سیخ رحیم کا تعلق ایک مخصوص برادری سے تھا۔ یہ بان، آڑھتی، ٹرانسپورٹر وغیرہ۔ سیخ رحیم پکوڑا فروش تھے۔ ان کا گھر اور ہمارا گھر دیوار سے دیوار ملا تھا۔ لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ دکان دار، ریڑھی

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان شادیوں پر بھی خوب اسراف بے جا کا مظاہرہ کیا گیا۔ اور لوگوں پر اپنی دولت و حشمت کی دھولس جمانے کی کوشش کی گئی۔ علیم اس وقت کئی ایجنسیاں چلا رہا تھا۔

شیخ صاحب کے دونوں بیٹے ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دولت گویا چاروں طرف سے سمٹ سمٹ کہ ان کے پاس آرہی تھی۔ دولت میں اضافے کے ساتھ ہی وہ سب لوگ بھی اب بدلتے جا رہے تھے۔ ان کے رویوں، اندز و اطوار اور گفتگو میں اب متکبرانہ رنگ اور رعونت داخل ہوتی جا رہی تھی۔ جن محلے والوں کے ساتھ مدتوں کا ساتھ اور بردرانہ تعلقات چلے آ رہے تھے وہ اب ان کے نزدیک کسی گنتی، کسی شمار میں ہی نہ رہے تھے۔ انھوں نے ان کے گھروں میں جانا اب موقوف کر دیا تھا۔ ان گھروں سے اگر کوئی ان کے گھر چلا جاتا تو اس کے ساتھ انتہائی سرد مہرانہ بلکہ رعونت آمیز سلوک کیا جاتا۔ یہ دیکھ کر محلے والوں نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ہمارے گھرانے سے شیخ صاحب کے گھرانے کے مدتوں پرانے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ لیکن ان میں بھی اب بگاڑ اور سرد مہری کا رنگ پیدا ہو گیا۔ مرد تو رسمی علیک سلیک تک محدود ہو کر رہ گئے لیکن عورتیں کبھی کبھار آپس میں مل ہی لیتی تھیں۔ اور ظاہر تھا یہ ملاقاتیں کوئی خوش گوار ثابت نہ ہوتیں۔ ایک طرف تو پرانی مسابقتی کا خلوص، محبت اور اپنائیت ہوتی تو دوسری طرف نو دو لیتا نہ چھوڑا پن، جھوٹا غرور و تکبر، سرد مہرانہ بے رخی و رعونت۔ نتیجتاً ہمارے گھر کی عورتوں نے بھی ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

غرور، تکبر، شیطانی صفت ہے۔ یہ غرور و تکبر ہی تھا جو ابلیس نے اللہ کی نافرمانی کی اور رائدہ درگاہ ہوا۔ قیامت تک کے لیے ملعون ٹھہرا۔ جن انسانوں نے اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ان کا حشر بھی عبرت ناک ہوا۔ شیخ رحیم کا خاندان بھی ایسے حشر سے نہ بچ سکا اور اللہ کی گرفت میں آ کر رہا۔

شیخ رحیم کے بڑے بیٹے شیخ سعید کے لڑکے رفیق اور شفیق ہر چند کہ انھیں بہترین اور مہنگے ترین تعلیمی

ان کا دس مرلے کا مکان کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ چہار دیواری کے بیچوں بیچ چار چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ باقی چاروں طرف کافی جگہ ویران بڑی تھی۔ وہ کثیر العیال آدمی تھے۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ اور دو بیٹے۔ تین بیٹیاں شادی شدہ تھیں باقی بچے ابھی پڑھ رہے تھے۔ ان کے مالی حالات دگر گوں ہی رہتے تھے۔ ان لوگوں کے تن پر نہ اچھے کپڑے ہوتے تھے نہ گھر میں اچھے برتن، فرنیچر، پھر جیسا کہ اس برادری کی باہمی اخوت، اتحاد و اتفاق ضرب المثل ہے۔ شیخ رحیم کو ان کے امیر رشتہ داروں نے کاروبار کے لیے بھاری رقم قرض دی۔ اس رقم سے انھوں نے شہر کے بڑے بازار میں پرچون کی دکان کھول لی۔ ان کا بڑا لڑکا شیخ سعید بھی جو اس وقت تک میٹرک کر چکا تھا ان کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا۔ جلد ہی وہ دکان چل نکلی۔ اس سے جو کثیر منافع ہونے لگا تو ان لوگوں کی مالی حالت بھی بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ پہلے ان لوگوں نے اپنے رشتہ داروں کا قرض اتارا۔ پھر پرانے مکان گرا کر اس کی جگہ ایک دو منزلہ شاندار مکان تعمیر کروایا۔ اس میں بڑی قیمتی ٹائلیں اور ماربل لگوا گیا۔ قیمتی سے قیمتی سامان سے اسے آراستہ کیا سجا یا۔ شیخ صاحب کی بیوی جو پہلی ان پڑھ تھیں۔ اب بروکیڈ اور کم خواب میں ملبوس ہونے سے لدی بیگمائی شان دکھانے لگیں۔ اب اس گھر میں عمدہ سے عمدہ کھانے پکاتے، آئے دن دعوتیں ضیافتیں ہوتیں۔ شیخ صاحب نے اب بازار میں کئی اور دکانیں بھی خرید لیں۔ اور مختلف مصنوعات کی کئی ایجنسیاں بھی حاصل کر لیں۔ یوں ان کی دولت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انہی دنوں شیخ صاحب کے بڑے لڑکے شیخ صاحب کے بڑے لڑکے شیخ سعید کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی ظاہر تھا خوب دھوم دھام سے ہوئی اس میں خوب دولت لٹائی گئی۔ شیخ سعید کے پہلے دولڑکے رفیق اور شفیق پیدا ہوئے پھر دو بیٹیاں نیلوفر اور روبینہ۔ پھر کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب کی دونوں چھوٹی بیٹیوں اور چھوٹے بیٹے علیم کی بھی شادیاں ہو گئیں۔

چھوٹے بیٹے عظیم کا بڑا بیٹا سائیکل پر اسکول سے گھر آتے ہوئے ایک ٹانگے سے ٹکرا گیا۔ ٹانگے کا پہیہ اس کے پیٹ پر سے گزر گیا۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ اس حادثے پر شیخ صاحب کے خاندان پر سے گویا قیامت ہی گزر گئی۔ مگر شاید اللہ کی سزا ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

شیخ سعید کی بڑی بیٹی نیلو فر عرف نیلو ایک بے حد حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ رشتہ داروں میں اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اچھا رشتہ موجود تھا۔ لیکن اب چونکہ وہ لوگ اونچی ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ اپنے نیم خواندہ رشتے داروں کی بجائے نیلو کی شادی کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ امیر کبیر گھرانے سے ہو۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر انھیں ایک ایسا خاندان مل ہی گیا۔ وہ لوگ اپنی برادری کے اور کراچی کے رہائشی تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے درجے کے کاروباری تھے۔ وہ خاندان ماں باپ تین بہنوں اور چار بھائیوں پر مشتمل تھے۔ جس لڑکے کے ساتھ نیلو کی شادی ہونا قرار پائی تھی وہ امریکہ میں اپنا بزنس سیٹ کئے ہوئے تھا۔ وہ خوب صورت امریکہ کا تعلیم یافتہ اور بڑی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ شادی کے بعد وہ نیلو کو امریکہ لے جانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی خاندان دجاہت، قول و تقاضا کی چکا چونڈ نے شیخ سعید اور ان کی بیوی کو ایسا مرعوب و مسحور کیا کہ انھوں نے ان سے اپنے بہت سے مطالبات منوالیے۔ وہاں یہ بھی منوالیا کہ شادی کے بعد نیلو کا جہیز اس کے شوہر کی ملکیت بن جائے گا۔ اس مطالبے پر شیخ صاحب کے خاندان کے کان کھڑے ہو جانے چاہے تھے لیکن نہ ہوئے۔ اس رشتے نے ان لوگوں کی عقلیں گویا ضبط کر کے رکھ دیں۔ انھیں غرور و تکبر کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ لوگ اب اپنے رشتہ داروں تک سے سیدھے منہ بات کرنے کی روادار نہ رہے۔ وہ ان کے ساتھ یوں پیش آنے لگے گویا ان کے مقابلے میں وہ انتہائی گھٹیا اور کمتر درجے کی مخلوق تھے۔ ان کے بھی

اداروں میں داخل کروایا گیا۔ تعلیمی اعتبار سے نالائق اور نکلے ہی رہے۔ دولت کی ریل پیل اور امیر کبیر گھرانوں کے بگڑے ہوئے لڑکوں کی صحبت نے انھیں غلط راستوں پر ڈال دیا۔ وہ آوارہ گردی، شراب و شباب اور جو بازی کے عادی ہو گئے۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنے لگے۔ ان کی آوارہ گردیوں کو لگام دینے کے لیے شیخ سعید اور ان کی بیوی نے یہ کیا کہ ان دونوں کی اکٹھی شادیاں کر دیں۔ لڑکیاں ان کی برادری ہی کی امیرزادیاں تھیں۔ ان شادیوں پر بھی ظاہر تھا خوب دولت لٹائی گئی۔ نو دولتیا پن کا مظاہرہ کیا گیا۔

لیکن ہوا یہ کہ شادی کے اگلے ہی دن دونوں لڑکوں کی بیویاں ناراض ہو کر اپنے مکے چلی گئیں اور کہلوا بھیجا کہ وہ اب ہرگز واپس نہ آئیں گی۔ معلوم ہوا کہ ریشم نے شادی کی رات کو اپنی بیوی کو شراب کی بوتل لا کر دی اور اس سے کہا کہ اسے شراب پلائے۔ اس کے انکار پر اس نے اسے بری طرح گالیاں دیں اور مارا پیٹا اور کمرے سے نکال دیا۔ اس کی تمام رات کمرے سے ملحقہ اسٹور میں گزری۔ شفیق کی بیوی نے بھی کم و بیش ایسا ہی بیان دیا۔ اس کے بیان کے مطابق شفیق جب اس کے پاس آیا تو شراب کے نشے میں مخمور تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ وہ تمام رات شراب پیتا اور اس سے بھی زبردستی پلانے کی کوشش کرتا رہا۔

ان واقعات سے ظاہر تھا شیخ صاحب کے گھرانے کی بدنامی ہونی ہی تھی۔ شیخ صاحب ان کی بیوی اور بیٹے بیٹیوں نے بے حد کوشش کی کہ معافی تلافی اور صلح صفائی ہو جائے۔ دونوں لڑکوں کی بیویاں گھر آ جائیں۔ لیکن نہ تو بیویاں راضی ہوئیں نہ ان کے گھر والے۔ بڑے لڑائی جھگڑے کے بعد بالآخر دونوں لڑکوں کو اپنی بیویوں کو طلاقیں دینی پڑیں۔ اور جہیز کا بھاری بھر کم سامان بھی لوٹانا پڑا۔ شیخ صاحب اور ان کے خاندان کی ایسی سبکی ہوئی کہ کافی عرصہ تک وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب کے

کہانی سنائی تو وہ ایسی لرزہ خیز اور ہوشربا تھی کہ جس جس نے سنا تو یہ استغفار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

نیلو کے سرالی کراچی والے مسلمان ہونے کے باوجود صرف نام کے ہی مسلمان تھے۔ وہ پوری طرح سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے اور حد درجہ آزادی پسند اور حیا باختہ اور ہر برائی میں گلے گلے غرق تھے۔ اس گھر میں بڑی بے تکلفی سے شراب پی جاتی تھی۔ بے حیائی کے کام کئے جاتے تھے۔ لڑکے ٹھہلم کھلانت نئی لڑکیاں لا کر ان کے ساتھ شب بسری کرتے تھے۔ لڑکیاں رات رات بھر گھر سے غائب رہتی تھیں۔ ساس سسر کے بھی یہی چلن تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔

سسرال کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر نیلو شدید خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو شدید خطرے میں محسوس کرنے لگی تھی اور جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ وہاں بری طرح سے تید تھی۔ اس کے دیور نندیں اور نوکر چاکر اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ نہ گھر خط لکھ سکتی تھی نہ فون کر سکتی تھی۔ پھر ایک رات اس کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا جس سے وہ شروع ہی سے ڈرتی آ رہی تھی۔ اس کا ایک دیور شراب کے نشے میں زری طرح سے جنور ایک رات اس کے کمرے میں گھس آیا اور رشتوں کے تقدس کی دجھیاں اڑ گئیں۔ اس نے اپنی بربادی کا حال، اپنے ساس سسر کو سنایا۔ بہت فریاد کر یہ وزارتی کی لیکن انہوں نے اس پر کوئی کان نہ دھرا۔ الٹا یہ کہہ کر اس کے زخموں پر نمک پاشی کی کہ اس گھر میں یہ معمول کی بات تھی۔ ہر بھائی کو ایک دوسرے کی بیوی اپنے تصرف میں لانے کا حق حاصل تھا۔ (نعوذ باللہ)

اب وہ کیا کرتی؟ اس نے کوشش کی کہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے خاوند کا پتا ہی مل جائے تاکہ وہ اسے خط لکھے کہ وہ اسے اپنے پاس بلا لے۔ لیکن کسی نے اسے اس کا پتا نہ دیا۔ بعد میں اسے اسی دیور نے اسے بتایا کہ اس کا خاوند پہلے ہی سے شادی شدہ تھا۔ امریکہ میں اس کی امریکن بیوی اور دو بچے موجود تھے۔ اس سے اس کی شادی سراسر

خواہوں اور ہمدردوں نے دینی زبان میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کراچی والوں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار نہ کریں۔ ان کے متعلق کچھ دیکھ بھال کر لیں۔ لیکن ان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں۔ وہ ان باتوں کو ان کا حسد اور جلا پا قرار دیتے ہوئے ان پر ذرا کان نہ دھرتے۔

اب نیلو کی شادی ہوئی اور ایسی دھوم دھام سے ہوئی کہ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ کھانے پر پاکستانی کھانوں کے علاوہ چینی اور یورپی کھانے بھی پکوائے گئے۔ ضرورت سے زائد دیکھیں پکوائی گئیں۔ خوب اسراف بے جا کیا گیا۔ جہیز میں لاکھوں کے زیورات، ملبوسات، برتن فرنیچر ہر چیز دی گئی۔ سسرال والوں کو بھی خوب خوب نوازا گیا۔ داماد کو نئی چھمپاتی لمبی چوڑی قیمتی کار سونے کی گھڑیاں، کپڑے جوتے جانے کیا کیا تحفے میں دیا گیا۔ شادی کے بعد نیلو کراچی چلی گئی۔ اس کا شوہر ہفتہ بھر بعد امریکہ چلا گیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جلد ہی اسے اپنے پاس بلا لے گا۔

شادی کے بعد شیخ سعید اور ان کی بیوی کو نیلو کے بخیر و عافیت کراچی پہنچنے کی اطلاع تو مل گئی۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی خط موصول نہ ہوا۔ یہ ویسے بھی 1967ء کا زمانہ تھا۔ جب موبائل فون وغیرہ عام نہ ہوئے تھے اور دوسرے شہروں سے رابطے کے لیے یا خط لکھے جاتے تھے یا ٹرک کالیں کی جاتی تھیں۔ اسی طرح جب کئی مہینے گزر گئے تو شیخ سعید اور ان کی بیوی کو اندیشہ ہائے دور دراز نے ستانا شروع کر دیا۔ ان کی راتوں کی نیندیں اڑنے لگیں۔ انہوں نے نیلو کو بہت خط لکھے۔ ٹیلی گرام بھیجے۔ فون پر رابطے کی کوشش کی مگر نہ تو اس کی طرف سے ایک حرف نہیں موصول ہوا۔ نہ ہی فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ فکر و پریشانی جب حد سے گزرنے لگی تو انہوں نے اپنے بڑے لڑکے رفیق کو نیلو کی خبر لینے کراچی بھیج دیا۔ رفیق جب واپس آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ لٹی پٹی نیلو بھی اس کے ساتھ تھی۔

بعد میں جو حقائق سامنے آئے۔ نیلو نے جو اپنی

ۛ جناح بحیثیت قانون داں عظیم تھے، ایک وقت میں کانگریس کے ممبر کے طور پر بھی عظیم تھے۔ مسلمانوں کے رہنما کے طور پر بھی عظیم تھے۔ عالمی سطح کے سیاست داں اور مدبر کے طور پر بھی عظیم تھے، لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم عملی انسان تھے۔ جناح کی رحلت کے باعث دنیا عظیم ترین مدبرین میں سے ایک اور پاکستان اپنے بانی، فلاسفر اور رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔ (مائی برادرز "مولفہ: محترمہ فاطمہ جناح) ۛ جناح تاریخ کی سب سے زیادہ غیر معمولی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ (جو ابر لال نہرو)

ۛ میں اپنی زندگی میں جتنے بھی لوگوں سے ملا ہوں، ان میں عظیم ترین جناح ہیں۔ (سر سلطان محمد آغا خان سوم)

ۛ جناح صرف ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا میں اس صدی کی ایک انتہائی غیر معمولی شخصیت ہیں۔ (ڈاکٹر کیلاش ناتھ کالجو)

حسن انتخاب۔ ریاض حسین تبسم جوہان۔ فیصل آباد

شیخ رحیم جو اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ پے در پے دھچکے برداشت نہ کر سکے اور ایک زبردست حملہ قلب سے آغوشِ جلد میں جاسوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی بیوی بھی ان کے پیچھے چل دیں۔ شیخ سعید اب دل کے مریض بنے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مظلوم دختر نیلو اور چھوٹی بیٹی کی شادیاں دینی مزاج کے حامل شریف آدمیوں کے ساتھ کر دی ہیں۔ ان کے دونوں لڑکوں رفیق اور شفیق کی دوبارہ کہیں بھی شادیاں نہیں ہو سکیں۔ وہ ویسے کے ویسے آوارہ مزاج عیاش طبع چلے آ رہے ہیں۔ علیم کے بیٹے بھی انہی کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ اس کی بیٹیاں بھی خوہر پدزے سے نکال رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں بہت دور دیکھ رہی ہیں اور آنے والے وقتوں کا ادراک کر رہی ہیں۔ مگر علیم اور اس کی بیوی نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اب یہی بہتر ہے اپنی رہی سہی عزت بچانے کا۔

☆☆☆

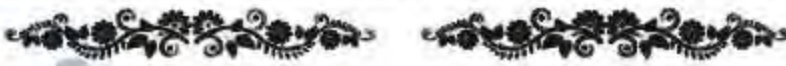
لاہج کا نتیجہ تھی۔ اس انکشاف نے بے چاری نیلو کو زندہ درگور کر ڈالا۔ اس کی دن رات روتے گزرنے لگے اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر ہر بار بچالی گئی۔ اگر اس کا بھائی اسے لینے نہ آجاتا تو وہ ضرور اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی۔ اب نیلو کو اس کے خاوند سے طلاق دلوائی گئی۔ معاہدے کے مطابق لاکھوں کا جہیز اس کے خاوند کی ملکیت بن چکا تھا۔ لہذا وہ واپس نہ ہو سکا۔ اس لیے نے شیخ رحیم کے گھرانے کی کمر ہی نہ توڑ دی بلکہ اس کی بدنامی اور رسوائی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لوگوں نے کھلے عام کہنا شروع کر دیا۔ "غرور کا سر نیچا" لیکن شاید ابھی اللہ تعالیٰ کو انھیں غرور اور تکبر کی مزید سزا دینا منظور تھا۔

شیخ رحیم کی بڑی بیٹی زہرہ فیصل آباد کے ایک تاجر سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس کے صرف پانچ بیٹے تھے۔ یہ لڑکے بھی اپنے ماموں شیخ سعید کے لڑکوں سے مختلف نہیں تھے۔ دولت کی ریل پیل نے انھیں بھی غلط راستوں پر ڈال رکھا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا آصف ہر چند کی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ رقص و سرور کا بے حد شوقین اور پرلے درجے کا عیاش اور بد کردار تھا۔ بازارِ حسن کے چکر اس کا شروع ہی سے معمول چلے آ رہے تھے۔ ایک دن وہاں ایک نئی طوائف کے حسن و جمال کا شیرہ ہوا۔ اس کی بھنگ اس کے کانوں میں پڑی تو وہ فوراً وہاں جا پہنچا اور اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے عشق کا بھوت اس کے سر پر ایسا ہوا کہ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا اس نے پہلے تو اس طوائف پر خوب دولت لٹائی۔ پھر اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ طوائف نہ اس میں دلچسپی رکھتی تھی نہ اس سے شادی پر آمادہ تھی۔ اس نے اسے صاف دھتکار دیا۔ اس پر آصف کا دماغ ہی الٹ گیا۔ اس نے پاگلوں جیسی حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس کا پاگل پن ایسا بڑھا کہ اسے مینٹل ہاسپٹل داخل کروانا پڑا۔ یوں اس خاندان نے ایک اور رسوائی کھائی۔

ایکلی عورت

سیمیں غزالہ نیہاں

آج بھی اس معاشرے میں ایکلی عورت کے شکار کے لیے بھیڑیے گھاٹ لگائے رکھتے ہیں



سبز شاہینہ احمد آج کل بہت پریشان تھیں۔ ان کے شوہر احمد صاحب کا ایک حادثے میں دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی پرائیویٹ جاب تھی اس لیے پنشن کا بھی سہارا نہیں تھا۔ خود شاہینہ بیگم بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں معلمہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ مگر شوہر کے حادثے کے بعد ان کی تباداری کی وجہ سے وہ اپنی جاب چھوڑ چکی تھیں۔ پھر شوہر کے انتقال اور عدت کی مدت کے دوران ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب دوبارہ جاب کرنے کی ہمت نہیں کر پارہی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر میں بچوں اور شوہر میں مصروف تھیں۔ جبکہ بیٹا جس کو انھوں نے بڑی مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھا کر پڑھنے کے لیے بیرون ملک بھیجا تھا۔ وہ ایسا گیا کہ پلٹ کے پھر ماں باپ کی خبر بھی نہ لی۔ حتیٰ کہ باپ کے ایکسیڈنٹ اور انتقال کا سن کر بھی نہ آیا نہ تسلی کے دو بول ہی کہے۔

اس نے وہیں کسی گوری سے شادی کر لی تھی اور اس گوری نے اس پر ایسا جال بنا تھا کہ وہ ماں باپ کا نام تک نہیں لے سکتا تھا دراصل اس کی بیوی کو یہ

”ضرورت ہے ایسی خواتین کی جو پڑھی لکھی ہوں اور لکھنے کے کام سے دلچسپی رکھتی ہوں..... معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ کام گھر پر بھی دیا جاسکتا ہے۔“

اتوار کے اخبار میں اس اشتہار کو پڑھ کر..... ان کو ایسا لگا کہ جیسے یہ اشتہار ان ہی کے لیے شائع ہوا ہے۔ وہ پڑھی لکھی تھیں اور لکھنے سے دلچسپی بھی رکھتی تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں اخباروں اور بچوں کے رسالے میں بچوں کی کہانیاں اور مضامین لکھتی تھیں۔ جو پڑھنے والوں میں خاصے مقبول تھے۔ طالب علمی کے دور کے بعد جب پریکٹیکل لائف میں آئیں تب بھی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ شادی کے بعد بچوں اور گھر بار میں الجھ کر یہ سلسلہ رک گیا۔ پھر جب اسکول میں جاب کرنے لگیں تب بھی بچوں کو مضامین، تقاریر وغیرہ لکھنے میں مدد دینے لگیں۔ اخباروں اور رسالوں میں بھی مضامین چھپنے لگے۔ مگر جب ان کو اس کا معاوضہ نہیں ملا تو انھوں نے چھوڑ دیا۔ اشتہار پڑھ کر وہ پھر لکھنے لکھانے پر تیار ہو گئیں۔ ویسے بھی وہ آج کل صاحب فراش تھیں۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com



پڑھاتی تھیں۔ اور بچوں کو فزکس کیمسٹری کے پریکٹیکل بھی کرواتی تھیں۔ انھیں یہ کام آسان لگا۔ وہ دو سے تین جنرل تو آسانی سے بنا سکتی تھیں۔ ان کی عمر تریسٹھ سال تھی مگر وہ فزیکل ٹیٹ تھیں۔ اپنی عمر سے دس پندرہ سال کم کی لگتی تھیں۔ وہ بی بی اسٹریٹ تھیں اور ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کی عادی تھیں اگر دو جنرل بھی روزانہ بنائیں تب بھی تقریباً سات آٹھ ہزار مل جاتے۔

اس طرح ان کو مصروفیت کے ساتھ آمدنی کا ذریعہ بھی مل رہا تھا۔ انھوں نے آفس فون کر کے ان کا مطلوبہ معیار پوچھا تو ان کو جواب کافی حوصلہ افزا ملا۔ کوئی حافظ صاحب تھے جنھوں نے ان کو کام کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اپنا ایڈریس دے دیں میں آپ کو گھر پر کام سمجھا دوں گا۔

شاہینہ بیگم نے ان کو گھر میں بلانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے بولیں کہ پہلے آپ مجھے اپنے آفس کا ایڈریس بتادیں میں خود آ کر آپ سے

خطرہ تھا کہ وہ ماں باپ سے مل کر اس کو چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ کیونکہ اکثر پاکستانی لڑکے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی بیوی کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا۔ شاہینہ بیگم تیار رہ گئی تھیں۔ کچھ دنوں تک توجیح کیا ہوا خرچ ہوتا رہا۔ مگر جب بینک بیلنس بالکل ختم ہونے پر آ گیا تو ان کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے سوچنا پڑا۔

اخبار میں جیسے اشتہار کو پڑھ کر وہ ان کو فون کر کے معلومات حاصل کرنے کا سوچنے لگیں۔

اشتہار میں دے ہوئے فون نمبر پر رنگ کر کے ان سے جا ب کے متعلق پوچھا تو..... انھوں نے بتایا کہ سائنس کے مضامین کے پریکٹیکل جنرل لکھنے کا کام ہے۔ جس کا معاوضہ فی جنرل سو روپے ملے گا۔ اور اگر ڈائلگرام بھی بنائیں گی تو فی جنرل ایک سو پچیس روپے ملیں گے۔

وہ سائنس میں بی ایس سی کی ڈگری رکھتی تھیں اور جا ب کے زمانے میں سائنس کے مضامین ہی

جانے کے لیے تیار ہوئیں اور گھر سے نکلنے سے پہلے دفتر فون کیا تو ان حافظ صاحب نے جواب دیا۔ میں اس وقت آؤٹ ڈور کام سے نکلا ہوں۔ اور آپ کے علاقے میں آ رہا ہوں آپ مجھے پتا بتائیے تو میں آپ کے گھر آ کر بات کر لیتا ہوں۔

شاہینہ بیگم کو بہت عجیب لگا کہ وہ بار بار گھر پہ آنے کو کیوں کہہ رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں آپ کو گھر پہ نہیں بلا سکتی۔ اور آفس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسی دن شام کو پھر ان کا فون آیا کہ میں آپ کے علاقے میں فلاں پارک میں ہوں۔ اگر آپ یہاں آ سکتی ہیں تو آ کر بات کر لیں۔

شاہینہ بیگم یہ سوچ کر پارک میں جانے کو تیار ہو گئیں کہ اول تو وہ ان کے گھر کے قریب تھا۔ ارد گرد کے سب لوگ ان کو جانتے تھے۔ اس پارک میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ پھر ان کو خود پر بھی اعتماد تھا۔ وہ کوئی بچی تو تھیں نہیں۔ عام طور پر وہ برقعہ اس وقت پہنتی تھیں جب کہیں انجان جگہ پر اکیلے جانا ہوتا تھا۔ ورنہ وہ چادر لیتی تھیں۔ مگر آج انھوں نے یہ سوچ کر برقعہ لے لیا کہ وہ حافظ ہیں، اور ان کے سامنے بے پردہ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ پارک کے قریب پہنچ کر ان کو فون کیا تو جواب ملا میں گیٹ پر کھڑا ہوں اور اپنی نشانی بتائی کہ میں اس کمرے کے کپڑوں میں ہوں۔

شاہینہ بیگم نے دیکھا کہ پارک کے گیٹ پر ایک صاحب موٹر سائیکل لیے کھڑے ہیں۔ داڑھی تو ان کی بے شک تھی مگر نجانے کیوں ان کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔ حافظ قرآن کے چہرے پر ایک نور ہوتا ہے۔ وہ انھیں محسوس نہیں ہوا۔

بہر حال جب وہ یہاں تک آ ہی گئی تھیں تو بات کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ ان کے ساتھ پارک کے اندر آ گئے اور ایک بیچ پر بیٹھ کے ان کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ ان کے ساتھ بیٹھیں نہیں بلکہ کھڑی رہیں، تو انھوں نے جنرل کے لکھنے کے کام

کام سمجھ لوں گی۔ وہ گھر میں تنہا رہتی تھیں۔ بے شک پختہ عمر کی تھیں مگر بہر حال ایک عورت تھیں وہ بھی بیوہ۔ انھیں مناسب نہیں لگا کہ تنہا گھر میں کسی غیر محرم سے ملاقات کریں۔ تاہم ان کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ حافظ ہیں۔ تو یقیناً شریف انسان ہوں گے۔

اسی رات کو ان کے موبائل پر میسج آیا کہ آپ کو شوہر کی طرف سے آفس آنے کی اجازت ہوگی۔ بس یہیں پر تو شاہینہ بیگم سے غلطی ہو گئی یا سادگی میں انھوں نے یہ بتا دیا کہ اول تو میرے شوہر حیات نہیں ہیں۔ اگر ہوتے بھی تو مجھے لکھنے پڑھنے کے کام سے منع نہیں کرتے۔

اس کے بعد ان حافظ صاحب کا میسج آیا کہ میرا آفس چوٹھی منزل پر ہے۔ آپ سیڑھیاں چڑھ سکیں گی۔

انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ سکتی ہوں۔ دوبارہ پھر انھوں نے میسج کیا اور پوچھا کہ آپ مسلم ہیں یا بھاری جسم کی۔

شاہینہ بیگم کو بڑی حیرت ہوئی کہ ایسا سوال کیوں کیا۔ مگر پھر انھوں نے سوچا کہ شاید اس لیے پوچھ رہے ہوں کہ اس عمر میں عورتیں بھاری بھر کم ہو جاتی ہیں۔ اور چلنے پھرنے اور سیڑھیاں چڑھنے میں مشکل ہوتی ہے۔

اس بات کا بھی انھوں نے مختصر جواب دیا کہ ”مجھے کوئی پرابلم نہیں۔“

انھوں نے پھر میسج کیا کہ میرا آفس صدر کے علاقے میں ہے آپ کس علاقے میں رہتی ہیں۔ آپ کو آنے میں مشکل تو نہیں ہوگی۔ شاہینہ بیگم نے اپنے علاقے کا نام بتایا اور کہا کہ وہ صدر کے علاقے میں آسانی سے آ سکتی ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے آفس کا پتا Send کر دیا۔ شاہینہ بیگم نے کہا کہ میں آنے سے پہلے آپ کو فون کر لوں گی۔ دوسرے دن انھوں نے اپنے ایک جاننے والے کے بیچے کو ساتھ لیا اور آفس

مٹی کے رنگ

جہاں خاک کی پہچان اسم ہے گویا
ہزار طرح کا جس میں طلسم ہے گویا

ہم اپنے آپ سے گزرے تو یوں ہوا محسوس
حدود جسم سے آگے بھی جسم ہے گویا

قاضی حبیب الرحمان

زیادہ تر لوگ خود سامنے نہیں آتے بس دولت کی
جھلک دکھا کر۔ رشتہ طلب کرتے ہیں۔ وہ کسی کو
درمیان میں ڈال کر بات کرواتے ہیں۔ بعض
اوقات لڑکیاں خود اپنے والدین کی اجازت کے
بغیر۔ بڑے لوگوں سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی
ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اپنے آفس میں ان کا
نکاح کروا دیتے ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی جھجک
کے جواب دیا۔

”یہ تو سرا سردھو کہ ہوا۔“ انہوں نے کہا۔

”وہ لڑکیاں خود خوشی سے تیار ہو جاتی ہیں۔“
بڑے اطمینان سے جواب ملا۔ ”آپ کا کام صرف
یہ ہوگا کہ آپ لڑکیوں کو فون کر کے بلوائیں گی اور
ان کی ملاقات ان لوگوں سے کروائیں گی جو شادی
کرنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنا نام بدل کر فون
کریں۔ اور میرے آفس میں بلوائیں یا اپنے گھر
پر۔ یا کسی پارک وغیرہ میں۔ اس کام کے آپ کو
پچاس ہزار ملیں گے۔ اور ایسی شادیاں مہینے میں کم از
کم دو یا تین تو ضرور ہوتی ہیں۔“ انہوں نے لالچ
دیا۔

شاہینہ بیگم سمجھ گئیں کہ ان کا فراڈ کاروبار ہے۔
وہ یقیناً جعلی شادیوں کے نام پر لڑکیاں سپلائی کرتے
ہوں گے۔ اور ان کو بے وقوف سمجھ کر پیسوں کا لالچ
دے کر پھانس رہے ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ
ان کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ جنرل لکھنے والا
کام بھی نہیں کریں گی۔ ان کی چھٹی حس ان کو خبردار
کر رہی تھی۔

کے بارے میں سمجھایا۔ کام تو شاہینہ بیگم کی سمجھ میں
آ گیا۔ مگر وہ بندہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے
انہوں نے کہا۔ ٹھیک ہے میں آپ کو سوچ کر جواب
دے دوں گی فون پر۔ اتنا کہہ کر وہ جانے کے لیے
مڑیں تو انہوں نے کہا آئیے میں آپ کو چھوڑ دیتا
ہوں۔ میرے پاس بائیک ہے۔ شاہینہ بیگم کو بڑا
عجیب لگا۔ انہوں نے سختی سے جواب دیا۔
”میں آپ کے ساتھ بائیک پر کیسے بیٹھ سکتی
ہوں۔ ایک غیر محرم شخص کے ساتھ۔“

”آپ مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کر رہی ہیں؟“
حافظ صاحب بولے۔
”میں کسی غیر محرم شخص پر اعتماد نہیں کر سکتی۔“
”اچھا میرا ایک اور کاروبار ہے اس میں آپ
میرے ساتھ کام کریں تو آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔“
انہوں نے کہا۔
”وہ کیا؟“

میں شادیاں بھی کرواتا ہوں۔ اس کا معاوضہ
میں ایک لاکھ لیتا ہوں۔ آپ کو میں فنٹی پرسنٹ
دوں گا۔“
”اول تو کوئی ایک لاکھ نہیں دے گا۔ پھر آپ
مجھے فنٹی پرسنٹ کیوں دیں گے؟“ شاہینہ نے سختی
سے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں سیکنڈ میرج کرواتا ہوں۔
بڑے بڑے زمین دار اور دولت مند لوگ خوب
صورت اور کم عمر لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں۔
وہ لڑکیاں غریب گھرانے کی مگر خوب صورت ہوتی
ہیں۔ اور دولت کے لیے بڑی عمر کے مرد سے شادی
کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ پہلی بیوی اور گھر والوں
سے چھپ کر شادیاں کرتے ہیں اسی لیے منہ مانگی رقم
معاوضے میں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔“
انہوں نے تفصیل بتائی۔

”ان لڑکیوں کے گھر والے کیسے تیار ہو جاتے
ہیں۔ اپنی کم عمر بیٹیوں کی شادی بڑی عمر کے لوگوں
سے کرنے کے لیے؟“ شاہینہ بیگم نے پوچھا۔

”دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ویسے

”ٹھیک ہے میں آپ کو فون پر بتا دوں گی۔“ انھوں نے کہا اور جلدی سے جانے کے لیے پلٹ گئیں۔
 ”چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔“ حافظ صاحب بھی اٹھتے ہوئے بولے۔

”میں کسی غیر محرم کے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی۔“ انھوں نے سختی سے جواب دیا۔ اور جب تک وہ ہائیک اشارٹ کر کے چلے نہیں گئے وہ یونہی دوسری گلی میں مڑ گئیں۔ یہ اطمینان کر کے کہ وہ چلے گئے ہیں۔ جلدی سے رکشہ کر کے گھر آ گئیں۔

اس رات کو کافی لیٹ نائٹ ان کے موبائل پر حافظ کا تفصیل سے میسج آیا۔ جس میں انھوں نے لکھا۔ ”آپ بہت خوب صورت اور اسماٹ ہیں۔ آپ کی گفتگو کا انداز بہت اچھا ہے۔ آپ بہت بااخلاق ہیں۔ آپ کا سراپا بہت متاثر کن ہے۔ یقیناً آپ نے اپنی عمر زیادہ بتائی ہے آپ اتنی عمر کی لگتی نہیں۔ آپ میرے ساتھ ضرور کام کریں۔ مجھے اپنے آفس کے لیے ایسی ہی بولڈ اور پرکشش خاتون کی ضرورت ہے جو اپنی گفتگو سے سامنے والے کو متاثر کر سکتی ہوں۔ آپ مجھ سے دوستی کر لیں۔“

انھوں نے ان کی خوب صورتی کی خوب تعریفیں لکھ کر کچھ نازیبا اور غیر اخلاقی الفاظ بھی لکھے۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ عورتیں اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتی ہیں اور آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہیں۔ یا پھر انھیں بیوہ جان کر ان کو اپنے دام میں پھنسا رہے تھے۔ مگر شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہر عورت اتنی بے وقوف نہیں ہوتی۔ باکردار اور تنہا عورت بھی اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ اور کوئی ان کو آسانی سے فریب نہیں دے سکتا۔ عورت اگر بااعتماد ہو تو چٹان سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ کوئی لالچ، کوئی فریب ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایسی عورت کا بچ کی گڑیا ہونے کے باوجود اپنی عصمت کی حفاظت بھی جانتی ہے۔ یہ صنف نازک اور ناقص العقول وجود، انسان نما بھیڑیوں سے بچنا بھی جانتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت کسی

بھی عمر میں محفوظ نہیں۔ انسانوں کے جنگل میں بھیڑیے نما انسان۔ ہر وقت اپنے شکار پر جھپٹنے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مگر باکردار اور باعصمت عورت اپنی وجود بن کر ایسے درندوں سے خود کو بچا لیتی ہے۔

انھوں نے میسج کے جواب میں لکھا۔
 ”حافظ صاحب اگر واقعی حافظ ہیں تو کم از کم آپ کو اپنا وقار رکھنا چاہیے تھا۔ میں آپ کا یہ میسج اپنے بیٹے کو دکھا رہی ہوں۔ اب وہی آپ سے بات کرے گا۔“ یہ لکھ کر انھوں نے اس سم کو اپنے موبائل سے نکال کر پھینک دیا۔

وہ صاحب پتا نہیں حافظ بھی تھے یا صرف اپنے نام کے ساتھ حافظ لگایا ہوا تھا۔ جو کوئی بھی تھے۔ اللہ کے خوف سے بے نیاز تھے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ اوپر بھی کوئی ہستی ہے جو ان کے ایک ایک فعل کو دیکھ رہا ہے اور ابھی رسی بھی دراز کی ہوئی ہے۔

اس کے ساتھ وہ بھی سوچ رہی تھیں کہ عورت چاہے کسی بھی عمر کی ہو محفوظ نہیں اس دنیا میں اکیلی عورت کا رہنا کتنا مشکل ہے۔ ہر قسم پر دھوکہ اور فریب کا سامنا ہے۔

شاہینہ بیگم تو بولڈ اور سمجھ دار تھیں جنھوں نے اس فریب سے خود کو بچا لیا۔ اللہ نے ان پر کرم کیا کہ وہ برائی کے جنگل میں پھنسنے سے بچ گئیں۔ ورنہ عورتیں باآسانی بے وقوف بن جاتی ہیں۔ اور لالچ میں آکر بڑی مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ جس سے نکلنا محال ہوتا ہے۔

اس لیے ہر عورت کو خصوصاً تنہا اور بیوہ عورتوں کو تو بہت سوچ سمجھ کر آنکھیں کھول کر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ صرف اللہ سے مدد مانگنی چاہیے اور اس پر مکمل بھروسہ کرنا چاہیے۔ شاہینہ بیگم ایک عبادت گزار اور اللہ پر مکمل اعتماد کرنے والی تھیں۔ اس لیے اللہ نے ان کو بڑی مصیبت سے بچا لیا۔

☆☆☆

اصلی چہرہ



نادیہ ملک

اس قاتل حسینہ کی انوکھی داستان جو ہمیشہ اپنا اصل چہرہ میک اپ میں چھپا کر رکھتی تھی

اس کے ادہری ہونٹ اور پیشانی پر سینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ وہ کوٹھری کے اس خشک ماحول میں کسی پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑی خاموشی سے اس قیدی عورت کو دیکھے جا رہی تھی اور پھر دفعتاً ہی اس قیدی عورت کے بارے میں کچھ سوچ کر وہ تھر تھرا سی اٹھی۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھی اور قیدی عورت کے بالکل قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس کرسی کے قریب جہاں وہ مطالعہ کر رہی تھی۔

قیدی عورت نے جب یہ محسوس کر لیا کہ اب اس سے مخاطب ہونے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے تو اس نے جھنجھلانے کے انداز میں کتاب بند کر کے سامنے پڑے واحد پتنگ پر بیٹھ دی اور راہبہ کی طرف بڑی خشک اور سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ آخر اب مجھے مزید پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر جب راہبہ اس کی استفسار نہ نظروں کو نظر انداز کر کے خاموش کھڑی رہی تو پھر اسے اپنی زبان کھولنی ہی پڑی۔

”کیا بات ہے؟ تم میرے پاس کس لئے آئی ہو؟“ اس کے لہجے میں بہر حال ناراضی اور برہمی کا

خواتین کی جیل کے شروع حصے میں بنی کوٹھری میں بیٹھی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنے میں مگن تھی۔ اچانک ہی کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو اس نے کتاب سے نظر ہٹا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک خاتون راہبہ اس کوٹھری میں داخل ہو رہی تھی۔ کتاب کا مطالعہ کرنے والی قیدی عورت نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور پھر کتاب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔

آخری ملاقات کیلئے آنیوالی خاتون راہبہ اس کی کوٹھری میں داخل ہو کر رُک گئی تھی۔ غالباً وہ اس قیدی عورت کی بے اعتنائی پر متحیر سی رہ گئی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ اب وہ کیا کرے؟ راہبہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بائبل دوسرے ہاتھ میں منتقل کی اور ایک بار پھر اُمید بھری نگاہوں سے قیدی عورت کی طرف دیکھنے لگی جو ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ مطالعہ میں مشغول ہو گئی تھی۔

راہبہ کے چہرے پر تقدس کی لہر دوڑ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ میں عورت کیلئے محبت اور رحم کے جذبات بھی موجود تھے۔ یہ ایک خاصا گرم دن تھا وہ تیز دھوپ میں چل کر آئی تھی اور

www.paksociety.com

عصر شامل تھا۔
 ”میں یہاں تمہیں سکون پہنچانے کی غرض سے
 آئی ہوں۔ تمہارے ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنے کی غرض
 سے آئی ہوں۔ تمہیں ذہنی اور قلبی سکون بہم پہنچانے
 آئی ہوں۔“

ہو جائے تو اسے اپنے آپ قلبی سکون بھی میسر آ جاتا
 ہے۔“ وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔
 ”اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں جتنا سکون خود کو
 دے سکتی ہوں اتنا سکون کوئی اور مجھے دینے کا دعویٰ
 بھلا کس طرح کر سکتا ہے؟“

نو وارد خاتون کی آنکھوں میں پہلے حیرت سی
 ابھری اور پھر وہ مجسم پھیل گئیں۔ چہرے کے تاثرات
 نے اس کے حقیقی نقش و نگار میں خاصی تبدیلی پیدا کر
 دی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اچانک اسے کسی
 غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہوا۔ اس نے اپنی
 آنکھوں کے تاثرات چہرے سے ہٹانے کی کوشش کے
 طور پر بائبل کھولی اور ورق اُلٹنے لگی۔ غالباً وہ کسی
 موزوں آیت کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔

قیدی عورت راہبہ کی متوحش حالت پر مسکرائی۔
 وہ سمجھ گئی تھی کہ راہبہ کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہوگا
 کہ وہ ایک عام عورت سے ہٹ کر خصوصیت رکھنے

راہبہ نے نئے نئے الفاظ میں ایسی روانی سے بول
 رہی تھی جیسے اسے یہ جملے دہراتے دہراتے ایک
 طویل عرصہ ہو گیا ہو۔ ان سنگین دیواروں اور دہشت
 زدہ ماحول سے جیسے اس کی خاصی پرانی شناسائی ہو۔
 قیدی عورت یہ سن کر آہستہ سے کرسی سے اٹھی
 اور آہنی پینک پر جا کر بیٹھ گئی۔

”میں پر سکون ہوں۔۔۔۔۔۔ بے حد پر سکون
 بلکہ مجھے یہ کہنے میں قطعی کوئی عار نہیں کہ اس سے قبل
 مجھے کبھی ایسا سکون میسر نہ ہو سکا تھا۔ میں ہر قسم کے
 ذہنی فکر سے آزاد ہو گئی ہوں اور ظاہر ہے کہ قلبی سکون
 ذہنی سکون کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر کسی کو ذہنی سکون میسر



یہ ہی طرز عمل اختیار کئے بشیر نہ رہتی لیکن میں نے
 --- کوئی جرم نہیں کیا۔“

قیدی عورت کے انداز میں بے پناہ خود اعتمادی
 تھی۔ وہ کوئی ایسی چٹان لگ رہی تھی جو انتہائی
 مضبوطی سے جمی ہوئی ہو۔ اس نے ایک نظر پھر راہبہ
 پر ڈالی اور کہنے لگی۔

”تم تو یہاں بوجھ ہلکا کرنے آئی تھیں۔ مجھے
 سکون عطا کرنے کا ارادہ لے کر آئی تھیں مگر یقین کرو
 تمہاری آمد سے میرا ذہنی سکون غارت ہو چکا ہے۔
 کچھ عرصہ قبل جو کچھ ہو چکا ہے میں اس کی یاد اپنے
 سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ
 تمہاری آمد کا مقصد میرے لئے بہت اہم ہے چنانچہ
 میں تمہارے آگے اپنی کتاب ماضی کے چند اوراق کی
 روگردانی ضرور کروں گی۔“

قیدی عورت نے پہلو بدلتے ہوئے راہبہ کا ہاتھ
 پکڑ لیا۔ راہبہ ایک دم چونک اٹھی۔ وہ اس کے ہاتھ
 کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ
 اس کی نظر قیدی عورت کے اذیت آمیز چہرے پر اٹھ
 گئی۔ جہاں دردِ غم کی پرتھلیاں بُری طرح ایک
 دوسرے میں مدغم لہرا رہی تھیں۔ چہرے کے اس تاثر
 نے راہبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ بجائے اپنا ہاتھ چھڑانے
 کے اس مظلوم قیدی عورت کے ہاتھ کو گرم چوٹی سے
 دبا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا جیسے وہ اسے تسلی دینا
 چاہتی ہو۔ ٹھنڈے سینے جیسی بوجیل کی دیوار کے
 پتھروں سے پھوٹ کر کوٹھری کی فضا میں پھیل رہی تھی
 ۔ جیل کی کسی دور افتادہ کوٹھری سے کسی اور قیدی
 عورت کی ہسٹریائی کی چیخوں نے ماحول کو اور
 پراگندہ کر دیا تھا۔

”تقریباً چھ ماہ قبل میرا چہرہ نرم، سفید اور گلابی
 ہوا کرتا تھا۔“ ایک طویل گہری سانس لینے کے بعد
 قیدی عورت نے روداد شروع کی۔

”میری آنکھوں کی گہرائی کے آگے جھیل شرمگوں
 ہو جاتی تھی۔ شدید جذبہ الفت نے میری آنکھوں کو
 ایک ایسی ساحرانہ چمک عطا کر دی تھی کہ جو دیکھتا وہ
 دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میرے مہکتے بال ریشم جیسے نرم و

دالی عورت کے پاس جا رہی ہے ورنہ یوں حواس
 باختہ ہو کر بائبل کی ورق گردانی نہ کرتی۔ اس نے
 اپنے کھلے بالوں کو ایک خاص انداز میں جھک دیا تو
 وہ اس کی پشت سے لہرا کر اس کے دائیں شانے پر
 پھیل گئے۔ پھر وہ پٹنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور
 بڑے نپے ٹٹے انداز میں جیل کی کوٹھری کے تنگی فرش
 پر ٹہلنے لگی۔

وہ کوئی ایسی عورت نہیں تھی کہ اس کے چہرے
 کے نقش و نگار خوبصورت کہلائے جاسکتے۔ اس کے
 چہرے پر ایک خاص قسم کا بجھا بجھاپن سا تھا اور جوانی
 کا دور ہونے کے باوجود چہرے پر باریک باریک
 جھریوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں خاصی
 دراز تھیں اور آنکھیں بھی بڑی مگر سرخ
 سرخ۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کئی رتجوں کا شکار ہو
 کر آنکھیں خون آلود ہو گئی ہوں یا خلا میں کسی غیر مرئی
 شے کو مسلسل ڈھونڈتے رہنے سے چہرے کا تمام خون
 آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ وہ چند لمحے کی اس چھل
 قدمی کے بعد راہبہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور
 براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اس
 انداز میں جیسے وہ راہبہ کی آنکھوں میں اتر کر اس کے
 من کا حال پڑھنا چاہتی ہو۔

”میرا خیال میرا مشاہدہ اور میرا تجربہ بتاتا ہے
 کہ۔۔۔۔۔ ایک لمحے کو رگ کر اس نے راہبہ
 کے چہرے پر نظر ڈالی۔

”تم ایک پُر تجسس قسم کی عورت ہو۔ تم اپنے
 تجسس کو تسکین پہنچانے کی خاطر یہاں آئی ہو اور یہ
 ایک بیمار نسوانی خواہش کا ایک انداز ہے۔ ایک ایسی
 عورت کی آرزو جس کے احساسات اور جذبات کا
 قدم قدم پر گلا گھونٹا گیا ہو اور جسے ان جذبوں اور
 احساسات کا اظہار کرنے کیلئے کسی ذریعہ کی ضرورت
 ہو۔ براہ کرم مجھ سے بحث مت کرنا۔“

اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر راہبہ کو ٹوکا
 کیونکہ راہبہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا ارادہ ظاہر کر
 رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ ان حالات میں میں خود بھی

اور پھر میں بے بس کر دی گئی۔ یقین کرو میرا ارادہ خود کو بھی شوٹ کر لینے کا تھا کیونکہ اب مجھے یہ فکر نہیں رہی تھی کہ دن کے وقت میرا چہرہ کیسا نظر آتا ہے؟“ وہ چپ ہو گئی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری برس رہی تھی۔ وہ چٹان جیسی عورت اب باقاعدہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

چرچ سے آبنوالی راہبہ جو اس کو سکون بہم پہنچانے کی غرض سے آئی تھی ایک عالم بے سکون میں کھڑی ہو کر اس عورت کو تک رہی تھی۔ اجانک راہداری میں محافظ کے قدموں کی آواز گونجنے لگی تو راہبہ چونکی۔ اس کے ساتھ قیدی عورت نے بھی آنسو پونچھ کر اپنا سر اٹھایا۔

”تم نے دیکھا بعض معاملات کس طرح خود بخود سلجھ جاتے ہیں۔“ قیدی عورت نے سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ راہبہ نے جواب دیا۔ اب اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

”لیکن میں نے اپنے مصنوعی حسین چہرے کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ چند روز بعد جب اسے میری بد صورتی کا علم ہوا تو اس نے مجھے دھتکار دیا۔“ اس کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔

”وہ میرے جذباتوں کا خون کرنے کے بعد تمہارے حسن کا طلبگار بن گیا تھا۔ وہ حسین چہروں کا شیدا کی تھا۔ اس نے تمہارا انتخاب کر لیا تھا اور جب مجھے اس کے انجام کا علم ہوا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن یہ سب ہوا کس طرح یہ سب جاننے کیلئے میں تمہارے پاس آئی تھی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ کیسی نظر آتی ہوں۔“

راہبہ نے ایک نظر قیدی عورت پر ڈالی اور سلاخوں والوں دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں راہداری سے نکلنے ہوئے بار بار مڑ کر قیدی عورت کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ اس انداز میں جیسے اس قیدی عورت نے کوئی تحسین آمیز کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

☆☆☆

جب اس بھدے چہرے کے ساتھ دیکھے گا تو اسے دنیا کی تمام عورتوں سے نفرت ہو جائے گی اور باقی ماندہ زندگی ایک زندہ لاش کی مانند گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میری قربانی ضائع ہو جائے گی اور پھر یہ خیال آتے ہی ایک کمزور اور بیمار کر دینے والی ماپوسی مجھ پر اثر انداز ہونے لگی۔ تب میں نے خودکشی کا ارادہ ملتوی کر کے کہیں دور چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

ایسی جگہ جہاں کوئی واقف کار نہ ہو آشنا نہ ہو شناسا نہ ہو سب اجنبی ہوں۔ اجنبیوں کے درمیان اجنبی بن کر زندگی گزارنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے ریوالور کو لبادے میں چھپایا اور واپس ڈیڈی کے میز کی دراز میں رکھنے کیلئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ لیکن ڈیڈی کے کمرے تک پہنچی نہ تھی کہ ایک ستون کی آڑ سے میرے منگیترنے نکل کر پیچھے سے مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑ لیا۔ تم ظریفی یہ تھی کہ میں اس وقت میک آپ سے عاری اپنے بھدے چہرے کے ساتھ اس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ جوں ہی وہ مجھے گھما کر میرا چہرہ اپنے سامنے لایا میرا ہاتھ لبادے میں چھپے ریوالور پر مضبوطی سے جم گیا اور اس سے پہلے کہ وہ میرا حقیقی نفرت انگیز چہرہ دیکھ کر خوف سے چیخ اٹھتا۔ میری منحوس شکل دیکھ کر نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیتا۔ میں نے غیر ارادی طور پر ریوالور کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا اور دیوانہ وار دبانی چلی گئی۔“

قیدی عورت کے چہرے پر جنونی کیفیت عود کر آئی تھی۔ اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا تھا۔ راہبہ نے یہ دیکھا تو اس کے منہ سے خوف زدہ سی چیخ نکل گئی۔ اس وقت قیدی عورت کو بھی اپنی وحشیانہ حالت کا ادراک ہو گیا۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں راہبہ سے کہا۔

”پہلے تو میں سکتے کے سے عالم میں رہ گئی پھر جونہی مجھے ادراک ہوا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ بے اختیار میرا ریوالور والا ہاتھ اٹھا میرا ارادہ تھا کہ باقی گولیاں میں اپنے سر میں اتار لوں اور میں نے جونہی اس ارادے سے ہاتھ اٹھایا کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا



میں کس جگہ
سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

ترقی بخانا چاہیے

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز	کویت
55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز	یو اے ای
55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز	مصر
55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز	یونان
55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز	فرانس
55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز	برطانیہ
55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز	ناروے
65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز	امریکہ
65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز	افریقہ

زمرگانہ

آج ہی رابطہ کیجیے II 88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

WWW.PAKSOCIETY.COM

روٹین لائف

بنت ۱۱

آج کی وہ کہانی، جس سے ہر شخص گزر رہا ہے ایک نوجوان کی زبانی

مسافروں کی باتوں سے پتا چلا کہ بس کسی موٹر سائیکل سوار کو کمر مارتے ہوئے گزر گئی ہے۔

”کچھ بچت ہوئی بھائی صاحب؟“ ایک مسافر نے باہر جھانکنے والوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

”ہاں ہاں بچت ہو گئی ہے زیادہ سے زیادہ پاؤں کی

بڑی ٹوٹی ہوئی بس“ دوسری طرف خاصی مایوسی سے کہا

گیا۔ موٹر سائیکل سوار کو کسی بھی قسم کی مدد دے بغیر بس

آگے بڑھ گئی اور لوگ پھر سے اپنی باتوں میں مگن ہو گئے

یوں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ابھی وہ لوگوں کی بے بسی پر

کڑھ ہی رہا تھا کہ آگے سے کسی کے زور زور سے بولنے

پر وہ ادھر متوجہ ہو گیا کنڈیکٹر کی مسافر سے کم کرایہ دینے

پر جھگڑ رہا تھا، کچھ لوگ اس مسافر کا ساتھ دیتے ہوئے

بس والوں کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے تو کچھ بڑھتی ہوئی

مہنگائی کا رونا رورہے تھے، پچھلی سیٹوں پر بیٹھی خواتین

میں سے ایک کا بچہ شاید گرمی سے گھبرا کر چیخ کر رونے

لگا، گرمی اور ٹھن کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی آوازوں

نے اس سفر کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیا۔

”کیا زندگی بس کے اس سفر سے کچھ مختلف

ہے؟“ فیصل نے سوچا اور غیر ارادی طور پر انکار میں

گردن ہلانے لگا۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ دور نہیں جانا

لوگوں سے بھری بس سٹاپ پر آ کر رکی تو فیصل سمیت کئی لوگ اس پر سوار ہونے کے لیے دوڑے اور وہ

بس جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اب اس میں کسی انسان کی تو کیا شاید ہوا کی بھی جگہ نہیں رہی حیرت انگیز طور پر چند لمحوں

میں سٹاپ پر کھڑے سب لوگوں کو اپنے اندر غائب کر چکی

گئی۔ بس سٹاپ کسی فقیر کے کشتلوں کی مانند خالی

ہو گیا اور بس اچھلتی کودتی آگے بڑھ گئی۔ بس کے چلنے

سے صاف پتا چل رہا تھا کہ بس کا کنٹرول کسی انارٹی کے

ہاتھوں میں ہے یکدم لگنے والی بریک سے جھٹکا لگنے

پر فیصل نے بے اختیار ایک ہاتھ سے کندھے پر لٹکا چھوٹا

سایک سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ساتھ کھڑے

آدمی کا بازو پکڑا تو اس نے جھنجھلاتے ہوئے فیصل کا ہاتھ

جھٹک دیا لیکن اپنے بازو کو فیصل کی گرفت سے آزاد نہ کرا

سکا تو غصے سے اس کی طرف نڑا۔

”معاف کرنا بھائی“ اس سے پہلے کہ وہ آدمی فیصل

کو بُرا بھلا کہنا شروع کرتا فیصل جلدی سے معذرت

کرتے ہوئے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی

مسافروں کے کھڑکیوں سے سر نکال کر دیکھنے پر وہ دونوں

بھی باہر کی طرف متوجہ ہو گئے ان کے اور کھڑکیوں کے بیچ

میں اتنے لوگ تھے کہ باہر دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن دوسرے

سائے پا کر بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی۔
”آؤ نائدر آؤ“ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا وہ
فیصل کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔
”سلام خالہ“ آمنہ کی ساس بھی دستک کی آواز سن
کر اپنے کمرے کے دروازے تک آگئی تھی اس پر نظر
پڑتے ہی فیصل نے بڑے ادب سے سلام کیا جواب میں
خالہ منہ بنا کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے کے اندر چلی گئی۔
آمنہ بھائی کے اس استقبال پر دل ہی دل میں کلس کر رہ
گئی جب کہ فیصل شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

”ماموں جی ماموں جی“ پانچ سالہ بھانجی شہزادی
ماموں کو دیکھتے ہی خوشی سے چلاتے ہوئے فیصل سے
لیٹ گئی تو آمنہ اور فیصل بھی سب بھول کر اس کی طرف
متوجہ ہو گئے۔

”تم بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں“
”نہیں آمنہ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے چلتے نام ہی
نان چنے کھائے تھے“ اس نے دانہ جھوٹ بولا۔

تھا جلد ہی اسے اس سفر سے نجات مل گئی وہ بس سے اترا
ہی تھا کہ رکشے والوں نے اسے گھیر لیا وہ سب کو منع کرتا
ایک طرف چلنے لگا اس کی منزل کچھ زیادہ دور نہ تھی لیکن
ذہن میں ابھرتی سوچوں کی وجہ سے چند قدم چلنے کے
بعد ہی اس کی چال سے ٹھکن جھلکنے لگی۔ ٹریفک سے بچتا
بچاتا وہ دائیں طرف کی ایک گلی میں مز گیا۔ گلی کی حالت
اور وہاں پر موجود مکان وہاں بسنے والوں کی غربت کی
کہانی سن رہے تھے۔ گلی آخر میں جا کر کافی تنگ ہو جاتی
تھی کچھ ہی دیر میں وہ اس تنگ گلی کے آخری مکان کے
دروازے پر کھڑا تھا۔ گرمیوں کی اس دوپہر میں سب
لوگ گھروں میں آرام کر رہے تھے گلی میں کوئی بچہ تک
دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مطلوبہ مکان کا دروازہ اندر سے بند
تھا وہ ایک لمحے کو ہچکچایا لیکن پھر آگے بڑھ کر دروازے پر
دستک دینے لگا دروازہ دوسری دستک پر ہی کھل گیا۔

”فیصل بھائی آپ اتنی اچانک دوسری طرف
دروازہ کھولنے والی اس کی بہن آمنہ بھائی کو اچانک

Downloaded From
Paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM

بھرنے چلی آئی، ارم جو کہ آمنہ کی نند کے سرسالی رشتے داروں میں سے تھی آمنہ کے گھر ہونے والی پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ فیصل اپنی ماں کو ارم کے گھر بھیجتا ایک رات سینے میں اٹھنے والے اچانک درد نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اسے خالق حقیقی سے ملا دیا، منیر آمنہ کو کم کم ہی میکے آنے کی اجازت دیتا تھا اور اس کے میکے والوں کے

آنے پر بھی منیر اور اس کے گھر والوں کا رویہ بہت خراب ہوتا تھا اسی وجہ سے ماں باپ کے بعد فیصل ایک دم ہی پوری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ وہ کئی دن اپنے ایک کمرے کے مکان میں پڑا رہا، زندگی سے اس کا دل اوب گیا تھا بے کاری کے اس دور میں اس کے پاس جو کچھ تھا سب خرچ ہو گیا جس ٹھیکیدار کے پاس وہ کام کرتا تھا اس کی اتنی لمبی غیر حاضری نے اسے غصہ دلا دیا اور اس نے ہزار منت سماجت کے باوجود فیصل کو دوبارہ کام پر رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ کراہت نہ دینے کی وجہ سے گھر سے بھی بے گھر ہو گیا یا دوست بھی سب اس کی طرح تازہ کمانے تازہ کھانے والے لوگ تھے ان سے کچھ زیادہ مدد کی امید رکھنا بے کار تھا کوئی اور راستہ نہ پا کر وہ اپنے گھر کا سامان ایک دوست کے گھر رکھ کر آمنہ کی سرسالی چلا آیا تھا جہاں ہمیشہ کی طرح اس کا استقبال بہت بدولی سے کیا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اور سناؤ سائلے صاحب کیا ہو رہا ہے آج کل“ شام کو منیر گھر لوٹا تو فیصل محن میں چار پانی پر بیٹھا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سلام دعا کے فوراً بعد ہی منیر نے سوال داغا۔

”بس وہی بھائی جان اور کیا کرنا ہے“ فیصل نے گول مول سا جواب دے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”اچھا مجھے تو پتا چلا تھا ٹھیکیدار نے تجھے کام سے نکال دیا ہے“ منیر کچھ زیادہ ہی باخبر تھا جانے کیوں۔ اچھل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”آپ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالیں باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں“ آمنہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے فوراً بھائی کی مدد کو آئی۔

”ہاں بھوک تو بہت لگی ہے آج دوپہر میں بھی کچھ

”نہیں پیاری بہنا صرف سادہ پانی کا ایک گلاس لے آؤ“ فیصل کے کہنے پر آمنہ پانی لینے کمرے سے باہر چلی گئی اور فیصل شہزادی کی طرف متوجہ ہو گیا، اس کے معصوم سوالوں کا جواب دیتے ہوئے فیصل وقتی طور پر سب کچھ بھول گیا۔

☆.....☆.....☆

فیصل اور آمنہ اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھیں، آمنہ فیصل سے عمر میں تین چار سال چھوٹی تھی، فیصل کا باپ مزدوری کرتا تھا، ان کی ساری زندگی کرائے کے مکان میں گزری تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں تمام زندگی جسم و جاں کا تعلق قائم رکھنے کی تک و دو میں گزر جایا کرتی ہے، خواب اگر بھولے بھٹکے آنکھوں میں اتر آئیں تب بھی گھبرا کر جلد ہی فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں پڑھائی لکھائی عیاشی اور بڑے لوگوں کے چونچلے مانے جاتے ہیں، ان دونوں بہن بھائیوں کی زندگی بھی ایسے ہی گزری تھی۔

آمنہ اٹھارہ سال کی تھی جب اس کے لیے منیر کا رشتہ آیا۔ منیر پھل، سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا بقول آمنہ کے باپ نے لڑکے کا اپنا کاروبار تھا سرسالی میں دو بیٹیاں مندیں اور ایک ساس بھی رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا ویسے بھی جب کسی رشتے کی امید نہ ہو تو آنے والا پہلا رشتہ ہی بہترین دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسے میں منیر کی بڑھتی عمر، بچے رنگ اور تیزی سے گھٹنے ہوئے سر کی طرف کس کا دھیان جانا تھا۔ ماں باپ بیٹی کو رخصت کر کے گنگا نہا لیے۔ فیصل بھی اپنے ساتھ کے دوسرے لڑکوں کی طرح چھوٹی عمر سے ہی باپ کے ساتھ مزدوری کے لیے جانے لگا تھا۔ سخت محنت نے فیصل کے باپ کو عمر سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا کمزور جسم زیادہ دیر بیماری کو برداشت نہ کر سکا اور تھوڑا عرصہ بیمار رہنے کے بعد ہی وہ زندگی کی اس نئید با مشقت سے رہائی پا گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری فیصل کے کندھوں پر آگئی۔ ایک مستری کی شاگردی میں جا کر وہ اچھا مستری بن گیا۔ دونوں ماں بیٹا کچھ دن غم منانے کے بعد ایک بار پھر زندگی سے جنگ میں مصروف ہو گئے اس بے رنگ زندگی میں ارم رنگ

نہیں کھایا۔ منیر کی توجہ کھانے کی طرف ہوتے دیکھ کر فیصل نے سکون کا سانس لیا اور تشکر بھری نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ منیر کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا اسی لیے گھر سے باہر نکل آیا اور سمت کا تعین کیے بنا چلتا ہوا گھر سے کافی دور نکل آیا، اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی سڑک کی دوسری طرف ایک چھپر ہوٹل تھا اس نے اپنی جیب کو ٹٹول کر پیسوں کی موجودگی کو محسوس کیا اور ہوٹل کی طرف چلا آیا۔ ٹی وی پر کوئی پرانی فلم چل رہی تھی۔ وہ دیر تک سکرین پر نظریں جمائے چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ منیر سوچکا ہوگا تب وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو کچن سے آتی آوازوں میں ارم کی آواز پہچانتے ہوئے فیصل کا دل ارم کو دیکھنے کو مچلنے لگا۔ وہ جان بوجھ کر خاصی بلند آواز سے بول رہی تھی مقصد فیصل کو جگانا اور اپنی آمد کی خبر کرنا تھا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے فیصل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل دیا جہاں ارم بڑے زور و شور سے آمنہ کے ساتھ کسی ڈرامے کو ڈسکس کر رہی تھی۔

”السلام علیکم!“ سلام کی آواز بر دونوں نے چونک کر کچن کے دروازے پر کھڑے فیصل کی طرف دیکھا۔

”صبح ہو گئی جناب کی؟“ ارم کے بے اختیار کہنے پر آمنہ اور فیصل ہنس دیے تو ارم بھینپ گئی۔

”چلو تم دونوں باہر چل کر بیٹھو میں ناشتا لے کر آتی ہوں“ آمنہ کے کہنے پر وہ دونوں کچن میں چھٹی چار پائی پر آ بیٹھے۔

”کیسی ہو؟“ فیصل نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”زندہ ہوں“ ارم کے لفظوں اور لہجے میں اداسی کا رنگ جھلکنے لگا۔

”ایسے کیوں کہہ رہی ہو کوئی مسئلہ ہے کیا“ فیصل نے پریشانی سے پوچھا لیکن ارم اس کی بات کا جواب نہیں دے پائی تھی کیونکہ اس کی نظر باہر سے آتی آمنہ کی

ساس پر پڑ گئی تھی۔

”اور سائیں کب تک ہیں یہاں؟“ خالہ پر نظر پڑتے ہی ارم موضوع بدل گئی۔

”یہ بات نہ پوچھو بی بی گھر بار رہا نہیں اب تو لگتا ہے یہیں عمر گزارے گی، ایک ہمارا زمانہ تھا بھائی بہن کے گھر کا پانی تک نہ پیتے تھے اب تو کوئی شرم حیا ہی نہیں رہی لوگوں میں“ خالہ نے ہاتھ میں تھا ما سبزی کا شا پر چار پائی پر رکھتے ہوئے اونچی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کچن میں ناشتا بناتی آمنہ کا تیزی سے چلتا ہاتھ ٹھم گیا، بھائی کی ذلت پر اس کا دل بے حد دکھی ہو گیا رہ کون کیا تھا اس کے میسے میں ایک بھائی ہی تو بچا تھا اور فیصل کا بھی اور کون تھا ایک بہن کے سوا یقیناً آمنہ کی ساس کو بھلا یہ بات کون سمجھاتا، خالہ کی بات پر فیصل کا چہرہ بھی ذلت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔ ”خالہ یہ سوٹ تو آپ پر بہت ہی سچ رہا ہے کتنے میں لیا؟“

”ارے سچے گا کیسے نہیں پورے پانچ سوکا ہے، کم بخت آٹھ سوکا کہہ رہا تھا بڑی مشکل سے پانچ سو پھانا“ ارم خالہ کا دھیان ان کی پسند کے موضوع کی طرف لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب انہیں فیصل کا تو کیا کسی کا بھی خیال نہیں آتا تھا۔

”رات کو دس بجے چھت پر ملنا میں انتظار کروں گی“ ارم نے سرگوشی کی فیصل سر ہلاتا وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ اندر جا کر وہ سستی سے بستر پر بیٹھ گیا یا پھر سے ارم اور خالہ کی باتوں کی آوازیں ابھی تک آرہی تھیں۔

”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے کیوں پریشان وہ“ فیصل بالوں میں ہاتھ پھیرتا اسی سوچ میں کم تھا۔ ”لو ناشتا کر لو“ آمنہ کی آواز پر وہ چونکا اور کچھ کہے بنا خاموشی سے ناشتا کرنا شروع کر دیا، ناشتے کے بعد وہ ایک بار پھر گھر سے باہر نکل گیا اس کے پاس سڑکیں ناپنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی نظر کرکٹ کھیلتے لڑکوں پر پڑی تو وہ بے دھیانی میں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا، وہ ایک چھوٹا سا خالی پلاٹ تھا جس پر جنگلی پودوں کے ساتھ ساتھ کوڑا کرکٹ بھی پڑا تھا مگر

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

کھینٹنے والوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا ابھی صبح کا ہی وقت تھا پھر بھی گرمی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ لڑکے بڑی طرح پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

مگر انہیں جیسے اس بات سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ کھینٹنے میں مگن تھے بیٹنگ کرتے لڑکے نے پوری قوت سے بلا گھمایا گیند بڑی تیزی سے فضا میں اچھلی اور فیصل کی طرف آئی فیصل نے بالکل بے خیالی میں تیزی سے اپنی طرف آتی گیند کو کچھ کر لیا۔

”واہ بھائی بڑا اچھا کچھ کیا تم نے آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کھیلو“ ایک لڑکا جو شاید ان سب میں خاص اہمیت رکھتا تھا تو صوفی لہجے میں کہتے ہوئے اسے کھینٹنے کی دعوت دے رہا تھا فیصل نے ایک نظر ان سب کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

فیصل نے آمنہ سے کہہ کر اپنا بستر چھت پر لگوا دیا تھا اور اب وہ کافی دیر سے بستر پر بیٹھا دس بجنے کا انتظار کر رہا تھا ارم اور آمنہ کے گھر کی چھتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ بڑی آسانی سے ایک چھت سے دوسری چھت پر آیا جاسکتا تھا، ساتھ والی چھت پر ہلکی سی آہٹ ہوئی فیصل چونک کر اس طرف دیکھنے لگا لیکن آمنہ کی بجائے ملی کو چھل تندی کرتے دیکھ کر فیصل کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی، ہوا بند ہونے کی وجہ سے جس بڑھ گئی تھی گھر کا واحد سینڈ پنکھا صحن میں رکھا ہوا تھا جہاں پانی چھڑک کر سرے شام ہی سب کی چار پائیاں بچھا دی جاتی تھیں، نیچے گھر کی کبھی روشنیاں بند کر دی گئی تھیں آسمان پر موجود آخری راتوں کے چاند کی روشنی اندھیرے کو مٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ ”ابھی تک آئی کیوں نہیں موبائل سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پریشانی سے بڑبڑایا جہاں رات کے ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ گرمی اور جس نے فیصل کی حالت خراب کر رکھی تھی اب وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے چھت پر سونے کا فیصلہ کیا تھا رہی سہی کسر موٹے موٹے چھروں نے پوری کر دی تھی جو بڑی بے تکلفی سے فیصل کے خون سے فیض یاب ہو رہے تھے، دس منٹ اور گزرے تو فیصل کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو گیا وہ

چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چھت پر دائیں بائیں چلنے لگا چھت زیادہ بڑی نہ تھی اسے بار بار رگ کر دوسری طرف مڑنا پڑتا تھا فیصل جلد ہی اس مشغلے سے اکتا گیا اور واپس آ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے جب اسے ارم کی سرگوشی سنائی دی وہ اسے پکار رہی تھی فیصل کے بے جان جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی اکتاہٹ ایک دم اڑن چھو ہو گئی۔

”کب سے انتظار کر رہا ہوں کہاں رہ گئی تھیں تم؟“ وہ تیزی سے ارم کی چھت کی طرف بڑھتے ہوئے دھکی آواز میں ناراضگی سے پوچھنے لگا۔

”کیسے آئی آج امی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ ابھی ان کی آنکھ لگی تو میں دوڑی دوڑی تمہارے پاس آ گئی“

اچھا چھوڑو اس بات کو تم وہاں کیوں کھڑی ہو ادھر آ جاؤ ناں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں“ فیصل کا اشارہ چھت پر پچھی چار پائی کی طرف تھا ارم نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور چھوٹی سی سنڈیر پر سے ٹوڈ کر فیصل کے پاس آ گئی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے اتنی کمزور ہو رہی ہو اور رنگ بھی کتنا پیلا زرد ہو رہا ہے کیا بیمار ہو؟“ چار پائی پر ساتھ ساتھ بیٹھتے ہوئے فیصل نے بغور ارم کی طرف دیکھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا ارم سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

”کیا ہوا کچھ تو بتاؤ“ فیصل نے دائیں ہاتھ سے ارم کا چہرہ اوپر کیا تو ارم کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے اسے اور بھی پریشان کر دیا ”میرے چاہے نے اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے“ اتنا کہہ کر وہ پھر سکٹنے لگی ”اور تم نے ہاں کر دی؟“ فیصل نے بے تابی سے سوال کیا۔

”میرے ہاں یا ناں کرنے سے کیا ہوتا ہے ہونا تو وہی ہے جو ابا چاہے گا، تو کچھ کرنا، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی“ ارم نے روتے ہوئے اپنا سر فیصل کے کاندھے پر ٹکا دیا مگر وہ اسے تسلی تک نہ دے سکا کہ اپنے حالات اس کے سامنے تھے وہ اس وقت بے روزگار تھا کوئی بھی ماں باپ اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دیتے ہوئے ہزار

آواز سے سوچوں کی دنیا سے باہر نکال لائی تو وہ نماز پڑھنے کے لیے بستر سے اٹھ بیٹھا۔

☆.....☆.....☆

فیصل صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا گرمیوں کی صبح ذرا جلدی ہی ہو جایا کرتی ہے اسے اندازہ تھا کچھ ہی دیر میں ساری چھت دھوپ سے بھر جائے گی اسی لیے وہ نیچے آکر کمرے میں سو گیا آمنہ کو بھی اندازہ تھا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے اس لیے اس نے فیصل کو ناشتے کے لیے بھی نہیں جگا یا۔

اس کی آنکھ گرمی کی وجہ سے کھلی تھی بچکی کے جانے سے پٹکھا بند ہو گیا تھا وہ تھوڑی دیر بستر پر پڑا کسماتا رہا اس کے کپڑے سینے سے تر ہو چکے تھے۔

”اٹھ جاؤ بھائی ناشتا کر لو“ گھر کے کام ختم کر کے آمنہ کھلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو فیصل کو جاگتا دیکھ کر بولی۔

”ابھی نہیں۔۔۔ بھوک نہیں ہے“ فیصل کا کچھ بھی کھانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا اسی لیے صاف انکار کر گیا۔

”بھائی۔۔۔ وہ ایک بات پوچھنا تھی“ آمنہ کچھ جھجک کر بولی۔

”ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“ فیصل نرمی سے کہتا بستر پر اٹھ بیٹھا اب وہ غصہ نہگا ہوں سے آمنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”وہ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ اب آگے کا کیا سوچا ہے میرا مطلب ہے کیا کام کرنے کا ارادہ ہے؟“

”کرنا تو وہی ہے جو ساری عمر سے کرتا چلا آ رہا ہوں۔ ایک ٹھیکیدار سے بات کی ہے امید ہے جلد ہی کام مل جائے گا“

”چلو خیر اللہ بہتر کرے گا تم منہ ہاتھ دھولو کچھ کھانے کا دل نہیں کر رہا تو میں لے آتی ہوں“ آمنہ اس کا جواب سنے بنا کمرے سے نکل گئی اور فیصل ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کے وہاں رہنے سے آمنہ کو روز اپنے سسرال والوں سے ہزار طرح کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اسے خود بھی اس طرح رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا ”مجھے جلدی ہی کچھ کرنا پڑے

بار سوچتے۔ ان حالات میں ارم کے گھر رشتہ بھیجنا ہی اسے بے وقوفی لگ رہا تھا ویسے بھی ارم کا باپ فیصل کو کچھ خاص پسند نہ کرتا تھا اور اب تو مقابلے میں اس کا سگا بھتیجا تھا پھر وہ اپنے بھتیجے کی بجائے فیصل کا رشتہ کیونکر قبول کرنا لہجوں میں ساری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے فیصل کا دل اس کے سینے میں ڈوبنے لگا۔ ”تو چپ کیوں ہے کچھ بول نا، تو بھابی آمنہ کو بھیجے گا نا میرے گھر؟“ ارم نے اس کی خاموشی سے جانے کیا مطلب نکالا تھا کہ اس کے لہجے میں ہجر کا خوف جھلک آیا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں میں ضرور بھیجوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تیرا ابا انکار نہیں کرے گا آخر ایسا گہرو جوان کہاں ملے گا اسے اپنی بیٹی کے لیے“ فیصل نے ہلکے ہلکے لہجے میں کہتے ہوئے ارم سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔ فیصل کے یقین پر ارم کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں“ ارم نے اٹھتے ہوئے کہا تو فیصل بے اختیار اس کا ہاتھ تھام گیا۔

”اتنی جلدی کیا ہے تھوڑی دیر تو بیٹھ“ وہ اصرار کر رہا تھا۔

”نہیں ابھی مجھے جانا ہو گا کوئی جاگ گیا تو مصیبت آجائے گی“

”چل جیسے تیری مرضی“ فیصل بھی اس وقت محتاط رہنا چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ ارم کو کھو بیٹھے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ارم کو جانے کی اجازت دے دی۔

”بھابھی آمنہ کو جلدی بھیجنا“ ارم نے جاتے جاتے یاد دہانی کرائی فیصل کچھ بھی نہ کہہ سکا ارم احتیاط سے منڈیر کر اس کرتی دھیرے دھیرے بیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

”پتا نہیں اور کیا کیا لکھا ہے قسمت میں“ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے فیصل نے یوں آسمان کی طرف دیکھا جیسے اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہو۔ پھر جانے کتنی دیر وہ آمنہ سے بات کرنے کے منصوبے بنا تا رہا ارم کے ماں باپ کو اس رشتے کے لیے راضی کرنے کے لیے اسے کوئی راستہ بھانکی نہ دے رہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے خبر بھی نہ ہوئی اور رات دے قدموں گزرتی چلی گئی۔ موذن کی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

”دیکھو ارم اس طرح رونے سے مسئلہ تو حل نہیں ہو گا“ وہ بلاشبہ بیسویں مرتبہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”روؤں نہیں تو اور کیا کروں تم ہی بتاؤ میں کیسے کر لوں قاسم سے شادی..... ایک نمبر کا آوارہ چھوڑا انسان ہے وہ اور سب سے اہم بات کہ وہ آسمان سے اتر فرشتہ بھی ہوتا تب بھی مجھے اس سے شادی نہیں کرنا تھی میں تو۔۔“ وہ روائی سے کہتی ایک دم خاموش ہوئی آمنہ نے ارم کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو دروازے پر فیصل کو کھڑا پایا، وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی شاید ان دونوں کو بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ وہ ارم کی ادھوری بات کا مطلب بھی باخوبی جانتی تھی کہ فیصل کے ذکر پر ارم کے چہرے پر کھلتے گلاب بھی دیکھ رکھے تھے اور ارم کو دیکھ کر فیصل کی آنکھوں میں جلتے دیپوں سے بھی واقف تھی۔ ارم اسے بھی بہت پسندھی وہ دل سے چاہتی تھی کہ ارم اس کی بھابی بنے لیکن حالات کو بدلنا اس کے اختیار میں نہیں تھا ورنہ سارے جہان کی خوشیاں سمیٹ کر اپنے پیارے بھائی کے دامن میں ڈال دیتی۔

☆.....☆.....☆

”کیوں رو رہی ہو تم؟“ فیصل نے ارم کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تو وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

”وہ سب جانتا ہوں میں لیکن دیکھو میں کوشش کر تو رہا ہوں مجھے تھوڑا وقت دو میں جلد آمنہ کو تمہارے گھر بھیجوں گا سب ویسے ہی ہوگا جیسے ہم نے سوچا تھا سچی“ ارم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ اس سے زیادہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔ ”ارم تمہارا بھائی آیا ہے تمہاری امی بلا رہی ہیں تمہیں“ آمنہ نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی تو ارم کچھ بھی کہے بنا دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، فیصل اداس نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

”آگئی ہے تمہاری لاڈلی خود بات کر لو اب اس سے“ ارم گھر میں داخل ہوئی تو فاخرہ اسے دیکھتے ہوئے ناراض لہجے میں ارم کے باپ سے بولی اور خود اٹھ کر

”گا“ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب تھا اور پھر وہ کچھ فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

”آخر تجھے تکلیف کیا ہے؟ کیوں انکار کر رہی ہے“ ارم کے مسلسل انکار نے اس کی ماں کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

”میں نے کہہ دیا تا امی میں نے ابھی شادی نہیں کرنی اور اس قاسم سے تو کبھی بھی نہیں کرنی“ ماں کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔

”چپ کر جا بے شرم خود تو مرے گی ہی مجھے بھی پڑائے گی اپنے باپ سے“ فاخرہ نے غصے سے کہتے ہوئے پاس بیٹھی ارم کی کمر پر زور کا دوپٹہ مارا وہ اس اجانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی تبھی آگے کو گر گئی ”ہائے“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”امی میری پٹائی کرو یا جان سے مار دو مگر میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا“ ارم کی اس دیدہ دلیری پر فاخرہ نے پھر سے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اس بار ارم ہوشیار تھی اس لیے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

”تو رک جا آج تیرے باپ کو بتانی ہوں تیرے سارے کرتوت، کیا سمجھتی ہے تو مجھے خبر نہیں کہ تو کس کے چکر میں اس رشتے سے انکار کر رہی ہے“ فاخرہ غصے سے چلائی۔

”جب تو اچھی طرح جانتی ہے تو پھر میری بات مان کیوں نہیں لیتی آخر“ شاید آج ارم بھی اس مسئلے کو حل کر لیتا چاہتی تھی۔

”ہائے میرے رہا کیا گناہ کیا تھا میں نے جو ایسی بے شرم اولاد میری قسمت میں لکھی گئی لو سنو بھلا اپنے منہ سے اپنا بڑ مانگ رہی ہے۔ ایسی بے حیا اولاد سے تو بندہ بے اولاد بھلا“ فاخرہ نے سینے پر ہاتھ مار کر دہائی دینا شروع کر دی تو ارم بدمزہ سی ہو کر کمرے میں چلی گئی فاخرہ دیر تک اسے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی لیکن وہ کان لپیٹے اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگی رہی۔

☆.....☆.....☆

ارم مسلسل روئے چلی جا رہی تھی اسے چپ کرانے کی آمنہ کی ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔

جائے تھے۔ کافی عرصہ ایک ہی ٹھیکدار کے پاس کام بھی کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نیاز کی ہمدردی پا کر فیصل اپنی ہر پریشانی کہتا چلا گیا۔

”مجھ نہیں آتی یا آخر قسمت میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ تو جانتا ہے میں کیسا اچھا مستری ہوں۔ کیسی صفائی ہے میرے ہاتھ میں مگر جس کے پاس بھی کام مانگتے جاتا ہوں انکار ہو جاتا ہے“ فیصل کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی۔

”فکر نہ کر یا رکبھی کبھی ہوتا ہے ایسا بھی لیکن جیسے اچھے دن ہمیشہ نہیں رہتے ایسے ہی برے دنوں نے بھی آخر گزر جانا ہوتا ہے، تیرے حالات دیکھتے ہوئے فی الحال میرے ذہن میں بس ایک ہی بات آ رہی ہے۔

دیکھو تو برائے ماننا لیکن اگر تو کچھ دن اڈے پر جانا شروع کر دے“ نیاز کا مشورہ سن کر فیصل چپ سا ہو گیا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میرا مطلب ہے کہ دہاڑی لگ جائے تو کچھ تو آئے گا ہاتھ میں“ فیصل اس بار بھی خاموش رہا وہ کسی سوچ میں تھا۔ نیاز کا مشورہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ چائے کا کپ خالی ہوتے ہی فیصل جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو،

”پار ایک کام تو کرنا یہ موبائل ہے وہ اپنے عابد صاحب نہیں ہیں وہ تہہ باری بہن کی گلی سے ایک گلی چھوڑ کر جن کا گھر ہے، وہی جو سکول میں پڑھاتے ہیں“ فیصل کی شکل سے پتا چل رہا تھا کہ وہ عابد نامی اس شخص کو اپنی یادداشت کے خانوں میں سے تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے بھی نیاز نے تفصیل سے عابد کے بارے میں بتایا۔

”یہ موبائل باہر سے ان کے سالے نے بھیجا ہے اس میں کوڈ لگ گیا تھا پچھلے ہفتے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنا مسئلہ بتایا۔ تو تو جانتا ہے میرا چھوٹا بھائی موبائلوں کے ٹھیک کرنے کا کام کرتا ہے تو اسی لیے انہوں نے یہ موبائل میرے حوالے کیا تھا، میرا چکر تو جانے کب لگے اب تو ادھر جا ہی رہا ہے تو میرے بھائی یاد سے ان کی امانت ان تک پہنچا دینا“ نیاز نے موبائل کی پوری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔

”یار ذرا دھیان سے لے جانا بڑا مہنگا موبائل ہے“ نیاز نے پھر تاکید کی۔

”چل تجھے اچھی سی چائے پلواتا ہوں“

”نہیں یا رکبھی“ فیصل نے انکار کرنا چاہا مگر نیاز کے محبت بھرے اصرار پر اسے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا چائے پینے کے دوران فیصل نے نیاز کو تفصیل سے اپنے حالات بتائے وہ کافی پہلے سے ایک دوسرے کو

باورچی خانے میں چلی گئی۔ ارم باپ کا اشارہ پا کر چپ چاپ چارپائی پر ٹیک گئی۔ آخری نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے برتن سائیز پر کھسکائے اب وہ پوری طرح ارم کی طرف متوجہ تھا۔

”دیکھ پتر میں نے ہمیشہ تیری ہر خواہش پوری کی ہے“ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے تمہید باندھی۔

”برادری میں لڑکیوں کو سکول بھیجنے کا کوئی رواج نہیں پھر بھی تیرا شوق دیکھتے ہوئے میں نے تجھے پانچ کلاسیں پڑھائیں“ اماں کے سامنے پتر پتر بولنے والی ارم باپ کے سامنے سرجھکائے بیٹھی تھی وہ بولنا چاہتی تھی مگر خاموش بیٹھی تھی اور تو اور اس کے آنسوؤں نے بھی نہ

بننے کی قسم کھالی تھی۔ باپ ایک کے بعد ایک احسان پہ احسان گنوائے جا رہا تھا اور ارم کا سر جھکتے جھکتے گھٹنوں سے جا لگا تھا اور پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے ارم کو چپ لگ گئی۔ اگلے دن شام کو چاچا چاچی مٹھائی لے کر آئے اور قاسم کے نام کی انگوٹھی ارم کی انگلی میں ڈال گئے۔

☆.....☆.....☆

”ہاں بھئی بات یہ ہے کہ ابھی تو مجھے کسی بندے کی ضرورت نہیں جب ضرورت ہوگی تو تجھے بلوالوں کا“ ٹھیکیدار بے نیازی سے کہتے ہوئے موبائل پر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا گویا اس نے فیصل کو جانے کا اشارہ دے دیا وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا کمرے سے باہر آیا وہیں اسے نیاز مل گیا۔

”کیا ہوا کام نہیں بنا؟“ فیصل کے چہرے پر پھیلے مایوسی سے تاثرات سے وہ بنا کہے ہی سب سمجھ گیا۔

”اچھا فکر نہ کر میں آج پھر بات کر کے دیکھتا ہوں ٹھیکیدار سے“ نیاز نے فیصل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو جواب میں وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

”چل تجھے اچھی سی چائے پلواتا ہوں“

”نہیں یا رکبھی“ فیصل نے انکار کرنا چاہا مگر نیاز کے محبت بھرے اصرار پر اسے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا چائے پینے کے دوران فیصل نے نیاز کو تفصیل سے اپنے حالات بتائے وہ کافی پہلے سے ایک دوسرے کو

www.paksociety.com

میں فیصل کی خوشیاں، خواب اور زندگی سب کے سب لہجوں میں بکھر گئے۔ آمنہ اپنی بات کہہ کر فیصل کے چہرے کو تکیے جا رہی تھی جہاں ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ آمنہ کتنی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ بالکل خاموش تھا آخر وہ ساس کی آواز پر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ فیصل الجھے ہوئے ذہن اور بے جان ہوتے جسم کے ساتھ پورا دن کمرے میں پڑا رہا یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ آمنہ گئی بار اس کے پاس آئی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بس ”ہوں، ہاں“ میں ہی جواب دیتا رہا حتیٰ کہ منیر کی آمد پر بھی وہ اس سے ملنے باہر نہیں نکلا بلکہ سوتا بن گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ اسے کوئی راستہ بھائی نہ دے رہا تھا جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کی خوشیاں واپس پاسکتا۔

”کیا بات ہے تیرا بھائی کل سے دکھائی نہیں دے رہا“ اگلی صبح آمنہ کی ساس ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے طنزیہ لہجے میں پوچھ رہی تھی پھر آمنہ کے جواب کا انتظار کیے بنا ٹوکری اٹھائے سبزی لانے کے لیے گھر سے نکل گئی۔ آمنہ آنسو بہاتے ہوئے گھر کے کام سمیٹتی رہی۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھلے منیر کے گھر آنے کا وقت ہوا تو فیصل جان بوجھ کر گھر سے نکل آیا۔ وہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا وہ سر جھکائے ست قدموں سے بے مقصد چلا جا رہا تھا بھی اسے کسی نے پکارا۔

”سنو بیٹا“ اسے لگا کہ شاید اس سے غلطی ہوئی ہے اس کا یہاں کسی سے ایسا ملنا جلنا نہیں تھا بلکہ وہ تو کسی کو ٹھیک سے جانتا تک نہ تھا پھر بھلا اسے کوئی کیوں پکارتا وہ یہی سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا تب دوبارہ آواز آئی۔

”رکو بیٹا میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں“ اس بار فیصل رُک گیا اور مڑ کر پکارنے والے کی طرف دیکھنے لگا وہ شاید نہیں بلکہ یقیناً فیصل کے لیے اجنبی تھا درویش دکنے والا وہ شخص عمر میں پچاس سے اوپر کا لگ رہا تھا نورانی باریش چہرہ لبوں پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ فیصل آنکھوں میں الجھن اور حیرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ درویش نے چند قدموں میں اپنے اور فیصل کے بیچ کا راستہ پار کر لیا اور عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تو فکر نہ کر میں آج ہی عابد صاحب کو ان کی امانت یہ حفاظت پہنچا دوں گا“ فیصل نے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”یار یہ کچھ پیسے رکھ لے کام آئیں گے“ فیصل کے انکار کرنے کے باوجود چلتے وقت نیاز نے کچھ پیسے فیصل کی جیب میں ڈال دیے۔

نیاز کو خدا حافظ کہتا وہ بس شاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے جیب سے پیسے نکال کر دیکھے پورے دو ہزار روپے تھے نیاز کی محبت اور خیال اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی لے آیا وہ سر جھٹک کر بس میں سوار ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

فیصل چار دن کا گھر سے نکلا ہوا تھا کام کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا کبھی کسی دوست کی طرف تو کبھی کسی جاننے والے کے پاس۔ آج چار دن بعد جب وہ آمنہ کے گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ ان چار دنوں میں وہ جانے کتنے گھنٹے پیدل چلا تھا اور سب سے بڑھ کر ناکامی کی تھکن اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی وہ اپنی سوچوں میں اتنا کم تھا کہ اسے آمنہ کی غیر معمولی خاموشی کا احساس بھی نہیں ہوا، کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ آمنہ آکر اس کے پاس بیٹھی اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے، آرام کرنے کی شدید خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہوا آمنہ سب خیریت تو ہے نا؟“ آمنہ کو خاموش دیکھ کر وہ خود ہی پوچھنے لگا۔

”ہاں بھائی سب خیریت ہے“ اتنا کہہ کر وہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

”بہت جلد مجھے کام مل جائے گا بس ایک دو دن اور پھر میں اپنے رہنے کا ٹھکانا بھی کر لوں گا“ آمنہ کی خاموشی سے اسے یہی بات سمجھ میں آئی کہ آمنہ کی ساس اور شوہر کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔

”نا بھائی ایسی بات نہیں وہ اصل میں مجھے یہ بتانا تھا کہ۔۔۔ وہ ارم ہے نا اس کی منگنی ہو گئی ہے اپنے چاچا کے بیٹے سے“ آمنہ نے جیسے دھماکہ کیا اور اس دھماکے

”آپ۔۔“ فیصل پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس نے فیصل کو کیوں روکا ہے لیکن بزرگ نے اس کی بات اچک لی اور مسکراتے ہوئے پُر شفقت لہجے میں کہنے لگا۔

”بیٹا تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں اور تمہاری پریشانیوں کو بہت اچھے سے جانتا ہوں بس یوں سمجھو کہ میں بس تمہارے لیے ہی یہاں آیا ہوں“ بزرگ کا انداز گفتگو بڑا متاثر کن تھا، ”بڑے بڑے حالات میں ہوتے آج کل، مالی مسائل بھی اور زندگی کی پریشانیاں بھی، بہت مشکل میں ہو“ بزرگ نے گہری نگاہوں سے فیصل کی بڑھی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور اسے ہلکے ہلکے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ۔۔ آپ کو کیسے پتا چلا یہ سب؟“ فیصل کا حیران ہونا قطری تھا اگرچہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی بھی انسان اس کے حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

”میں نے کہا تمہارے لیے ہی آیا ہوں“ بزرگ نے مسکراتے ہوئے اپنی بات دہرائی فیصل نے بے ساختہ بزرگ کے ہاتھ تھام لیے اور التجائی لہجے میں کہنے لگا۔

”بابا جی آپ اللہ والے ہیں سب جانتے ہیں آپ میری مدد کریں مجھ پر مہربانی کریں میں بہت مشکل میں ہوں آپ تو اللہ والے ہیں اللہ آپ کی بات ضرور سنے گا میرے حق میں دعا کریں“ اس کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا ایک کام کرو اپنی

آنکھیں بند کرو اور دو منٹ تک خاموشی سے کھڑے رہو

اس کے بعد گن کر سو قدم چلو، جہاں سو قدم پورے ہوں

گے وہاں ایک کریانے کی دکان ہے وہاں سے اگر بتیاں

خریدو اور واپس یہاں آؤ میں یہیں تمہارا انتظار کروں

گا چلو اب آنکھیں بند کرو“ بزرگ کی بات ختم ہوتے ہی

بنا کوئی سوال کیے فیصل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اس

کے بعد اس نے بھی آنکھیں کھولیں جب بزرگ نے

اسے آنکھیں کھولنے کے لیے کہا ”بیچھے مڑ کر مت

دیکھنا“ بزرگ نے مزید ہدایت دی فیصل نے اثبات

میں گردن ہلائی اور قدم گنتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر

دیا سو قدم پورے ہوئے اور وہ کریانے کی دکان پر پہنچ

گیا اگر بتیاں لینے میں اسے پانچ منٹ سے زیادہ لگ گئے کیونکہ دکان پر اس سے پہلے ہی دو گاہک موجود تھے فیصل نے بڑی بے چینی سے وہ وقت گزارا اور اگر بتیاں خریدنے کے بعد فیصل جس طرح قدم گنتا وہاں پہنچا تھا اسی طرح واپس اس جگہ پہنچا جہاں وہ بزرگ کو کھڑا چھوڑ آیا تھا لیکن اب بزرگ کا دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا فیصل بے چینی سے آگے بڑھا اور کافی دیر تک مختلف گلیوں میں بزرگ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بزرگ وہاں سے ایسے غائب تھا جیسے کبھی وہاں تھا ہی نہیں، آخر اس تلاش سے مایوس ہو کر گھر کی طرف چل پڑا، وہ بہت الجھن میں تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کا ساتھ کیا ہوا، فیصل گھر میں داخل ہوا تو اس کا بھانجی بھاگتی ہوئی آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

”ماموں جی چیز دلائیں“ وہ لاڈ سے بولی تو فیصل

نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا اور اسے گود میں

لیے لیے اٹنے قدموں گھر سے باہر نکل آیا، محلے کی دکان

پر پہنچ کر اس نے سامنے کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب

خالی پا کر اسے خیال آیا اس جیب میں جتنے پیسے تھے ان

کی وہ اگر بتیاں خرید چکا تھا جی اسے نیاز کے دیے

پیسوں کا خیال آیا تو اس نے سائڈ کی جیب سے پیسے

نکلانے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس کی جیب خالی

تھی اس نے پریشانی سے دوسری جیب بھی کنگال ڈالی مگر

پیسے ہی نہیں اس کا اپنا اور نیاز کا دیا گیا موبائل بھی اس کی

جیب سے غائب تھا جبکہ اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ

گھر سے نکلا تھا تو اس نے اپنی جیبیں اچھی طرح چیک کی

تھیں پیسے اور موبائل جیب میں موجود تھے اس کے بعد وہ

صرف بزرگ کے پاس ہی رکا تھا ”اوہ تو یعنی وہ

بزرگ۔۔۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا وہ بات کی تہہ

تک پہنچ چکا تھا مایوسی کی انتہا پر پہنچا ہوا فیصل فراڈیہ بزرگ

کے لیے بہت ہی آسان شکار ثابت ہوا تھا، فیصل کو اپنی

غلطی کا احساس ہو رہا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ اپنے پیسے

اور موبائل کے ساتھ ساتھ نیاز کی امانت بھی کھو چکا

تھا۔ کمزوری اور پریشانی سے اسے زور کا چکر آیا اور وہ سر

پکڑ کر وہیں بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆.....☆☆

موتی آئی لویو

حنا بشری

ایک جانور کی بے مثال محبت اور وفاداری سے جڑی بہت خاص کتا

دبانے کو چاہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو پہر تک بادل خوب گرجے اور پھر بر سے ہر طرف جل کھل سی ہو گئی تھی۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں تقریباً بھیگ چکی تھی۔ جلدی جلدی کرتے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ چھٹی کے وقت رضا بھائی نے آنا تھا مگر آج اُن کی ضروری مینٹنگ تھی۔ سو مجھے خود ہی آنا تھا۔

جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی تو سکون کا سانس لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں گھر میں داخل ہوتی گھر کے باہر ایک کتا بیٹھا ہوا نظر آیا جو سر سے پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے اُس پر بہت رحم آیا۔ وہ چھوٹا سا سفید کتا مجھے مظلوم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندر سے گرم دودھ لاکر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ جسے وہ فوراً پینے لگ گیا۔ نجانے بے چارہ کب سے بھوکا تھا۔ میں نے اُس پر رحم بھری نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا بارش رُک چکی تھی۔ میں اندر آ گئی۔

”امی یہ دین والا بہت بد تمیز ہے۔ فضول میں دیکھ کر ہنستا رہتا ہے چھچھورا کہیں کا۔“ میں نے بیگ رکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”عائشہ بیٹا جلدی آ جاؤ دین والا کب سے کھڑا ہے۔“ امی کی آواز پر میں نے جلدی جلدی دوپٹہ سر پر ڈالا اور بیگ پکڑ کر باہر آ گئی۔

”بیٹا کیا کرتی ہو؟ وقت پراٹھا کرو۔“ امی نے مجھے دیکھتے ہوئے ہدایت کی۔

”جی امی کوشش کروں گی آئندہ شکایت نہ ہو۔“ میں شرمندگی سے بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

”عائشہ!“ امی کی لپکار پر میں نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

”بیٹا بادل چھائے ہوئے ہیں موسم کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔“ امی نے آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھے دیکھا۔

”امی آج میرا بہت ضروری ٹیسٹ ہے آج چھٹی نہیں کی جا سکتی۔ اچھا امی اللہ حافظ۔“ میں نے وجہ بتاتے ہوئے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

دین والے نے مجھے دیکھتے ہی اپنے دانتوں کی نمائش کرنی ضروری سمجھی تھی۔ میں جل تبھن کروین میں بیٹھ گئی۔ دین والے نے بے ہودہ پنجابی گانے کی آواز مزید تیز کر لی تھی۔ میرا دل اُس کی گردن

چھائی ہوئی تھی۔ وین گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ گھر قریب آچکا تھا میں اُس پر لعنت بھیج کر وین سے اتر گئی۔ گھر کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ وین والا میرے راستے میں حائل ہو گیا۔

”رشید بھائی میرے راستے سے ہٹ جائیں۔“ میں اُس کی حرکت پر حیران ہوتے ہوئے پھنکاری۔ ”بھئی اتنی جلدی کس بات کی ہے کبھی ہم پر بھی غور کر لیا کرو عائشہ!“ رشید بھائی نے بے لطفی سے مجھے پکارا۔

میں انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگی تھی کہ وین والے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری مزاحمت پر بھی وہ بضد تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھاتی کہ نجانے کہاں سے ایک کتا وین والے پر حملہ آور ہو گیا۔ میں تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ وین والے کے تو چھکے چھوٹ گئے تھے۔ جلدی سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا وہ وین میں سوار ہو گیا۔ اس سیریس پھوٹیشن میں بھی مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ کتا اُس وقت تک

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ امی نے حیرت سے پوچھا۔ ”امی مجھے دیکھ کر گانوں کی آواز تیز کر دیتا ہے۔ بلاوجہ تنگ کرتا ہے جتنا اُسے دیکھ کر چڑنی ہوں اتنا ہی وہ فری ہونے کی کوشش کرتا ہے۔“ میں ابھی بھی غصے میں تھی۔

”اچھا شام کو تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں کہ یہ وین والا ہٹا دیں۔“ امی نے تشویش بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وین سے ایک ایک کر کے تمام لڑکیاں اتر چکی تھیں۔ میں اکیلی بیٹھی تھی اور گھر آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا میں گانے کی آواز پر چونک اٹھی تھی۔ وین والے کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر خباثت



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح میرے ارد گرد دم ہلانے لگا۔
 ”لو بھئی عا کشہ تمہارا پاؤں گارڈ تم تک خود ہی
 پہنچ گیا۔“ رضا بھائی محفوظ ہوتے ہوئے بولے۔
 ”ٹھیک ہے آج سے اس کا نام موتی ہے میرا
 محافظ!“ میں نے موتی کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 امی ابو اور رضا بھائی میرا اور موتی کا پیار دیکھ کر
 مسکرا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

پھر اُس دن کے بعد سے موتی ہمارے گھر کا فرد
 بن گیا تھا۔ وین والے کاگلی میں گھسنا بالکل بند تھا۔
 جہاں کہیں بھی اُس پر نظر پڑ جاتی موتی بھونکنے شروع
 کر دیتا تھا۔ وین والا بھی شاید موتی کے رعب میں
 آچکا تھا۔ میرے گھر کے قریب سے گزرتا چھوڑ دیا
 تھا۔ موتی نے میرے ساتھ کالج جانا شروع کر دیا
 تھا۔ اُس کی موجودگی کے باعث میں کافی سکون
 محسوس کرتی تھی۔ موتی کے آنے سے میری زندگی
 بہت آسان ہو گئی تھی۔ میں نے اس بے زبان معصوم
 جانور کے بے لوث جذبات کی دل سے مشکور تھی۔
 میں ابھی کالج سے لوٹی تھی کہ معلوم ہوا کہ بھائی
 کی آفس فائل گم ہو گئی ہے بہت ڈھونڈنے کے
 باوجود مل کے نہ دے رہی تھی۔ امی ابو بہت پریشان
 تھے۔ موتی نے ہماری باتوں سے جانے کیا اندازہ
 لگایا کہ گھر کے کونے کونے میں گھس گیا اور فائل تلاش
 کرنے لگا۔

”یار نہ تنگ کرو۔“ بھائی نے پلٹ کر موتی کو کہا
 جو جانے کیوں اُن کی قمیض کا کونہ کھینچ رہا تھا۔
 ”پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہا ہے۔“ میں مسلسل موتی
 کی طرف متوجہ تھی۔

”بیٹا سن لو دیکھ لو کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ جانوروں
 کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔“ ابو نے موتی کی پریشانی
 دیکھ کر کہا۔

رضا بھائی جو موتی سے چڑ رہے تھے۔ ابو کے
 سمجھانے پر موتی کے ساتھ چل پڑے۔ واپسی پر وہ
 گمشدہ فائل اُن کے ہاتھ میں تھی۔
 ابو سارا گھر چھان مارا تھا مگر فائل مل نہیں رہی تھی

بھونکتا رہا تھا۔ جب تک وین والاگلی سے باہر نہیں نکل
 چکا تھا۔ کتا اُس کے تعاقب میں گلی سے باہر جا چکا تھا
 اور میں ایک بڑی مصیبت سے بچ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

امی کو ساری بات بتانے کے بعد میں نے
 دروازہ کھول کر دیکھا تو کتا ابھی تک گھر کے باہر بیٹھا
 تھا۔ یوں جیسے چوکیداری پر مامور ہو۔ میں نے اندر
 سے دودھ کی پیالی لاکر اُس کے آگے رکھ دی۔ جسے
 وہ ذوق و شوق سے پینے لگا۔

شام کو امی نے تمام بات ابو اور بھائی کو بتا دی۔
 ”اُس خبیث کی یہ جرأت منہ توڑ دوں گا اُس
 کا!“ رضا بھائی سنتے ساتھ ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔
 ”بیٹا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب!“ ابو
 پریشانی سے بولے۔

”ابو میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“
 میں ابو اور بھائی کے رد عمل پر خوفزدہ ہو کر بولی۔
 ”پھر بھی بیٹا آئندہ محتاط رہنا خاموشی سے ایسے
 لوگ مزید شیر ہو جاتے ہیں۔“ ابو نے مجھے پریشان
 دیکھ کر نرمی سے سمجھایا۔

”جی ابو آئندہ دھیان رکھوں گی۔“ میں نے
 جواب دیا۔

”وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اُس کتے نے اُس خبیث
 پر حملہ کر دیا۔“ امی شکر گزار انداز میں بولیں۔
 ”ہاں بیٹا کبھی کبھی جانوروں میں انسان سے
 زیادہ وفا اور انسانیت محسوس ہوتی ہے۔ ابو دل گرفتگی
 سے بولے۔

”اچھا میں ذرا دیکھتا ہوں کہ وہ کتاب تک باہر
 موجود ہے یا نہیں۔“ رضا بھائی باہر کی جانب بڑھتے
 ہوئے بولے۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہی لپکی۔

رضا بھائی نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کتا جھٹ
 اندر آ گیا جیسے موقع کی تلاش میں تھا اور آتے ہی
 یوں لپکا کہ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو مجھ پر نظر پڑتے ہی
 وہ میری جانب تیزی سے بڑھا اور پیروں میں لوٹ
 پوٹ ہونے لگا۔ شاید وہ احسان کا بدلہ لوٹا رہا تھا۔
 میں جھک کر اُسے پیار کرنے لگی۔ وہ کسی پالتو جانور کی

ایک بہت ضروری دوا بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں بہت پریشان تھی۔ ابو کی بگڑتی حالت مجھے مزید ہراساں کر رہی تھی۔ موتی ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا اور نا جانے کب سے ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ میری بے چینی اور ابو کی بگڑتی حالت پر وہ بھی ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔ میں دوائیوں کے نسخے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا کروں کہ اچانک سے ہی موتی نے میری میض پکڑ کر مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور پھر اُس رات موتی نے مجھ پر اور میرے گھر پر ایک اور احسان کیا تھا۔ ابو کو دوا لاکر دی۔ صبح ابو اٹھے تو ان کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ میں نے ساری بات انہیں بتائی تو انہوں نے موتی کو بہت پیار کیا تھا۔ میں جو رات کے وقت اکیلے جانے سے خوف زدہ تھی۔ موتی کی وجہ سے یہ کام بھی آسانی سے ہو گیا تھا۔ موتی کی موجودگی سے مجھے بہت حوصلہ ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

رضا بھائی جاگنگ کے لیے جا رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا انہوں نے مجھے آفر کی ساتھ جانے کی تو میں جھٹ تیار ہو گئی تھی۔ اور موتی اُس سے تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں تیار دیکھ کر وہ ہم سے پہلے چھلانگ مار کر باہر نکلا تھا۔ سارے راستے ہم موتی کی اچھل کود سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ موسم بے حد سرد تھا۔ وقفے وقفے سے دھوپ بھی نکل آتی تھی مگر سردی برقرار تھی۔ پارک میں بھی کافی گہما گہمی تھی۔ بھائی جاگنگ کرنے چلے گئے تھے اور میں موتی کے ساتھ ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔ قریب ہی ایک بے حد پیاری سی بچی بال سے کھیل رہی تھی۔ اُس کا بال بار بار میرے قریب آ جاتا تھا جسے میں مسکرا کر اُسے پکڑا دیتی تھی۔

موتی نرم نرم گھاس پر آرام فرما رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی پارک میں چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں میں اور بھائی وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہی چھوٹی سی بچی جو بال سے کھیل رہی تھی وہ جھیل میں گر گئی تھی۔ اپنا بال جھیل سے نکالنے کے باعث وہ خود بھی پانی میں گر چکی تھی۔ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ بچی

یہ موتی پتا نہیں کیا چیز ہے جو فائل تک پہنچ گیا مان گئے باس! رضا بھائی کے لہجے میں اطمینان کے علاوہ موتی کے لیے شکر یہ بھی تھا۔

اور موتی دودھ پینے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اُس کی بے نیازی دیکھ کر ہم سب ہنس پڑے۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کبریٰ خالہ کھڑی تھیں۔ ہماری پڑوسن.....

”آئیں خالہ اندر آ جائیں!“ میں نے انہیں سلام کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔ کبریٰ خالہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے عینک سے گھورا تھا۔

”بھئی عائشہ یہ کتا کیوں پال لیا ہے تم لوگوں نے!“ کبریٰ خالہ امی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”ارے آپا پالا کہاں ہے۔ اپنی عائشہ کا بہت خیال رکھتا ہے اس لیے گھر میں رکھ لیا ہے۔“ امی نے پیار سے موتی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے فضیلت مگر گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے یہ بھی تو سمجھا کرو۔“ کبریٰ خالہ نے ذہن لڑاتے ہوئے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔

”بالکل بجا فرمایا آپا مگر ہم نے اسے پالا نہیں ہے نہ ہی اسے پالنا ہمارے شوق میں آتا ہے۔ احسان کے بدلے میں بے چارہ بے زبان احسان کر رہا ہے۔“ امی وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

”جیسی تم لوگوں کی مرضی مگر دیکھنا کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے۔“ کبریٰ خالہ نے ایک تنقیدی نظر موتی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کریں آپا ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ امی نرمی سے بولیں۔ کبریٰ خالہ جاتے ہوئے مجھے اور موتی کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا نہیں بھولی تھیں۔

☆.....☆.....☆

امی کی کزن کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی لیے وہ رضا بھائی کے ساتھ شہر سے باہر گئے تھے۔ میں ابو کی طبیعت کی خرابی کی بناء پر ان کے ساتھ گھر رک گئی تھی۔ رات کو ابو کی طبیعت مزید بگڑ گئی تھی۔ ان کی

میں محبت بھرا اصرار تھا۔
میں پھر اُلجھ سی گئی امی نے دیکھا تو کہا۔
”تم چلی جاؤ تھوڑی دیر کی بات ہے تم جاؤ موتی
ابھی سو رہا ہے۔“

☆.....☆.....☆

سال گرہ کا فنکشن بہت اچھا رہا۔ ثانیہ خوب
چپک رہی تھی کہ اتنی دیر میں امی کا فون آ گیا۔
”عائشہ بیٹا کب تک پہنچ رہی ہو؟“ امی نے
پوچھا۔

”کیوں امی کیا ہوا خیریت؟“ میں نے فکر
مندى سے پوچھا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے وہ موتی جاگ گیا ہے اور
سارے گھر میں تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ کھانا دے
رہی ہوں کھانا نہیں کھا رہا۔“ امی نے وضاحت
کرتے ہوئے بتایا۔ جیسے ہی میں گھر آئی تو موتی پر
نظر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی لینا رہا تھا۔

”کیسا ہے میرا دوست؟“ میں نے اُسے
مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ موتی نے آنکھ کھول کر
دیکھا تھا اور پھر فوراً بند کر لی تھی۔ یعنی کہ ناراضگی
برقرار تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں گئی
تو پھر اس کی سزا ملنی چاہیے میں بھی کھانا نہیں کھاؤں
گی آج!“ میں نے موتی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
موتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا اور پھر کھانا
کھانے لگ گیا تھا۔ میں اور امی اس کی حرکت پر مسکرا
دے تھے۔

☆.....☆.....☆

رات کافی ہو چکی تھی۔ کبریٰ خالہ کے گھر سے
ڈھولک بجنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُن کی بیٹی کی
شادی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہی اُن کے گھر سے شور
شرابے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ چور چور کی
آوازیں آرہی تھیں۔

ابو اور بھائی فوراً باہر گئے تھے۔ موتی بھی اُن
کے پیچھے لپکا تھا۔
کبریٰ خالہ نے بہت محنت مشقت سے بیٹی کا

کی ماں کا رور و کر برا حال تھا۔ کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا
کہ بچی کو کیسے بچائے کہ اچانک موتی نے پانی میں
چھلانگ لگادی۔ شاید وہ جانور ہم سب سے زیادہ
سمجھدار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک منٹ ضائع کرنے کا
مطلب تھا کہ بچی کی جان جاسکتی تھی۔

موتی بچی کو اس کے فرائیڈ سے پکڑ کر کنارے
تک لے آیا تھا اور بھائی نے آگے بڑھ کر بچی کو باہر
نکالا تھا۔ بچی کی ماں نے اُسے سینے سے لگا لیا وہ ابھی
بھی زار و قطار رور رہی تھی۔ بچی کی ماں نے میرا اور
بھائی کا بہت شکریہ ادا کیا۔ حالانکہ شکر تو اُس پاک
ذات کا تھا جس نے موتی کے ذریعے بچی کی جان
بچائی۔ تمام لوگ موتی کی بہادری کی بے حد تعریف
کر رہے تھے۔ موتی پانی جھاڑ کر اپنا جسم بار بار خشک
کر رہا تھا۔ بھائی نے موتی کے سر پر ہتھی دی اور کہا۔
”موتی آج تو تم ہیرو دگے ہو۔“

☆.....☆.....☆

گھر آنے تک موتی کافی شست ہو گیا تھا۔
ہیئر کے سامنے بیٹھ گیا تھا اور بار بار سو جاتا تھا۔ شاید
گیلا ہونے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی تھی۔ بھائی
نے کھانا سامنے رکھا مگر موتی نے نظر اٹھا کر بھی نہ
دیکھا۔

”عائشہ مجھے لگتا ہے موتی کو سردی لگ گئی ہے
اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔“ رشا بھائی
نے موتی کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ بھائی موتی
کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔

اسی دوران میری دوست ثانیہ کا فون آ گیا اُس
کی کل سال گرہ تھی۔ بے حد اصرار کر رہی تھی کہ میں
ضرور آؤں مگر میں موتی کی وجہ سے فیصلہ نہیں
کر رہی تھی۔ بھائی گھر آئے تو بتایا کہ موتی کو سردی
لگ گئی تھی۔ انجکشن کے بعد اب وہ آرام سے سو رہا
تھا۔ میں نے سال گرہ میں جانے کا ارادہ ملتوی
کر دیا۔

صبح میں نے دیکھا تو موتی ابھی تک سو رہا تھا۔
اتنی دیر میں ثانیہ کا پھر فون آ گیا۔ عائشہ جب تک تم
نہیں آؤ گی میں یک نہیں کاٹوں گی۔“ ثانیہ کی آواز

امتحان سر پر تھے میں رات کو دیر تک پڑھتی تھی۔
چھت پر ہلکے سے شور کی آواز آئی تھی۔ جیسے کوئی چھت
پر چل رہا ہو۔ موتی بظاہر سو رہا تھا۔ مگر فوراً چونکا ہوا جاتا
تھا۔ اور بھونکنے لگ جاتا تھا اور پھر دوبارہ خاموشی
چھا جاتی تھی۔ موتی پابندی سے میرے ساتھ کالج جاتا
تھا۔ پیپر بہت اچھے ہوئے تھے۔ میں دن رات اپنی
کامیابی کے لیے دعا کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک رات موتی ایک دم اٹھ گیا تھا۔ مسلسل
بھونکتا جا رہا تھا۔ بار بار سیڑھیاں چڑھ کے چھت پر
جاتا تھا اور بھونکتا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی راتوں سے
جاری تھا۔ چھت پر جا کر ابو اور بھائی نے بھی دیکھا
مگر کوئی نہ تھا۔ مگر میرے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا کہ
موتی بلا وجہ نہیں بولتا اور وہ مسلسل بھونکتا رہتا تھا۔

بار بار چھت پر جانے کی وجہ سے بھائی نے موتی
کو زنجیر سے باندھ دیا تھا اور یہی رضا بھائی کی غلطی
تھی۔ ہم سب سو رہے تھے کہ موتی کے بھونکنے کی
آوازیں آنے لگیں۔ آج موتی بالکل خاموش نہیں
ہو رہا تھا۔ بڑھا ہونے کے باعث وہ بہت بے چین
تھا۔ اتنی دیر میں چھت پر شور کی آواز آئی۔ میں کچھ
دیر لیٹی رہی۔ شور کی آواز تیز ہونے لگی تھی۔ جیسے
چھت پر کوئی کودا ہو۔ موتی کے بھونکنے میں بھی شدت
آگئی تھی۔ میں جو خوفزدہ تھی۔ امی اور ابو بھائی بھی
اٹھ گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی ہماری آنکھیں خوفناک منظر دیکھ
رہی تھیں۔ ہمارے گھر میں چور گھس آئے تھے۔
”خبردار کوئی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی
تو!“ ایک چور نے پستول لہراتے ہوئے بات
ادھوری چھوڑی تھی۔

”گھر میں جو بھی کچھ ہے ہمارے حوالے
کر دو۔“ ایک دوسرا چور بولا تھا۔ موتی مسلسل بھونک
رہا تھا۔

میرے گلے میں سونے کی چین اور کانوں میں
سونے کی بالیاں تھیں۔ ایک چور مسکراتا ہوا قریب
آ گیا تھا۔ اُسے قریب آنا دیکھ کر خوف سے میرے

جھنجھار کیا تھا۔ نا جانے کیا ہو گیا تھا اچانک۔ میں
دل گرفتگی سے سوچ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ابو اور بھائی آگئے ان کے ساتھ
موتی بھی تھا۔ باہر اب خاموشی تھی۔ ابونے آتے ہی
بتایا کہ کبریٰ خالہ کے گھر چور آگئے تھے۔ سارا سامان
لوٹ کر لے جا رہے تھے کہ موتی پہنچ گیا۔ ایک چور
بھاگ کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا کہ موتی نے بھاگ کر
اُس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔ اُس نے بھاگنے کی بہت
کوشش کی مگر موتی نے اُس کی جان نہیں چھوڑی۔
اُس کا سامنے یہ صورتحال دیکھ کر بھاگ نکلا۔ اور وہ
آدی جس کی ٹانگ موتی نے پکڑی تھی اُسے محلے
والوں نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اگر موتی وہاں
بروقت نہ پہنچتا تو کبریٰ بے چاری کی ساری جمع پونجی
لٹ جاتی۔ ابو نے موتی کی جرأت مندی کی تعریف
کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح کبریٰ خالہ گھر آئیں۔ موتی کو دیکھ کر وہ
مسکرائے جا رہی تھیں۔ امی اور میرا بار بار شکر یہ ادا
کر رہی تھیں۔

”فضیلت اگر رات موتی نہ آتا تو وہ چور تو سب
کچھ لوٹ کر لے جاتے ہمارے لیے تو یہ خدا کی
رحمت بن کر آیا تھا۔“ کبریٰ خالہ گلوگیر لہجے میں
بولیں۔

”بس خالہ اللہ نے دنیا میں کوئی بھی شے بیکار
نہیں بنائی۔ یہ جانور اور پرندے تو بہانا ہیں انسان کی
حفاظت کا۔ اور بعض اوقات تو یہ بے زبان مخلوق وہ
کام کر جاتی ہے جو ہم انسان نہیں کر پاتے۔ اللہ کی یہ
مخلوق بے حد معصوم اور حساس ہوتی ہے۔“ میں نے
مسکراتے ہوئے خالہ کو تسلی دی۔

کبریٰ خالہ کے چہرے پر شرمندگی سی تھی۔ جو
انہوں نے اُس دن موتی کے بارے میں سخت الفاظ
کہے تھے۔

”میری بیٹی کی شادی میں ضرور آنا۔“ اور
جاتے وقت وہ موتی کے سر پر پیار کر کے گئی تھیں۔

☆☆☆

”بس بہت ہو گیا آرام شام کو ہمارا ٹائیکر گیٹ کے پاس ملے۔“

☆.....☆.....☆

میرا زلٹ نکل چکا تھا۔ سب گھر والے بہت خوش تھے۔ مجھے بہت اچھے سے کالج میں جاب مل گئی تھی۔ ابو نے گھر میں چھوٹی سی دعوت رکھی تھی۔ سب نے مجھے بہت اچھے سے تحائف دیے تھے۔ موتی کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ بھاگتا ہوا باغ میں گیا۔ اور منہ میں گلاب کا بڑا سا پھول دبائے۔ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ امی نے کہا۔

”لو عائشہ موتی بھی تمہارے پاس ہونے کا تحفہ لایا ہے۔“ موتی کو دیکھ کر سب گھر والے مسکرانے لگے۔

ابو نے کالج کے لیے ڈرائیور رکھوا دیا تھا۔ میں چھٹی کے وقت انتظار کر رہی تھی۔ گاڑی کی چھٹی سیٹ پر موتی بیٹھا ہوا تھا وہ شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میری موتی کو دیکھ کر ہنسی نکل گئی کہ ڈیوٹی کے معاملے میں ”نو کپرو دمانز“.....

☆.....☆.....☆

موتی کی بے مثال محبت کو دیکھ کر اکثر میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ معاشرے کا بے حد حقیر سا جانور ہم بے حس لوگوں کی خاطر اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتا اور ہم انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں۔ جو نارگٹ گلنگ کے ذریعے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ جہاں دہشت گردی کے ذریعے معصوم جانیں لے لی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ اسکول کے معصوم بچے لمبی ہمارے شر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انسانیت دن بدن اپنے مقام سے گرتی جا رہی ہے۔ کیا انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ مگر نہیں حیوان ہمیں اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا ہم انسان ایک دوسرے کو پہنچا رہے ہیں کاش ہم سمجھ جائیں۔ اور ہاں مجھے یہ کہنے میں اب کوئی عار نہیں کہ موتی آئی لویو۔

☆.....☆.....☆

منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اور کیسے ہو سکتا تھا کہ موتی کو میری آواز آتی اور وہ نہ آتا۔

موتی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ شاید اُس نے زنجیر توڑ دی تھی۔ موتی نے آتے ہی ایک چور کی ٹانگ پکڑ لی چور نے خوفزدہ ہو کر شیشے کا گلدان موتی کو دیے مارا۔ جس سے وہ زخمی ہو گیا مگر ٹانگ نہ چھوڑی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتا کہ میرے مالک مشکل میں ہوں اور میں مدد نہ کروں۔

”فائر مار فائر!“ ایک چور نے چلا کر دوسرے کو پکارا تھا۔ وہ موتی کو مارنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ رضا بھائی جو موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اُسے زور کا دھکا دیا تھا۔ چور گر تو گیا مگر گرتے گرتے گولی چلا دی جو موتی کو لگ گئی۔ گولی کی آواز پر ارد گرد کے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ چوروں کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ امی اور میرا رورور کرنا حال ہو گیا تھا ابو اور بھائی موتی کو اسپتال لے گئے تھے امی مجھے حوصلہ دے رہی تھیں۔

فجر کی اذان کی آواز آئی تو ہم نے وضو کر کے نماز پڑھی تو میری دعا صرف موتی کی زندگی کے لیے تھی۔ نماز کے دوران بھی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔ موتی کا خون میں لت پت جسم میری نظروں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔

”یا اللہ میرے دوست کو بچالے۔“ میرے لبوں سے یہ دعا نکلی تھی۔

کچھ دیر بعد ابو نے فون کیا تھا۔ میرے اندر سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مگر امی نے سنا ابو نے بتایا تھا کہ موتی بچ گیا ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گولی ٹانگ کو چھو کر گزری تھی۔ میں نے اللہ کے حضور سجدہ شکر کیا تھا۔

موتی کی ٹانگ پر پٹی بندھی تھی۔ میں دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے ایک دو بار دیکھا تھا اور پھر سو گیا۔ موتی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُس کا زخم بھر گیا تھا۔ ابو نے آفس جاتے ہوئے موتی کو کہا۔

گیارہویں سچ بیانی

گر بھلا سو ہو بھلا



ممتاز احمد

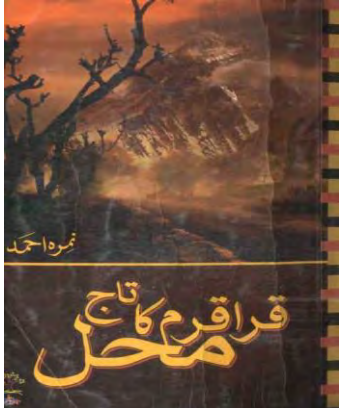
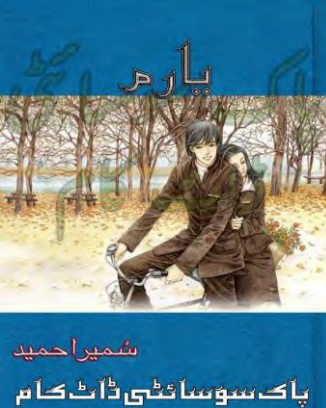
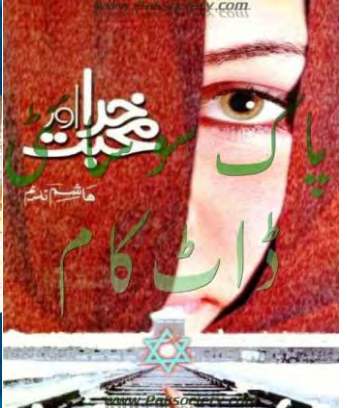
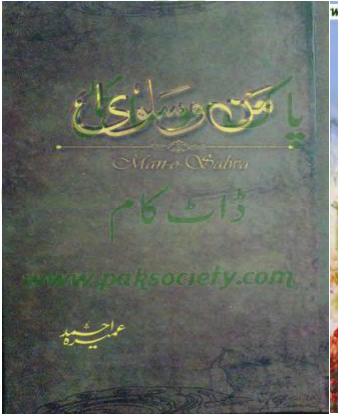
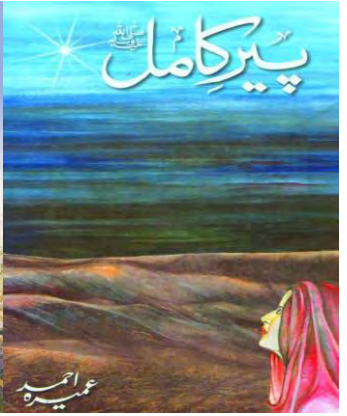
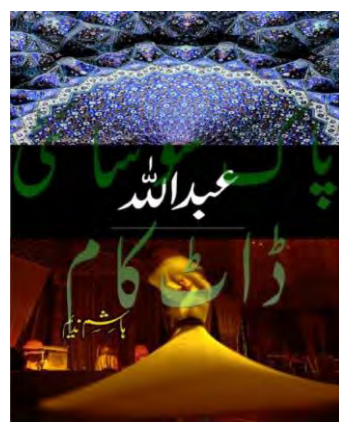
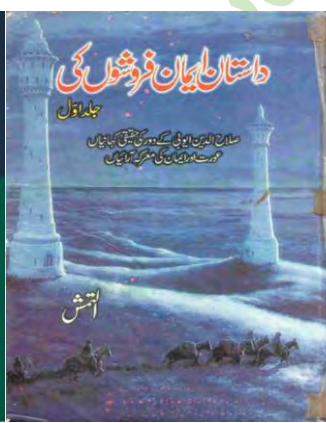
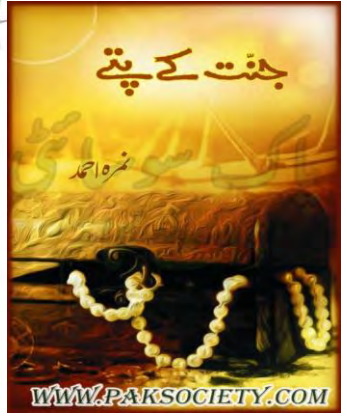
اُس شخص کا قصہ جس نے ہمیشہ خیر خواہی کو شعار بنایا

گاؤں کے ایک زمیندار کے مزارع تھے۔ وہ دن رات کھیتوں میں کام کرتے جس کے بدلے میں ہمیں سال بھر کے لیے گند مل جاتی اور کچھ روپے بھی جس سے گزر بسر ہو جاتی۔

ہماری رہائش ایک دور افتادہ انتہائی پسماندہ گاؤں میں تھی جہاں نہ بجلی تھی، نہ ٹیلی فون، نہ ہسپتال اور نہ ہی شہر سے ملانے والی کوئی سڑک۔ گاؤں میں بہت زیادہ غربت تھی۔ میرے والد ساتھ والے

Downloaded From
Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کے چپے لاکر اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے جسے وہ بڑی کفایت شعاری سے خرچ کر لیں اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچت بھی کر لیتیں۔ سال میں ایک بار بونس بھی مل جاتا تھا۔ قصہ کوتاہ گاؤں کی نسبت زندگی کا وہ دور بہت اچھا تھا اور وقت خوشگوار اور بھلا گزر رہا تھا۔

اس وقت میرے عمر 18 سال تھی میں نے کلاس 9th کا امتحان دیا تھا تو ایک رات ابا بھلے چنگے سوئے مگر صبح جب اپنے مقررہ وقت پر نہ جاگے انھیں اٹھانے کی کوشش کی گئی مگر پتا نہیں رات کے کس پہر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

اگلے دن عصر کے بعد انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مل کے ویلفیئر فنڈ سے ابا کے کفن و دفن کا انتظام کیا گیا۔ کچھ مالی مدد بھی کی گئی۔ اب مل کے قواعد و ضوابط کے مطابق کسی ورکر کی موت کے بعد اُس کے بیٹے یا بیٹی کو مل میں ملازمت مل سکتی تھی۔ تموڑی سوچ بچار کے بعد میں نے مل میں نوکری کے لیے اپلائی کر دیا۔ کیونکہ ابا تو اس دنیا میں رہے نہیں تھے آمدنی کا ذریعہ بند ہو گیا، دوسرا ہمیں مل کا نوادر بھی خالی کرنا پڑتا۔ اب میں جوانی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا تو اب ظاہر ہے زندگی کا پیہر چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی روزگار تو تلاش کرنا ہی تھا۔ سردست اسی مل میں نوکری کرنا ہی ہر لحاظ سے سود مند تھا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے مل میں نوکری کا پروانہ مل گیا۔

☆☆☆

شروع میں میرے ذمے یہ کام تھا آنے اور جانے والی گاڑیوں سے مال لوڈ، ان لوڈ کرنا تھا۔ مل بہت بڑی تھی اور یہاں پر کئی قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی تھیں تو سارا دن ٹرکوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ بیت گیا میری پڑھائی چھوٹ گئی۔ 9th کلاس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ اسی دوران میری ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہی۔ اسی فیکٹری (مل) سے بہت سی مصنوعات روزانہ دوسرے شہروں میں بذریعہ ٹرک بھیجی جاتی تھیں۔ جہاں ٹرک وغیرہ نہیں جاتے تھے تو وہاں بذریعہ مال گاڑی (ٹرین) کے ذریعے بھیجا جاتا۔ اب میری

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا غربت کے ماحول میں میری پرورش ہوئی۔ گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا۔ ساتھ والی گلی میں ایک استانی بھی رہا کرتی تھیں جن سے میں نے قرآن پاک ناظرہ پڑھا اور انھیں سے کچی پکی کا قاعدہ پڑھا اور سختی لکھنا سیکھی۔

جب میری عمر دس سال ہوئی تو ہوا کچھ یوں کہ جس زمیندار کے میرے والد مزارع تھے اس نے اپنی کچھ زمین بیچ دی اور کھیتی باڑی کے لیے ٹریکٹر، ٹرائی وغیرہ لے آیا سی طرح گندم کاٹنے اور گاھنے کے لیے ویٹ تھریشر جیسے زرعی آلات لے لیے جس کا نتیجہ یہ نکلا بہت سارے لوگ بے روزگار ہو گئے اور ان بے روزگار ہونے والوں میں میرے والد بھی تھے۔ کیونکہ وہ صرف مزدور تھے کوئی ٹیکنیکل کام نہ کر سکتے تھے۔ دراصل پہلے کھیتوں میں ہل بیلوں سے چلایا جاتا فصلوں کی کاشت کٹائی وغیرہ سب کام ہاتھ سے سرانجام دیے جاتے تھے۔ مگر اب یہی کام ٹریکٹر ہل اور دیگر زرعی آلات سے ہونے لگے ہیں۔ والد صاحب نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے شہر کا رخ کیا جہاں انھیں بھاگ دوڑ کے بعد ایک بہت بڑی فیکٹری (مل) میں مزدور کی نوکری مل گئی جہاں وہ آٹھ گھنٹے معمول کی ڈیوٹی سرانجام دینے کے علاوہ کچھ اور ٹائم بھی لگا لیتے۔ ابا مہینے بعد گھر آتے تھے اور ایک دو دن رہ کر پھر شہر چلے جاتے۔

کوئی سال ڈیڑھ سال کے بعد ابا کی نوکری مل میں پکی ہوئی اور ان کو مل کی کالونی میں ایک چھوٹا سا فیملی کوارٹر مل گیا تو وہ مجھے اور امی کو شہر لے کر آ گئے۔ مجھے ایک قریبی سرکاری اسکول میں داخل کروادیا۔ میں زندگی میں پہلی بار شہر آیا تھا۔ بڑی بڑی سڑکیں، گاڑیاں، اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا صنعتی شہر تھا۔ یہاں بجلی، گیس، ٹیلی فون وغیرہ ہر طرح کی سہولیات تھیں اور سچ یہ ہے کہ مجھے شہر بہت اچھا لگا تھا۔ میں اکثر دعا کرتا کہ اب ہمیں کبھی گاؤں واپس نہ جانا پڑے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ گاؤں کی نسبت یہاں آسودگی تھی۔ ابا اپنی تنخواہ اور اور ٹائم

شہروں میں تھے وہ اپنے تیسرے بھائی کے ساتھ یہاں اس شہر میں رہ رہی تھی۔ اس کی بھابی بہت ظالم عورت تھی وہ دن بھر اسے طعنے دیتی، گالیاں دیتی اور کوسنے دیتی رہتی اسے کھانے کو کچھ نہ دیتی تھی۔ اس کا بھائی جو رو کا غلام تھا۔ اس بے چاری کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ لڑکی نے اپنا نام نرگس بتایا تھا۔ نرگس ساتھ والے ایک قریبی شہر میں ایک پرائیویٹ ہسپتال میں معاون نرس کا کام کرتی تھی جس سے اسے اتنے پیسے مل جاتے وہ اپنی گزر بسر کر رہی تھی۔ مجموعی طور پر نرگس کی زندگی بہت کٹھن اور تکلیف دہ تھی۔ وہ بے چاری آنے والے اچھے دنوں کی آس میں زندگی گزار رہی تھی۔

سیانے کہتے ہیں ہمیشہ اپنے سے نیچے دیکھو تو انسان کے اندر شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوں گے اور نعمتوں کی قدر آئے گی۔ دوسروں کے دکھ تکلیف پریشانیاں دیکھ کر انسان کو اپنے حالات میں ہزار گنا خوشحالی آسودگی اور سکھ نظر آتے ہیں۔ میں اکثر اپنے حالات خاص طور پر گاؤں میں گزری غربت کی زندگی کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا تھا۔ مگر جب نرگس کو دیکھا تو مجھے اپنی زندگی اس سے بہت بہتر اور اچھی لگی۔ گوکہ نرگس خوب صورت لڑکی نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر بلا کی مصیبت اور سادگی تھی۔ مجھے اُس سے دلی ہمدردی تھی۔ میرے دل میں اکثر خیال آتا تھا کہ کاش میرے پاس اتنی دولت ہو جس سے میں نرگس کی مالی مدد کر سکوں۔ امی جان کی طبیعت اب تھوڑی تھوڑی خراب رہنے لگی تھی ان کو جوڑوں کا درد لاحق ہو گیا تھا۔ اب وہ صحیح طرح سے گھر کا کام بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے ارد گرد کے گھروں میں نظر رکھے ہوئے تھیں مگر ابھی تک انھیں میرے جوڑ کی کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ جو تین چار لڑکیاں پسند آئیں ان کے والدین نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم ان کی نظر میں بھوکے ننگے لوگ تھے۔

ڈیوٹی ادھر لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے ایک مال گاڑی نکلتی تھی تو میں روزانہ سامان کے کارٹن ایک مزدامنی ٹرک میں لوڈ کروا کے ریلوے اسٹیشن لے آتا اور مال گاڑی میں بک کروا کر رسید لے کر واپس مل چلا جاتا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو کہ خوب صورت نہیں تھی سا نولاریک معمولی نین نقش درمیانہ قد اور تھوڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ اس کے لباس اور جسمانی خدوخال اس کی غربت کی عکاسی کرتے نظر آتے تھے۔ وہ روزانہ ریلوے اسٹیشن پر نظر آتی تھی اور دوسرے پلیٹ فارم جہاں سے ایک پنجر ٹرین چلتی تھی وہاں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ میں اُسے سرسری طور پر چند لمحوں کے لیے دیکھتا پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ مجھے دیکھتی یا نہیں دیکھتی اس بات کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ایک دن ریلوے اسٹیشن سے باہر میں کارٹن اتر دار ہا تھا تو دیکھا کہ وہ لڑکی لنگڑاتی ہوئی آرہی تھی تین چار لفٹکے منچلے اس پر آوازیں کس رہے تھے کوئی اُسے لنگڑی بندریا، کوئی لنگڑی معذور کے القابات سے نوازا رہے تھے۔ وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ مجھ سے یہ دیکھ کر برداشت نہ ہوا تو اپنے ساتھ تین چار مزدوروں کو لے کر میں نے اُن لفٹکے منچلوں کو ڈانٹا اور خوب برا بھلا کہنے کے ساتھ دارنگ دی کہ اب اگر اس لڑکی کو چھیڑا یا یہاں نظر آئے تو پھر تمہاری بڑی پسلیوں کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی۔ اس سے اگلے لمحے وہ فوراً رنو چکر ہو گئے۔ لڑکی نے تنہا انہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور اسٹیشن چلی گئی۔ چونکہ اسی ٹائم پر میں بھی سامان کے ساتھ روزانہ آتا تھا تو اب وہ لفٹکے منچلے نظر نہیں آتے تھے۔ اب کبھی کبھار ہماری بات چیت بھی ہو جاتی کئی دفعہ اس کی گاڑی لیٹ ہوتی تو میں دس پندرہ منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھ جاتا۔

اس سے تفصیلی تعارف ہونے پر معلوم ہوا وہ بہت ہی مظلوم لڑکی تھی۔ اس کی ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس کے تینوں بھائی شادی شدہ تھے دو بھائی تو دوسرے

اپنا گھر اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔ اللہ نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی صورت میں اولاد سے نوازا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا بچے بڑے ہونے لگے۔ انھیں سرکاری اسکولوں میں داخل کروادیا گیا۔ میری ڈیوٹی مختلف شعبوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ میری اور نرگس کی خدمت گزاری کی وجہ سے امی جان ہم دونوں سے بہت خوش تھیں وہ ہماری سلامتی، صحت، خوشحالی اور خیر و برکت کے لیے ہر وقت اللہ کی بارگاہ میں دعا گو رہتیں۔ وہ سارا دن اپنے پوتے نبیل اور پوتیوں شائلہ اور نائلہ کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ گھر میں ہر طرح سے سکون تھا۔

☆☆☆

مل مالکان کی تعداد تین تھی۔ سیٹھ حارث، سیٹھ عبداللہ اور سیٹھ فضل کریم یہ تینوں سیٹھ صاحبان مل کے برابر کے شراکت دار تھے۔ مل کا رقبہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ مل کے رہائشی ایریا میں تینوں سیٹھوں کی بہت بڑی بڑی اور عالیشان کوشیاں بنی ہوئی تھیں جہاں وہ اپنی اپنی فیملیز کے ہمراہ رہائش پذیر تھے۔ مل کے جس شعبہ میں میں کام کرتا تھا وہ براہ راست سیٹھ فضل کریم کی نگرانی میں آتا تھا۔

سیٹھ فضل کریم ایک با اصول اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ سیٹھ صاحب نے اپنی بیٹی کا رشتہ اپنی ہم پلہ فیملی سیٹھ روشن کے بیٹے فیضان سے طے کیا اور آنے والے جمعہ کو منگنی کی تقریب ہونا تھی۔ سیٹھ صاحب منگنی کی تقریب کو یادگار بنانا چاہتے تھے کیونکہ ان کی اولاد میں سب سے بڑی بیٹی کی منگنی تھی اور پہلا خوشی کا فنکشن تھا۔ وسیع پیمانے پر تیاریاں کی جا رہی تھیں انواع و اقسام کے پکوان تیار کرنے کے لیے ماہر کارگروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کھلے میدان میں شامیانے ٹینٹ لگائے جا رہے تھے۔ تقریب کے انتظامات کے سلسلہ میں کام کاج کے لیے سیٹھ فضل کریم نے اپنے شعبے کے چیدہ چیدہ ملازمین کو بلایا ہوا تھا اور ان میں بھی

ایک رات میں لیٹا ہوا تھا نیند نہیں آرہی تھی۔ نرگس کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے آ رہا تھا۔ یکلخت میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا کہ اگر میرے پاس دولت نہیں ہے جس سے میں نرگس کی مالی مدد کر سکوں کوئی ضروری تو نہیں کہ خوشیاں صرف دولت سے ہی ملتی ہیں۔ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں مگر سے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا۔ میں نرگس کو اپنا کر عزت دے کر اس کی عذاب بھری زندگی سے نجات دلا کر خوشی اور سکھ تو دے سکتا تھا اور میرے اس عمل سے اللہ مجھ سے کتنا خوش اور راضی ہوتا..... گویا میں نے نرگس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے دن میں نے نرگس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتے خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

آنے والے دنوں میں تمام معاملات خوش اسلوبی سے سرانجام پا گئے اور انتہائی سادگی سے نکاح ہوا اور نرگس میری دلہن بن کر آ گئی۔

نرگس کے چہرے سے ہر دم خوشی پھوٹی تھی اسے لگتا تھا جیسے اُسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہو۔ میں نے نرگس کی ہسپتال والی نوکری چھڑا دی تھی۔ نرگس نے شادی کے دوسرے دن سے ہی گھر سنبھال لیا۔ وہ امی جان کی دل سے خدمت کرتی اور بدلے میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ پیار وصول کرتی۔ میرا بھی ہر طرح سے خیال رکھتی۔ وہ بہت ہی اچھی بیوی ثابت ہوئی اس نے گھر کو چھوٹی سی جنت بنا دیا۔

نرگس اکثر و بیشتر میرے ذہن میں یہ بات ڈالتی رہتی کہ اپنا گھر ہونا چاہیے۔ بے شک چھوٹا سا ہو مگر ہونا اپنا۔ بقول اس کے جب تک مل کی نوکری ہے تو یہ کووارٹر بھی ہے اگر خوانخواستہ نوکری ختم ہو جائے تو یہ کووارٹر بھی ہم سے چھین جائے گا۔ بات تو اس کی ہر لحاظ سے درست اور حقیقت پر مبنی تھی۔ اب میں نے معمول کی ڈیوٹی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اوور ٹائم بھی لگانا شروع کر دیا۔ نرگس بائی بائی جوڑ رہی تھی۔

فیضان کا ذکر آیا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نا محسوس انداز سے ان کے بالکل اور قریب ہو کر بیٹھ گیا اور بظاہر لاطعلق سا ہو کر اخبار کا ورق گردانی کے ساتھ سگریٹ نوشی کرتا رہا اور بڑے دھیان توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان بندوں کی گفتگو سے سنی گئی باتوں کا نچوڑ اور خلاصہ یہ تھا۔ بظاہر تو سیٹھ روشن اور اس کے بیٹے فیضان کا اپورٹ ایکپورٹ کا بزنس تھا مگر اس کی آڑ میں بہت سارے غیر قانونی دھندے ہوتے تھے۔ فیضان ایک عیاش اور شراب، جو اور عورت کا رسیا تھا۔ اس نے پہلے ایک شادی کی سال بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اس کے بعد اس نے ایک خفیہ شادی کر رکھی تھی اور اب تیسری شادی کے لیے سیٹھ فضل کریم کی بیٹی سے منگنی کر وائی تھی۔ فیضان کی نظر سیٹھ فضل کریم کی دولت پر تھی۔ جو دو آدمی یہ باتیں کر رہے تھے ان میں ایک خاص فیضان کا بندہ تھا جو اس کے سارے کروت جانتا تھا۔ دراصل وہ بندہ بھی کسی خاص چکر میں تھا اور فیضان سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مختلف خفیہ ذرائع سے کھوج لگایا تو ان تمام باتوں کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ ان کے علاوہ بھی کئی معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کے مطابق فیضان بہت غلط انسان تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے بعد اپنے کام نمٹا کر واپس مل میں آ گیا اور دو تین دن فیضان کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے سوچوں میں کم دیکھ کر نرگس نے پوچھا کہ خیر تو ہے آج کل کس سوچ میں رہتے ہو۔ تو میں نے نرگس کو شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتا دی۔ بالآخر صلاح مشورے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ ساری صورت حال سیٹھ فضل کریم کو بتا دینی چاہیے۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس روز کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔ اس روز میں بازار گیا تو وہاں ایک بہت بڑے شانگ سینٹر میں بیگم صاحبہ نظر آ گئیں تو میں نے آگے بڑھ کر انھیں

شامل تھا۔ ہم سب ملازمین بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے کہ سیٹھ صاحب کو کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع نہ ملے۔

جمعہ کے روز وقت مقررہ پر مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ لڑکے والے بھی آ گئے۔ سیٹھ صاحب کی بیٹی بہت ہی خوب صورت، معصوم اور حور لگ رہی تھی جبکہ اس کا منگیترا شکل سے ہی انتہائی عیار، تیز طرار اور مکار نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا نہیں لگا تھا اس کے برعکس سیٹھ صاحب کی بیٹی پری لگ رہی تھی۔

خیر منگنی کی تمام رسومات کی ادائیگی کے بعد تمام مہمانوں کو پُرکلف کھانا کھلایا گیا۔ اس روز میں نے پہلی دفعہ سیٹھ صاحب کی بیگم صاحبہ کو دیکھا تھا۔

ہم تمام ملازمین پوری رات کام میں مصروف رہے۔ بہر حال یہ تقریب بہت شان دار رہی اور تمام معاملات بخیر و خوبی سرانجام پائے۔

کوئی ایک ماہ بعد سیٹھ فضل کریم صاحب نے میری ڈیوٹی مل کے سیز آفس کے ساتھ لگا دی۔ اب میں اُس کے ساتھ مختلف شہروں میں جانے لگا۔ اسی روٹین میں تین چار ماہ گزر گئے۔

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے شہر میں جانا ہوا یہاں کام زیادہ تھا تو تین چار دن یہاں رکنا تھا۔ سیٹھ روشن کا بزنس بھی اسی شہر میں تھا۔ سیٹھ روشن کا بہت بڑا اپورٹ ایکپورٹ کا بزنس تھا۔ وہ فرم کے چیئرمین تھے۔ جبکہ ان کا بیٹا فیضان (جس کی منگنی سیٹھ فضل کریم کی بیٹی سے ہوئی تھی) فرم کا منیجنگ ڈائریکٹر (ایم ڈی) تھا۔ میرا مختلف فرمز میں آنا جانا ہوتا رہا۔ اگلے دن ایک فرم میں گیا تو وہاں چار پانچ گھنٹے کا کام تھا۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی تو میں آفس سے اٹھ کر بلڈنگ سے باہر آیا کار، موٹر سائیکل پارکنگ کے ساتھ ایک کیفے ٹیریا تھا تو میں وہاں ایک سائیز پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ وہاں ایک جانب میرے قریب ہی دو بندے بیٹھے آپس میں محو گفتگو تھے جب ان کی باتوں میں سیٹھ روشن اور

نظر آتا ہے۔ کہیں بیٹیاں تو سب کی ساجھی ہوتی ہیں۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر میں یہ سب باتیں آپ کو نہ بتاتا اور خدا نخواستہ آپ کی بیٹی کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں سب سے بڑا مجرم گردانا جاتا اور اپنے ضمیر کی عدالت میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔

میری یہ باتیں سن کر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں انہوں نے بطور خاص ہمارا شکر یہ ادا کیا اور تاکید کی کہ ان باتوں کا کسی کے آگے تذکرہ نہیں کرنا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی منگنی فیضان سے ختم کر دی ہے۔ انہوں نے ہمیں بڑی عزت سے رخصت کیا۔

دو دن بعد سیٹھ فضل کریم نے مجھے اپنے دفتر میں بلا یا وہ میری نیک نیتی میری خیر خواہی اور نمک حلائی پر بہت خوش تھے اور میرا شکر یہ ادا کیا تو میں نے مؤدب ہو کر کہا۔

جناب سیٹھ صاحب بات یہ ہے کہ اپنے مالک کی خیر خواہی کرنا شریعت کا حکم ہے اور میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اللہ کریم آپ کو آپ کی پوری فیملی اور اس مل کو سلامت رکھے۔ تو میری اس بات پر وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے فی الفور مجھے ایک انتہائی اہم شعبے کا سپروائزر انچارج بنا دیا۔ میری تنخواہ ڈبل کر دی اور کالونی میں مکان بھی بڑا اور اچھا دے دیا۔ اس کے علاوہ ایک فرنیچر، ایئر کنڈیشنر اور کچھ گھریلو سامان بھی دیا۔ ان کی اس مہربانی پر میں نے رب کا شکر ادا کیا اور پہلے سے زیادہ تہنیدی محنت، لگن، خلوص اور وفاداری سے کام کرنے لگا۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا اسی دوران نرگس نے اپنی کفایت شعاری اور بچت سے، کمپیاں ڈال کر اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک نئی کالونی میں پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا۔ مل کی طرف سے بلا سود قرضہ فراہمی کی سہولت تھی تو مجھے آسانی سے قرضہ مل گیا اور مکان کی تعمیر شروع کر دی۔ اللہ نے کرم کیا اور دو سال کے عرصہ میں مکان تعمیر ہو گیا۔ اپنا مکان بننے کی نرگس کو بہت زیادہ خوشی تھی وہ ہر دم اللہ کا شکر ادا کرتی اور

سلام کیا اور تعارف کروایا کہ میں آپ کی مل میں کام کرنے والا ایک ورکر ہوں اور ایک بہت ضروری اور خاص بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں تو انہوں نے کہا شام کو اپنی بیوی کے ہمراہ گھٹی آ جانا چنانچہ شام کو مقررہ وقت پر میں نرگس کو ساتھ لے کر گھٹی پہنچ گیا۔ ہمیں گھٹی کے لان میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ آگئیں اور کہنے لگیں اب بتاؤ کیا بات ہے؟

تو میں نے ان کو ساری بات بتادی جس پر وہ کہنے لگیں کہ وہ کسے یقین کر لیں کہ سچ بتا رہا ہوں تو میں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے پوری تسلی کرنے کے بعد یہ بات آپ کے گوش گزار کی ہے۔

تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ اپنے طور پر ان باتوں کی تحقیق اور چھان بین کروائیں گی اگر یہ بات غلط ثابت ہوئیں تو وہ میری کھال اتروادیں گی۔ تو میں نے کہا بیگم صاحبہ اگر فیضان کے بارے میں یہ باتیں غلط ثابت ہوئیں تو آپ جو سزا دیں گی مجھے وہ قبول ہوگی۔

☆☆☆

کوئی مہینہ ڈیڑھ گزرا تو بیگم صاحبہ نے اپنا ایک ملازم بھیج کر ہمیں گھٹی بلوایا۔ وہ ہمیں پر تپاک طریقے سے ملیں۔ انہوں نے ہمیں بڑی عزت سے بٹھایا اور کہنے لگیں کہ جو باتیں تم نے بتائی تھیں وہ سچ ثابت ہوئی ہیں۔ وہ ہماری بہت ممنون اور شکر گزار تھیں۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بہت سراہا اور پھر پوچھنے لگیں کہ میں نے یہ اتنا بڑا رسک کیوں لیا اور کس مقصد کے تحت فیضان کے متعلقہ معلومات پہنچائی ہیں؟ تو میں نے نہایت احترام سے کہا کہ بیگم صاحبہ بات یہ ہے کہ میرے والد نے بارہ سال آپ کی مل میں ملازمت کی۔ ان کی وفات کے بعد مجھے نوکری ملی، مفت کا گھر ملا ہوا ہے، ہم عرصہ دراز سے آپ کا نمک کھا رہے ہیں تو اس حوالے سے اپنے مالکوں کی خیر خواہی اور نمک حلائی ہمارا فرض ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے مجھے دو بیٹیاں دی ہیں تو آپ کی بیٹی جو کہ بہت معصوم اور پیاری ہے اس میں مجھے اپنی بیٹیوں کا عکس

چڑھی تھی۔ وہ شامکے کی سہیلی بنی ہوئی تھی۔ گوکہ دونوں کی طبیعتیں اور مزاج متضاد تھا۔ کبھی دونوں میں لڑائی ہو جاتی پھر صلح ہو جاتی تو اس طرح ان کی دوستی چل رہی تھی۔ نرگس خوب صورت عورت نہیں تھی۔ بہت معمولی شکل و صورت کے ساتھ ایک ٹانگ میں پیدائشی نقص کی وجہ سے لنگڑا کر چلتی تھی مگر اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ایک نیک سیرت عورت ہے۔ میں بھی پیدائشی طور پر دیہاتی اور غربت میں پلا پڑھا تھا۔ میری شکل و صورت واجبی سی تھی کوئی بھی مجھے خوب صورت مرد نہیں کہہ سکتا تھا مگر اس کے برعکس ہمارے تینوں بچے انتہائی خوب صورت گورے چٹے تھے۔ مزید نرگس کی اچھی تربیت کی وجہ سے تمیز، ادب اور اچھے اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ نماز پڑھنا اور ادا کرنے کے ساتھ شریعت پر کار بند تھے۔

ایک دن یوں ہوا کہ ہمارے پڑوسیوں کے کسی رشتہ دار کا انتقال ہو گیا اور وہ وہاں چلے گئے اور ہمیں بتایا کہ عصر کے بعد تدفین ہوگی تو شام تک آ جائیں گے۔ یہ وہ دور تھا پی ٹی سی ایل ٹیلی فون کی سہولت چیدہ چیدہ لوگوں کو حاصل تھی۔ ہمارے پڑوسیوں کی بیٹی کے رشتہ کی کہیں دوسرے شہر میں بات چل رہی تھی تو دوپہر کے وقت وہ لوگ اپنی کار پر لڑکی دیکھنے آئے۔ مگر ہمارے پڑوسیوں کے گھر تالا لگا ہوا تھا تو آنے والے مہمانوں نے ہمارے گھر کی ڈور بیل بجائی تو نرگس نے دروازہ کھولا۔ وہ دو مرد اور تین خواتین تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہمسایوں کا پوچھا تو نرگس نے بتایا کہ وہ کسی فوننگی والے گھر میں گئے ہیں اور شام کو آئیں گے تو وہ کہنے لگے کہ بڑی دور سے آئے ہیں ان سے ملنا بہت ضروری ہے تو نرگس نے ہمسایوں کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے انہیں کہا کہ ان کے آنے تک آپ لوگ ہمارے گھر بیٹھ جائیں۔ وہ شام تک لازمی آ جائیں گے۔ چنانچہ دونوں مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور تینوں عورتیں بیڈ روم میں بیٹھ گئیں۔ میں بھی اپنا ڈپارٹمنٹل اسٹور بند کر کے آ گیا۔ نرگس نے فوراً شامکے، ناملے کے ساتھ

یقیناً میری ضعیف ماں کی دعائیں شامل تھیں۔ میں نے یہ مکان نرگس کے نام لکھوایا تھا۔ اسی دوران امی جان کا انتقال ہو گیا دوسرا یہ ہوا کہ مل مالکان کے آپس میں کچھ اختلافات ہو گئے۔ مزید حکومت کے ساتھ مالکان کی پیچیدگیاں اور قانونی معاملات ایسے ہو گئے کہ مل بند کر دی گئی اور تمام مشینری وغیرہ فروخت کر دی گئی اور تمام دفاتر، رہائشی کالونی اور مل کی زمین فروخت کر دی گئی اس طرح ایک ہزار روکر بے روزگار ہو گئے مگر تمام ورکرز کو معقول رقم دے کر کمپنیشن کی مد میں مالی معاونت کر دی گئی۔

مل بند ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بنی فضا یہ کا ہوائی اڈہ بالکل قریب تھا۔ وہ سارا علاقہ ریڈ زون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت نے مل کا وہ رقبہ پاک فضا یہ کے حوالے کر دیا جس سے ہوائی اڈہ کو وسعت دے دی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا اپنا گھر بن چکا تھا۔ ہم اپنے گھر میں شفٹ تو ہو گئے مگر بے روزگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بچوں کی پرورش کے ساتھ پیٹ کا دوزخ تو بھرنا تھا اس کا حل نرگس کے مشورے پر میں عیبہ نکالا ایک چھوٹے پیمانے پر کاروبار کا آغاز کیا جس کا لوٹی میں گھر بنایا تھا وہ نئی تھی اور وہاں کوئی جنرل اسٹور کر یا نہ کی کوئی دکان نہ تھی تو میں نے اللہ کا نام لے کر ایک دوکان کرایہ پر لی اور جو رقم مل کی طرف سے ملی تھی اس سے ایک جنرل اسٹور اور کر یا نہ شاپ بنالی۔ ایک سال کے اندر اندر کام چل نکلا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کالونی میں گھر بننے گئے آبادی بڑھ گئی اور تھوڑے عرصے میں تمام پلاٹوں پر مکانات تعمیر ہو گئے۔ میں نے بھی کام کو وسعت دی اور چھوٹے جنرل اسٹور کو بہت بڑے سپر اسٹور میں تبدیل کر دیا۔ دونوں بیٹیاں شامکے اور ناملے جو ان ہو چکی تھیں۔ شامکے سب سے بڑی تھی اس نے ایف اے کر لیا تھا، ناملے فرسٹ ایئر میں تھی جبکہ بیٹا نیل میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔

ہمارے پڑوس میں ایک ٹیلی رہتی تھی جن کے ساتھ ہمارے بہت اچھے مراسم تھے اور آنا جانا تھا ان کی ایک بیٹی جو ان تھی جو کہ تھوڑی مغرور اور تک

مل کر کھانا تیار کیا مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی۔ ان عزت احترام دیا جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ شام کو ہمارے پڑوسی آگئے تو وہ لوگ ہمارا شکریہ ادا کر کے ان کے ہاں چلے گئے۔ ان دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کی طرف آنا جانا رہا۔ ان کا رشتہ طے ہوا یا نہیں ہمیں معلوم نہ ہو سکا پھر اچانک ہمارے پڑوسی مکان بچ کر کہیں اور چلے گئے اور ان سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔

زگرس اب شامکہ کی شادی کے لیے فکر مند رہنے لگی اور مجھ پر زور ڈالنے لگی کہ اپنے ارد گرد نظر رکھیں اور شامکہ کا رشتہ تلاش کریں۔ میں اس کوشش میں لگا رہا مگر کوئی معقول رشتہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

دو یا تین ماہ گزرے اس روز جمعہ تھا۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور بند ہونے کی وجہ سے میں گھر میں تھا۔ تو اچانک ہی وہ لوگ آگئے جو چند ماہ پہلے ہمارے ہمسایوں کے ہاں آئے تھے خیر ہم نے انہیں گھر میں بٹھایا تو انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے جو کہ ایک سرکاری محکمے میں افسر تھا اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے سابقہ ہمسایوں کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے نہ ہو سکا تھا جس کی وجہ یہ تھی ایک تو ان کی بیٹی مغرور اور تک چڑھی تھی دوسری ان کی کچھ ایسی شرائط تھیں جو ان کو قبول نہیں تھیں۔ انہوں نے بہت سے گھر انوں میں رشتے دیکھے تھے مگر انہیں کوئی لڑکی مناسب نہ لگی تو انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ اور غور و خوض کیا۔ انہوں نے چند گھنٹے ہمارے گھر میں گزارے تھے تو انہیں ہمارے گھر کا ماحول، ہماری مہمان نوازی کے ساتھ شامکہ بہت پسند آئی تھی اور ان کے بیٹے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھی تو وہ شامکہ کے رشتے کے سوا بی بی بن کر آئے تھے۔

انہوں نے ہمیں سوچنے کا ٹائم دیا اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور چلے گئے۔

☆☆☆

ایک ہفتے کی سوچ بچار کے بعد ہم نے ان کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور انہیں بذریعہ ٹیلی فون

اطلاع دی کہ اگلے روز ہم آ رہے ہیں تو دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ان کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ ہم نے لڑکا دیکھا جو کہ بہت سلجھا ہوا شریف اور خوب صورت تھا۔ ہمیں پسند آیا۔ اگلے دو ماہ ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا اور پوری تسلی کرنے کے بعد ہم نے شامکہ کے رشتے کی ہاں کر دی۔ فوراً مگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ اللہ کے فضل و کرم سے شامکہ کی شادی بخیر و خوبی سرانجام پائی۔ وہ رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی گئی۔ شامکہ کا خاوند اور اس کے سسرال والے بہت اچھے ثابت ہوئے۔ شامکہ نے اپنے اچھے عادات و اطوار، خدمت گزاری، اچھے اخلاق سے سب کے دل جیت لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا سال بعد انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کے لیے شامکہ کا رشتہ مانگ لیا وہ بھی تعلیم مکمل کر کے بہت اچھے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ چنانچہ شامکہ کی شادی بھی کر دی۔

دونوں بیٹیاں صاحب اولاد ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔ نیپیل نے ایف اے کرنے کے بعد ڈپارٹمنٹل اسٹور سنبھال لیا ہے اور بڑی ذمہ داری سے کاروبار چلا رہا ہے۔ میں نے اور زگرس نے اللہ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے حج کی سعادت حاصل کر لی ہے۔

زگرس آج کل نیپیل کی دلہن اور اپنے لیے بہو تلاش کر رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنا گوہر مقصود حاصل کر لے گی۔ قارئین کرام! میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید یہ قدرت کی طرف سے مجھے بہت بڑا انعام ملا ہے۔ میں نے کسی کی بیٹی کے بارے میں اچھا سوچا، اچھا چاہا، نیک نیتی سے سیٹھ صاحب کی بیٹی کو برباد ہونے سے بچایا۔ اپنے مالکوں کی خیر خواہی بھلائی سوچی تو شاید یہ سب اسی کا صلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بھلا سو ہو بھلا..... تو قارئین کرام آپ

کیا کہتے ہیں اس بارے میں.....؟

☆☆☆

جزس

محمد بلال فیاض

صحرا کی اُس بے بسی کی داستان جہاں ہمیشہ پیاس بندے کھا جاتی ہے

جھونپڑی کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گرم لو
کے تھپڑوں نے اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔
یہ ایک چھوٹا سی جھونپڑی نما گھر تھا جس کی

گھر کے پیاسے صحرا میں سورج کسی ظالم و جاہل
حکمران کی طرح قہر برسا رہا تھا۔ صحرا کی پہلی
ریت، بھٹی کی طرح دہک رہی تھی۔ مسرت نے

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رنگت زرد بڑھتی تھی۔ زیادہ صحت مند تو وہ کبھی بھی نہیں رہی تھی مگر آج کل تو بالکل ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی زرد مٹیالی جلد ہڈیوں کے ساتھ چپک گئی تھی اور جسم پر گوشت ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتا تھا۔

یہاں فاطمہ ہی نہیں ہر دوسرے بچے کی حالت قریب قریب ایسی ہی تھی۔ گوٹھ کے بچوں کا رواں رواں پیاسا تھا۔ ننگے دھڑوالے بچوں کے لاغراور کمزور جسموں پر بس ہر طرف سے ہڈیاں ہی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں جو چیخ چیخ کر غربت اور غذائی قلت کی داستان سناتی تھیں۔ برسوں کے پیاسے چہروں پر صرف اس وقت مسکراہٹ دوڑتی جب بھی تھر پر ابر رحمت برستا تھا۔

☆☆☆

جون اپنے جو بن پر تھا۔ اور کڑا کے کی اس گرمی میں چند پرند کا مرنا ایک طرف، گرمی سے دن بدن انسانی ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کمرے میں اے سی کونگ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انھیں کچھ سی محسوس ہونے لگی۔ کندھوں پر طمطراق سے شال جما کر انھوں نے پاس کھڑے مہذب ملازم کی طرف دیکھا جو ان کی آنکھوں کی جنبش کی زبان بھی جانتا تھا۔ ملازم نے کسی رویوٹ کی طرح حرکت کی اور اے سی کی اسپیکر کم کر دی۔

’کمال! جو کہ ان کا میڈیا سیکر بیٹری تھا اجازت پا کر کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ باندھ کر بڑی فرمانبرداری سے سلام جھاڑا۔ جس کا جواب انھوں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے دیا۔

’ہاں بھئی کمال، کیا کہتا ہے میڈیا آج کل۔‘
ٹانگ کر ٹانگ جما کر انھوں نے دریافت کیا، لہجے میں رعب و دبدبہ نمایاں تھا۔

’وہی تھر میں ہونے والی ہلاکتوں کا رونا رو رہا ہے میڈیا ابھی تک۔‘

’تو بند کرو! میڈیا کا یہ رونا دھونا۔‘ حکم اور

دیواریں مٹی اور گارے کی تھیں۔ اور چھت بھوسے سے بنی ہوئی تھی، چھت کو سہارا دینے کے لیے کچھ چھوٹے بڑے بانس استعمال کیے گئے تھے، گھر کا دروازہ نہ کواڑ تھا۔ گھر کے بیرونی حصے میں ایک لاغری بکری بندھی ہوئی تھی جو ان کی کل کائنات تھی۔ مسرت اور اکرم کو یہ بکری اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی کیونکہ گھر کا گزر بسر اس بکری کے ہی مرہون منت تھا۔ خیر! پیٹ بھر کے تو انھوں نے سالوں سے ہی کچھ نہ کھایا تھا مگر یہ بکری سستی بلکتی زندگی کو دم توڑنے سے روکے ہوئے تھی۔

پچھلے سال ان کی تعداد دو تھی مگر وہ جگہ جہاں انسان بھوک اور پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے اس عفریت کا شکار ہو کر موت کے منہ میں حلے جاتے تھے وہاں بے زبان بکری کا مرجانا معمول کی بات تھی۔

’مسرت..... او مسرت۔‘ اندر داخل ہوتے ہی اکرم نے حسب عادت پکارا۔ مسرت سامنے ہی بیٹھی فاطمہ کو کھجور کے چوں سے بنے پکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ یہ پکھا اور اس جیسی کچھ اور چیزیں اس کے ہاتھوں کی محنت کا کمال تھا۔

’لے پکڑ۔ یہ رکھ لے۔ پانی پلا مجھ کو۔‘ اس نے ایک میلا سا رنگ اڑا تھیلا مسرت کی طرف بڑھایا جس میں چند سیرگندم کے دانے تھے۔ جو ان کے لیے سونا چاندی سے بڑھ کر تھے۔

اس نے تھیلا ایک طرف کسی متاع کی طرح سنبھال کر رکھا اور اپنی میلی چولی سے ہاتھ پونچھ کر پیالہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جس میں پانی دو گھونٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اکرم نے بڑے صبر و شکر سے پانی پیا اور پیالہ ایک طرف رکھ کر اپنی مقامی زبان میں بولا۔

’فاطمہ کا بخار کچھ کم ہوا؟‘

’نہیں..... ویسے ہی تپ رہی ہے۔‘ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ پانچ سالہ کمزور اور نحیف سی فاطمہ بخار سے چٹک رہی تھی۔ اس کی مٹیالی

کھاتے ہیں کھانا۔“

”فاطمہ کا بخار کم ہوا؟“ تمکا ہارا اکرم گھر آیا تو بیوی سے پہلا سوال یہی پوچھا مگر اس کے چہرے پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ ”منشر آ رہا ہے ہمارے گوشہ میں، دورے پر۔“ کھانے کے دوران اکرم نے بتایا تو تھر کے باقی لوگوں کی طرح مسرت کو بھی مدہوم سی امید ہوئی کہ شاید یہ حکمران ان درد کے ماروں کو کچھ داد ری کریں۔

”مجھے یہ نہیں کھانا بابا سائیں۔ یہ کھا کر میرے گلے میں تکلیف ہوتی ہے۔“ مول نے نمک ملی چکی سرخ مرچوں کی طرف دیکھ کر منہ بسورا۔

اکرم نے اس کا منہ کھول کر دیکھا اندر سے اس کا سارا گلا سفید چھالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا بلاشبہ اس نے خود بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزارنی تھی۔ مگر اپنی تکلیف اولاد کی تکلیف کے آگے بچ لگتی تھی۔

”او..... مسرت، ہماری بیٹیا رانی کو بکری کے دودھ کے ساتھ روٹی دو آج۔“ اس نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خوش ہو گئی مگر حسرت کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آدھا کٹورا دودھ اس نے بخار میں جلتی فاطمہ کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ چند ثانیوں تک وہ سوچتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو گھونٹ دودھ میں اس نے ایک گلاس پانی ڈالا اور مول کے آگے پیالہ رکھ دیا۔ وہ پھولی نہ سمائی۔ اس کے لیے یہ بڑی نعمت تھی۔ خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے دودھ کم پانی والے پیالے کی طرف دیکھا۔ اس کے بانی بہن بھائی پیالے کی طرف لپچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے جس میں موجود دودھ ملے پانی کے نیچے پیالے کا پیندا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

مول ان سب میں راج کمار بنی پیالے میں روٹی ڈبو ڈبو کر بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔

☆☆☆

حقارت سے انھوں نے کہا۔

”منشر صاحب یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔“ اس نے لہجے میں بے نیازی سمو کر کہا پھر توقف کے بعد بولا۔ ”مگر حضور، موقع اچھا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے مخالفین اپنی سیاست چکائیں کیوں نہ ہم ان پر بازی لے جائیں۔“ کمال کی اس بات پر انھوں نے بخور اس کی طرف دیکھا۔

”منشر صاحب! میڈیا نے تو وہی چلانا ہے ٹی وی پر جو آپ بولیں گے۔ یا پھر وہ جو ہر ہمارے مخالفین اٹھائیں گے اور تیسری صورت میں میڈیا وہی اپنا رونا دھونا جاری رکھے گا۔ جھٹلو والوں کو تو بس دو چیزوں کی فکر ہوتی ہے آمدن اور چینل کی ریٹنگ۔“

”ہوں۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ گھنی سیاہ مونچھوں کو تازہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔

”تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی سرکار۔ بس ایک تھر پار کر کا دورہ۔ اس کے بعد ہم جائیں اور میڈیا۔ آپ کو بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مخالفین کو تو سانپ سونگھ جائے گا اور میڈیا کا منہ بھی بند ہو جائے گا اور عوام کا کیا ہے وہ تو ویسے بھی کسی کھاتے میں نہیں..... وہ وہی دیکھتے اور سنتے ہیں جو میڈیا دکھاتا اور بتاتا ہے۔“ چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلا کر اس نے کہا اور پھر ان کو مزید بریف کرنے لگا۔

☆☆☆

سرخ مرچوں کو کوٹ کر اس نے اس نے ان میں نمک ملایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ دو روٹیاں جو گھر کے چھ افراد کے لیے تھیں کپڑے میں لپیٹ کر چنگیر میں رکھیں۔

”امی..... بھوک لگی ہے۔“ فاطمہ سے دو سال بڑی مول نے مقامی زبان میں کہا۔ بھوک سے آنتوں میں بڑنے والے بلوں کی تکلیف اس کے چہرے پر واضح دیکھی جاسکتی تھی۔

”بس بیٹی۔ تمہارے بابا سائیں آ جائیں تو

میں فریج نہیں ہے یا پھر فریج چھوٹا پڑ گیا ہے اور فیملی بڑھ گئی ہے۔ خوراک کو اچھے سے محفوظ کرنے کے لیے بڑا ڈیپ فریج لینا چاہیے۔ اور یہاں گوٹھ میں سرے سے خوراک ہی نہ رکھی تو محفوظ کرنے کی کیا فکر؟

بڑے شہروں میں لوگوں کو یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ کس موسم میں کون سا اور کس رنگ کا مشروب پینا چاہیے۔ اور یہاں سرے سے پانی ہی نہ تھا۔ وہاں لوگ لوڈ شیڈنگ کو کھوتے رہتے ہیں..... اور یہاں سرے سے بجلی ہی نہ تھی۔

اس نے سن رکھا تھا کہ شہری عورتیں ہمہ وقت سلائی اور کپڑوں کی بڑھتی قیمتوں پر ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہاں تو بوری اور تھیلے سے بھی تن ڈھانپ لیا جاتا تھا۔

اگر ماکثر بتاتا کہ اب شہر کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں رہے، ملازمت مشکل سے ملتی ہے۔ مگر یہاں گوٹھ میں تو ملازمت سرے سے ہی نہ تھی۔

”شہری لوگ واویلا مچائے رکھتے تھے کہ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے۔ مگر یہاں گوٹھ میں گزر بسر نام کی کوئی چیز نہ تھی زندگی صرف سسکتی اور بلکتی تھی۔

فرق تو ہے اور بہت فرق ہے بڑے شہر اور گوٹھ کی زندگی میں اب بھلا منسٹر صاحب کا کیا قصور کہ وہ ان کے مسائل سے نا آشنا تھے۔ انھوں نے کبھی زندگی کا ایک دن بھی تو اس گوٹھ میں نہیں گزرا تھا۔ اور شاید وہ گزار بھی نہ سکیں۔“ مسرت نے سوچا اپنا میلا گھاگرا سمیٹ کر اٹھی اور گھر چلی آئی۔ اگلے روز تمام چینلوں پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ نیوز اینکرز حلق پھاڑ رہے تھے۔

”منسٹر صاحب کا دورہ تھر پارکر“

”ہم اپنے لوگوں سے بے خبر نہیں ہیں۔“

”مسائل حل کریں گے۔“

”تھر کے باسیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔“

”کمالے۔ ٹو نے تو کمال کر دیا۔ ارے

”ہم جانتے ہیں۔ آپ لوگوں کے بہت مسائل ہیں۔“

منسٹر صاحب کی لاؤڈ اسپیکر سے آتی آواز سن کر اس نے سوچا شاید منسٹر صاحب بے خبر ہیں کہ اس گوٹھ کے لوگوں کے بہت مسائل نہیں ہیں بلکہ صرف مسائل ہیں۔

لوگ پر امید نظروں سے پیا سے چہرے لیے سن رہے تھے کہ شاید منسٹر صاحب کوئی مژدہ سنائیں۔

”ہم جانتے ہیں، تھر کا سب سے بڑا مسئلہ پانی اور خوراک ہے۔ یہاں صحت کی سہولیات کا بھی فقدان ہے۔“ شاید وہ یہاں ان کو انہی کے مسائل گنوانے آئے تھے۔ مسرت کو کوفت ہونے لگی۔ وہی رٹے رٹائے جملے، وہی باتیں، وہی یقین دہانیاں دہرائی جا رہی تھیں جنہیں وہ لوگ سن سن کر تھک گئے تھے۔

اتنے گوٹھ کے لوگ وہاں جمع نہیں تھے جتنے لوگ منسٹر صاحب کے ساتھ میڈیا کے آئے تھے۔ وہ پورے پروٹوکول کے ساتھ وہاں آئے تھے مگر گرمی کی شدت ان کی برداشت سے باہر تھی بولنے کے دوران وہ بار بار رک جاتے اور منہگے، ٹھنڈے منرل واٹر کی بوتل لبوں سے لگا لیتے۔

گوٹھ کے بچے جن کو چوبیس گھنٹوں میں چند گھونٹ ہی گدلا پانی نصیب ہوتا تھا وہ منسٹر صاحب کو کسی اور ہی سیارے کی ”مخلوق“ سمجھ رہے تھے۔ جو ہر دو منٹ بعد پانی پیتی تھی وہ بھی اتنا صاف شفاف۔

مسرت کو یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ محض کاغذ پر لکھے لفظ زبان سے ادا کر رہے ہیں حقیقتاً وہ بھوک، پیاس اور غربت جیسے مسائل سے نا آشنا تھے۔ اپنی بوسیدہ میلی اوڑھنی دانتوں میں دبا کر اپنی دانست میں اس نے سوچا۔ ”شہری لوگوں کے مسائل بھی تو اور ہوتے ہیں۔ بڑا فرق ہوتا ہے جی یہاں اور وہاں کے مسائل میں۔“

ان لوگوں کو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ گھر

پان ترقی کی منازل طے کر کے بی بی کے ہاتھوں سے پنواڑی کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بیبیاں بے شوہروں کو گھر سے نکلنے سے پہلے ایک عدد گلوری دینا نہ بھولتی تھیں۔ اس گلوری میں چوننا، کتھا، چھالیہ، سپاری تو کیا ان کی سلیقہ شعاری سب کچھ موجود ہوتی تھی۔ اللہ اللہ اب یہ زمانہ ہے کہ بیوی شوہر کو صرف ایک مسکراہٹ سے نوازی ہی ہے جو محبت سے عاری اور وفا شعاری سے مبرا ہوتی ہے۔

..... من انتخاب: نیکل جاوید۔ سرگودھا.....

دعا کے ساتھ دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے سائیں جی۔ اگر صرف دعا سے ہی شفا ملتی ہوتی تو دنیا میں طب کا شعبہ نہ ہوتا۔ اس نے فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا جس کا زردی مائل سیاہ چہرہ بخار کی شدت سے تہمتار ہا تھا۔

☆☆☆

خوش قسمتی سے کل اکرم کو آدھا گھڑا پانی مل گیا تھا۔ مگر آج سارا دن کی تلاش کے بعد بھی وہ ایک بوند پانی حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ ”پانی نہیں ملا؟“ مسرت نے برتن خالی دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کوشش کرتے تو.....“ مسرت کی بات کاٹ کر وہ تلخی سے بولا۔

”تمہارے خیال میں کیا میں نے کوشش نہیں کی ہوگی؟ بس ایک کسر رہ گئی تھی کہ لاغراوتوں کے پیٹ چیر کر پانی نکال لاتا۔“

مسرت اس کے لہجے کی تلخی کا زہر پی کر خاموش ہو گئی۔

”کل کا کچھ پانی بچا ہے؟“

صرف ایک پیالہ۔“ مسرت کے لہجے اور چہرے دونوں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ نام تو اس کا مسرت تھا مگر اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے

بھی جیسا نام ویسا کام۔“ انہوں نے ٹی دی سے نظریں ہٹا کر خوشی سے کہا وہ جب بہت موڈ میں ہوتے تو اسے کمال کی بجائے کمالے کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

”میں نے تو کوئی کمال نہیں کیا سرکار۔ اس کمال کا سہرا تو آپ کو جاتا ہے۔“ کمال نے عاجزی و انکساری کا مصنوعی لبادہ اوڑھ کر کہا۔ منشر صاحب کے تقاضے میں اور اضافہ ہو گیا۔

”کمالے! اس دفعہ تو تُو تخواہ کے علاوہ ایک بڑے انعام کا حق دار ہے۔“ معنی خیز انداز میں انہوں نے کہا تو کمال کی باچھیں کانوں تک پھیل گئی۔

☆☆☆

”انتا کم پانی؟“ مسرت نے گھڑے میں جھانک کر پریشانی سے کہا۔ یہ بھی بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ ذرا دیر ہو جاتی تو یہ پانی بھی اونٹوں کے پیٹ میں اتر جاتا۔“

”بچے کل سے پیاسے ہیں۔ خوراک کی کمی ایک طرف پانی نہ ہونے کی وجہ سے بکری کا دودھ بھی چند گھونٹ تک محدود ہو گیا ہے۔ اگر بارش نہ ہوئی تو مجھے ڈر ہے کہ دودھ سے تو جائیں گے ہی بکری سے بھی نہ ہاتھ دھو بیٹھیں ہم۔ پچھلے سال کی طرح۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”بارش کی دعا کرو اللہ کرم کرے۔“ اکرم نے تسلی دی۔

”اگر ہماری دعائیں قبول ہوتیں تو کیا ہم اس حال میں ہوتے؟“

”کفر نہ بکا کر تجھے پہلے بھی سمجھایا ہے۔“ غصے سے اس نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

فاطمہ کا بخار کم ہوا؟“

”نہیں۔“ فاطمہ کے لیے گدے سے پانی میں روٹی کے ٹکڑے بھگوتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔

”اللہ سائیں خیر کرے گا۔“ کہہ کر اس نے کچی دیوار سے ٹیک لگالی۔

گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے سوچا کہ اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ اکرم نے پیالہ اٹھایا، ایک لمحے کے لیے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر وہ دونوں ایک فیصلے پر پہنچ کر ایک دوسرے سے نظریں چرا گئے۔ ادھر بکری پانی پی کر شانت ہوئی تو ادھر پیاسی تپتی فاطمہ نے دم توڑ دیا۔

’’غم نہ کر مسرت۔‘‘ ہم کون سا بے اولاد ہیں۔ اللہ کے کرم سے ہماری دو بیٹیاں اور ہیں اور ایک بیٹا بھی تو ہے اور ان سب کے زندہ رہنے کے لیے بکری کا زندہ رہنا زیادہ ضروری تھا۔‘‘ اس وقت اس کا لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔ مسرت آنسوؤں بھری آنکھوں سے مگر مگر اسے دیکھتی گئی۔

☆☆☆

تھر کے صحرائیں بے نور صبح معمول کے مطابق اُتری تھی، فاطمہ کو رات ہی دفنایا گیا تھا۔ اکرم اور مسرت نے دیکھا، بکری کے تھن بھرے بھرے سے لگ رہے تھے اب کے بے تاثر چہرے پر اطمینان کے سائے لہرانے لگے۔ مسرت اندر سے دودھ کا برتن اٹھالائی اور بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی سوکھی زرد نیالی کلائی میں موجود سفید چوڑیاں جو کہنیوں تک بازو میں بھری ہوئی تھیں چھن چھن کرنے لگیں۔

اس نے ہاتھ روک کر گم صم کھڑے اکرم کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا کر باہر نکل گیا۔ مسرت نظریں جھکائے دودھ دوہنے لگی۔ اس کی چوڑیوں کی آواز نے بہت دور تک اکرم کی سماعتوں کا تعاقب کیا تھا۔ اور اُسے لگا تھا کہ جیسے اُس کی فاطمہ آواز جس کی طرح اُس کی چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ بڑی دیر سے مسکرا رہی ہے۔ مسرت کے آنسو پیالے میں مل کر دودھ کی کچھ بوندیں بڑھا گئے تھے۔

☆☆☆

اپنی چوبیس سالہ زندگی میں کوئی مسرت دیکھی ہو۔ ایک پیالہ پانی۔ چھ افراد اور ایک بکری۔ اکرم نے سوچا کہ چلو ہم ہم میاں بیوی اور تین بچے تو پیاس برداشت کر ہی لیں گے مگر مسئلہ فاطمہ اور بکری کا تھا۔ فاطمہ سخت بخار میں مبتلا تھی اور لاغر، ڈھانچہ بنی بکری کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی خستہ حال عمارت کی طرح کسی بھی وقت ڈھے سکتی تھی۔

شام سے رات ہو گئی تھی۔ مسرت بچوں کو بہلا پھلا کر سنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ فاطمہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ فاطمہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو تیزی سے واپس کھینچ لیا اس کا وجود تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ اکرم زمین پر پچھی کھجور کی چٹائی پر جت لینا گہری سوچ میں گم تھا۔

بکری کے حلق سے نکلنے والی عجیب و غریب آوازوں نے اس کے ارٹھکاڑ کو توڑا۔ اس نے اٹھ کر بکری کی طرف بغور دیکھا اور دوبارہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

’’اکرم..... اگر ب..... بکری کو کچھ ہو گیا..... ت..... تو ہم..... مسرت نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ لفظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ اکرم کوئی جواب دیتا اور بکری کے حلق سے دوبارہ وہی عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ اکرم نے پیاس سے نڈھال بکری کو دیکھا جس کے تھن صحرا کی طرح بخرتے تھے۔ ’’پانی دو۔‘‘ وہ اٹھ کر مسرت کے پاس آیا۔ ’’وہ پڑا ہے پیالہ۔‘‘ مسرت نے بتایا پھر اکرم کو پیالہ اٹھا تا دیکھ کر تڑپ کر بولی۔ ’’وہ میری فاطمہ کے لیے ہے۔‘‘

’’فاطمہ کی حالت بہت خراب ہے۔ بخار اس کی جان لینے کے درپہ ہے۔ یہ پانی فاطمہ کے لیے.....‘‘ اس کے لہجے میں دلدوز چیخوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔

اکرم نے گہری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ کر سہم

ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو

ایک تصویر، ایک کہانی



جنگل سے اترے۔۔۔ سنا تو ہوا

گھبرا نہیں کہیں اب مانتی ترک ہے۔ والد کے اد پر پڑھ لانا دیا جائے گا اس غریب کی
بھی بھی حالت ہو جاتی ہے۔ میں جتنی بھی مضبوط ہو کر صاحبان وہ بھی کلیجہ بند کر
لے آتی ہے۔ کسی پر اس کی برعاشقت سے زبان ظلم نہ کرو۔ درندہ زور نظر تصویر کی طرح
حال ہو جاتا ہے۔

دیکھو دیکھو ان گھوڑوں اور اس غریب ترک کا بھی کلیجہ بند کر رہا ہے۔

ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو۔

گوشت اور پوست اور لہو ہے جس

اب سنبھالو اسے اترے سنبھالو سنبھالو کہیں اس ترک کے بڑی وہ لنگل آئیں اور وہ
ترک وہاں لگا کر ہاتھ سے ہی وہ لنگل جائے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ناول
ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط: 05

انتقام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔
برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکہ آرا سلسلہ

میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں اور اس سے مجھے ہمیشہ فائدہ ہی ہوا ہے۔ سائریکا کے شہر ایراک
سٹی آکر میں نے کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔ مسٹر ہیٹنس کے جو ایک نفیس انسان تھے اور میرے بارے میں جان



Downloaded From
Paksociety.com

www.paksociety.com

Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر بہت خوش ہوئے تھے۔
”ہمارے خاص محکمے میں آپ کے نام کا ریڈ اشارہ قائل ہے۔ مسٹر ہیٹلس نے مجھے بتایا۔“

”ریڈ اشارہ سے کیا مراد ہے؟“
”انتہائی خاص بہت اہم شخصیت۔“

”اوہ..... شکر یہ!“

”تم اس قابل ہو بے بی، تمہاری عمر دیکھ کر مجھے اور حیرت ہوئی ہے۔ میں تمہیں کوئی عمر رسیدہ عورت سمجھا

تھا۔ خرائٹ اور بے حد تجربہ کار۔“

میں ہنس کر خاموش ہو گئی۔ پھر انہوں نے مجھے لیونسکی کی سیکریٹری ایلیسی سے ملایا۔ ”یہ انٹرنیشنل لچل نامی اخبار کی نمائندہ ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔“

”اوہ میں صحافیوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میری بڑی بہن نامور صحافی تھیں۔ وہ ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئیں۔“

ایلیسی نے بڑے اخلاق سے میرے تمام سوالات کے جواب دیئے۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز اس کی ایک ایک ادانوت کر رہی تھی۔ ویسے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ بے حد سنجیدہ اور پر وقار، مجھے وہ کافی اچھی لگی تھی۔ مجھے اس کا کردار ادا کرنا تھا اور اس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

غرض یہ کہ میں اس کا سارا خاکہ زمیں میں محفوظ کر کے وہاں سے اٹھی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی میں نے اس سے مسٹر ہیمر کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ اس کے انداز میں ہیمر لیونسکی کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔ اس مہم میں مجھے جو دو شخصیتیں ملی تھیں انہوں نے میرے ذہن پر بہت اچھا تاثر چھوڑا تھا۔

”مجھے بتائیے مس اینی پارک، میں اور کیا خدمت کروں۔“

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ مجھے ہیمر لیونسکی کی تازہ تصاویر درکار ہیں جس شکل میں وہ یہاں سے لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نام کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی۔“

”ہاں بالکل ساتھ اس میں آپ کے تمام کاغذات بھی آپ کو فراہم کر دوں گا۔“ ہیٹلس نے کہا۔
”اوکے ہیٹلس۔“ میں نے جواب دیا۔ ہیٹلس نے میری مطلوبہ اشیاء مجھے فراہم کر دیں اور اس کا شکریہ ادا کر کے میں نے اس سے کہا کہ اب میں اسے دوبارہ فون اس وقت کروں گی جب مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔

میرا کام تسلی بخش تھا۔ اپنی قیام گاہ میں آرام کرتے ہوئے میں نے اپنے اس نئے مشن کے بارے میں سوچا اور کچھ لچکوں کے لیے مجھے خود پر غصہ آ گیا۔ میں ایک پر اعتماد شخصیت کی مالک تھی لیکن رہ رہ کر نہ جانے کیوں وہ منحوس وجود یاد آ جاتا تھا جس کا نام الہ دین تھا۔ شریذ غصہ یوں بھی آتا تھا کہ کہینے نے نہ تو مجھے اپنا اصل نام بتایا تھا نہ اصل صورت دکھائی تھی۔

اس وقت بھی وہ ذہن کے درپچوں میں گھس آیا اور میں نے اسے مار مار کر بھگا یا پھر سو گئی لیکن بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ اتنی بے عزتی کے باوجود میرے خوابوں میں آیا اور مجھ پر گھس کر سو گیا۔ دوسری صبح طبیعت بوجھل تھی لیکن ایک عمدہ غسل کے بعد کیفیت بحال ہو گئی۔ مجھے اپنا آخری کام سرانجام دے کر واپس جانا تھا۔ چنانچہ تیار ہو کر میں روانہ ہو گئی۔ مطلوبہ پتے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھی چنانچہ میں وہاں پہنچ گئی۔

ڈاکٹر ہیمر لیونسکی کا مکان زیادہ بڑا نہیں لیکن بہت خوب صورت تھا۔ لان خوب سرسبز تھا اس کے درمیان سے ایک پختہ روشن پورٹیکو تک جانی تھی۔

ٹیکسی سے اترتے ہی میری چھٹی حس بتانے لگی کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں آگے بڑھ کر داخلی دروازے سے پاس پہنچی اور ٹھنٹی بجا دی۔ دروازہ کھلتے ہی بالکل دیر نہیں لگی جیسے وہ دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ میرے چہرے کو دیکھ کر اس کے انداز میں خشکی پھیل گئی۔

”جی فرمائیے۔“ اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”میرا نام ایلکسی گومر ہے اور میں سر ڈاکٹر ہیر لیونسکی کی سیکریٹری ہوں۔“

”جی آگے فرمائیے۔“ اس نے بدتہذیبی سے کہا۔

”مجھے آپ سے کچھ بتائیں کرنی ہیں۔“

”کیسی باتیں۔“ اس نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ پوچھا۔

”دراصل سر لیونسکی بے حد مہربان انسان تھے۔ انہوں نے شاید ہی زندگی میں کسی کا دل دکھایا ہو۔

میرے ساتھ ان کا سلوک بے حد مہربانی کا تھا۔ مجھے حیرت ہے وہ اس طرح کیسے چلے گئے۔

”میں اتنے لوگوں کو ان فضول سوالات کے جواب دے چکی ہوں کہ اب ان سے بری طرح اکتا گئی

ہوں۔ آپ براہ کرم.....“

یوں لگا جیسے وہ دروازہ بند کر کے چلی جائے گی۔ میں نے پھرتی سے اپنا پاؤں دروازے میں اڑا دیا اور

بولی۔ ”میں ذاتی طور پر ان کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہوں کیونکہ میں ان کا بے حد احترام کرتی ہوں۔

آپ پلیز مجھے اندر آنے دیں۔

اسے کسی قدر شرمندگی کا احساس ہوا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ”میں جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اس نے ہلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران میں نے عقب سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کسی قدر پست قامت

تھی۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی جسم سڈول اور دلکش تھا۔ آنکھیں بے پناہ خوب صورت تھیں۔

وہ دروازہ بند کر کے پٹی اور پھر مجھے ڈائمنگ روم میں لے گئی جو جدید فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس نے مجھے

بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

”اس بارے میں میرے اتنے کان کھائے گئے ہیں کہ میں بری طرح بیزار ہو گئی ہوں۔ میرے پاس

بتانے کے لیے اب کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”یقیناً ایسا ہو گا لیکن بتائیں کیوں میرے دل میں ایک خلش ہے۔“

”خلش..... مگر کیسی؟“ وہ بولی۔

”بس مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی سے سخت ناراض ہو گئے ہوں۔ اتنے ناراض کہ انہوں نے ملک چھوڑنے کا

فیصلہ کر لیا ہے۔ اس ناراضگی کے بارے میں وہ کسی اور کو بتاتے یا نہ بتاتے لیکن اپنی چہیتی بیوی رور بتاتے

کیونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔

”ارے واہ، یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ میری اس چالاکی نے اس کے موڈ میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر دی

تھی۔

”میں ان کی سیکریٹری تھی میڈم۔“

”تو پھر؟“

”معاف کیجیے گا۔ اتنی حسین بیوی سے جدا ہونے کا تصور بھی موت جیسا ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود کبھی

کبھی کچھ تلخیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ دنوں میں کسی بنیاد پر آپ کے درمیان کوئی جھڑنا تو نہیں ہوا تھا۔“ میں

نے کہا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”مطلب یہ کہ جس طرح کبھی کبھی میاں بیوی کے درمیان.....“
”کیا تمہارے خیال میں تمہارا یہ سوال اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں ہے؟“
”میں ان کی سیکریٹری ہوں۔ حکومت نے آپ سے بھی ان کے بارے میں سوالات کیے ہوں گے۔ مجھ سے بھی کیے جا رہے ہیں۔ صرف اس بنیاد پر میں یہ سوالات کر رہی ہوں۔“

”نہیں، میرا ایسا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“
”اگر ڈاکٹر ہیر نے واپس نہ آنے کا فیصلہ کیا تو کیا آپ اور بچہ ان کے پاس چلے جائیں گے۔“
میرا یہ سوال شاید مسز ہیر کے لیے زیادہ سنگین تھا اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے اس سے سرد لہجے میں کہا۔

”نہیں میں اپنے وطن کی وفادار ہوں اور اس بارے میں قطعی ہیر کا ساتھ نہیں دوں گی۔“

”پھر آپ کیا کریں گی؟“

”سیدھی سی بات ہے۔“

”کیا؟“

”میں ان سے طلاق لے لوں گی۔“

”اس طرح آپ کی زندگی آسانی سے گزر جائے گی؟“

”مشکلات پڑتی ہیں تو ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔“

”اوکے، بے حد شکر یہ۔ اگر میرے کسی سوال سے آپ کی دل شکنی ہوئی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دس گیارہ سال کا لڑکا اندر کھس آیا۔

”مم..... اس نے اتنا کہا اور مجھے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”یہ..... وہ..... مس ایلیسی ہیں۔“ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبراسی گئی ہے۔

”مس ایلیسی۔“ لڑکا بولا۔

”تمہارے ڈیڈی کی سیکریٹری اور ان کے بارے میں کچھ معلومات کرنے آئی ہیں۔ سمجھے یہ تمہارے ڈیڈی کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔“.....؟..... دوبارہ کہنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کرے اس کے کہ وہ لڑکے کو کچھ سمجھانا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیا۔

”سمجھ گیا۔“ لڑکے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی ریگ آئی تھیں۔

”ہیلو مائی سن، تم تو بہت پیارے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا۔“

”روجر لیونسکی۔“ اس نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

”سوری سرورجر، میں بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئی تھی تم اور تمہاری مٹی میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے، کیا نام مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہارے ڈیڈی اچانک کیوں چلے گئے؟“

”میرے ڈیڈی کسی کام سے گئے ہیں۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے کہا جیسے وہ کوئی سبق دہرا رہا ہو۔

”وہ تم سے بہت پیار کرتے تھے۔“

”ہاں۔“

”اوکے سرورجر، تم جاؤ۔ پریسلا لیونسکی نے کہا۔ لیکن میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

”ایک بات بتاؤ بیٹے، اپنے ڈیڈی کے لیے تم کوئی پیغام دینا چاہتے۔ میں ان کے پاس ہانگ کا ٹک جا رہی ہوں۔“

میرا اندازہ خاطر خواہ نکلا۔ دونوں کچھ لمحوں کے لیے ہونق ہو گئے تھے۔ لڑکے کے بجائے اس کی ماں نے کہا۔ ”نہیں کوئی پیغام نہیں ہے۔ او کے خدا حافظ۔ چلو رو جرم پہنچ کر لو۔“ پریسلانے کہا۔ بعد میں واپسی کے لیے مزگنی۔ ٹیکسی میں واپسی کا سفر کرتے ہوئے میں اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی جو ان دونوں ماں بیٹوں کے رویے سے میرے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

☆.....☆

ہانگ کانگ میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ ایئر پورٹ سے نکل کر میں نے سیدھا بندرگاہ کا رخ کیا۔ سڑکوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لوگوں کا انداز بھی وہی تھا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے سڑکیں گیلی تھیں شاید بارش کچھ دیر پہلے ہی ہوئی تھی۔ جہازوں پر کام کرنے والے گروپوں میں گھوم رہے تھے ان میں زیادہ غیر ملکی تھی۔ یورپین ہی نہیں بلکہ مشرق کے دوسرے ملکوں کے لوگ۔ ان کی آنکھوں میں جنس کی بھوک صاف نظر آتی تھی اور وہ کسی بھی لڑکی کو ایسے گھورتے تھے جیسے آنکھوں میں آنکھوں میں کھا جائیں گے۔ یہ لوگ بڑی بڑی امیدیں لے کر آتے تھے اور ان کی طلب صرف عورت اور شراب ہوتی تھی۔

بندرگاہ کے علاقے میں ہونٹوں کی مارکیٹ تھی اور یہاں آرام سے ہوٹل مل جاتے تھے۔ بندرگاہ پر کئی جہاز لنگر انداز تھے جن کے عملے کے لوگ گھوم پھر رہے تھے اور خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

اس نے ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے رکوائی اور کرایہ ادا کر کے اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ کاؤنٹر کلرک سے ساحل کے رخ والا کمرہ طلب کیا جو مجھے حاصل ہو گیا۔ میں ہوٹل میں داخل ہوئی تو مجھے ایک شخص نظر آیا۔ صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا گلے میں ایک جدید قسم کا کیمرا پڑا ہوا تھا۔ اس کیمرے کو میں نے غور سے دیکھا تھا کیونکہ اس کی مسافت کچھ مختلف سی تھی اور اس وقت بھی اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کیمرے نے مجھے چونکایا تھا اور میں نے اس کی شکل دیکھی تھی۔ میرے قدم ایک لمحے کے لیے رکے تو وہ لفٹ کی طرف بڑھ گیا لیکن یہ غلط تھا۔ وہ جس انداز میں نظر آیا تھا اس سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ نیچے جا رہا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے اپنا سامان ایک طرف رکھا اور اپنی یادداشت کے خانوں میں اسے تلاش کرنے لگی۔ دو بار میرے دماغ میں بجلی چمکی تھی۔ اس کی شکل تو مجھے یاد نہیں تھی لیکن لباس، قد و قامت اور خاص طور سے وہ کیمرے، میں نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔

اوہ میرے خدا، اس وقت جب مین ڈاکٹر ہیر کی سیکریٹری ایلس سے ملنے گئی تھی۔ میں نے اسے ایلسی کی رہائش گاہ کے پاس دیکھا تھا اور دوسری بار شاید ایئر پورٹ پر اس وقت جب میں بورڈنگ کارڈ لے رہی تھی۔ میرے دماغ کی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اور میرے آس پاس موجود ہے۔

میں نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ وغیرہ دھویا۔ ایک اچھا لباس پہنا اپنے سامان کو احتیاط سے رکھا اور اسے اس طرح نشان زد کر دیا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی میرے کمرے کی تلاشی لینے کی کوشش کرے تو مجھے معلوم ہو جائے لیکن وہ کون ہے؟ کیا یہ صرف اتفاق ہے اور میری تجسس طبیعت نے مجھے بلاوجہ الجھا دیا ہے۔ میں نیچے آگئی۔ ڈائننگ ہال میں بھی خوب رونق تھی۔ اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے میڈیو کو دیکھا اور ویٹر کو آرڈر نوٹ کر دیا۔ کھانے کے دوران میری نظریں بھٹکتی رہی تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس شخص کی صورت ابھی تک میں نے تھیک سے نہیں دیکھی تھی اس کا کیمرا اور لباس میں اس کی شناخت تھی۔

وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد میں باہر نکل آئی۔ مسٹر سائیل نے مجھے ہیر لیونسکی کے بارے میں اچھی طرح بریف کر دیا تھا اور مجھے علم تھا کہ میں اس سے کسی طرح ملاقات کر سکتی ہوں۔ لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ میں جلد بازی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بندرگاہ کا یہ علاقہ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے کافی پسند تھا۔ اس میں ایک نیا پن تھا۔ ویسے تو پورے ہانگ کانگ کا ایک ہی انداز تھا لیکن بندرگاہ کا یہ علاقہ مخصوص ثقافت کا حامل تھا۔ میں نے ایک سائیکل رکشہ میں اور اس میں بیٹھ کر چل پڑی۔ سڑکوں کی وجہ سے گیلی تصمین اس لیے رکشہ سے رفتاری سے چل رہا تھا جو اور مزہ دے رہا تھا۔

میں کافی دن پہلے یہاں آئی تھی تو بندرگاہ کے علاقے کے ایک بہت پیارے لیکن چھوٹے سے ریستوران میں نے پودنے کی کافی لی تھی اور اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ میں نے رکشہ وہیں رکوا لیا اور اشارے سے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اگر چاہے تو میرا انتظار کرے۔ پھر جب میں نے اسے چھ یانگ ڈالر دیئے تو اسے میری پوری زبان سمجھ میں آ گئی اور اس نے زور سے گردن ہلا دی۔

ریستوران اتنا ہی حسین تھا بلکہ اس میں کچھ اور خوب صورت اضافے کر لیے گئے تھے۔ شیشے کا دروازہ کھلنے پر خوب صورت پتھر سے بنے ہوئے زینے تھے، جن کے اختتام پر انتہائی وسیع ہال تھا۔ سامنے شراب کا کاؤنٹر اور دائیں بائیں میز کرسیاں پڑی ہوئی تصمین۔ درمیان میں گول اسٹیج بنا ہوا تھا۔ جس پر ایک نیم عریاں لڑکی گانا گارہی تھی۔ چھت میں رنگین روشنیاں رقص کر رہی تھیں جن کی وجہ سے ماحول کافی خوب صورت لگ رہا تھا۔

ہال کافی حد تک بھرا ہوا تھا۔ لاتعداد لڑکیاں اور مرد جو تہذیب کے دور سے کہیں دور کے لوگ لگتے تھے اس پاس کے ماحول سے بے نیاز اپنے آپ میں گم۔ پرائیویٹ کیمپوں کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے اور اندر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں نے ایک جگہ سنبھال لی اور اس بگڑے ہوئے ماحول کا جائزہ لیتی رہی۔

دفعتاً میرے بائیں جانب کے کیمپن کا پردہ ہٹا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا یہ وہی کیمبرے والا تھا۔ اس وقت بھی کیمبرہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا لیکن اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے سنبھلنا پڑا جب میں نے اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں سنبھل گئی اور خود کو ہر کیفیت کے لئے تیار کر لیا۔

”مداخلت کی سعانی چاہتی ہوں، کیا میں آپ سے چند باتیں کر سکتا ہوں۔“

”بیٹھے۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ انہی علاقوں کا باشندہ معلوم ہوتا تھا، چھوٹی آنکھیں چھنی ناک دو درخت ضرورت سے زیادہ بڑے اور نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے، جن کی وجہ سے اس کے جلوں کی ادائیگی میں فرق پڑتا تھا لیکن وہ بری شفاف انگلیں بول رہا تھا۔“

”اگر برانہ مانیں تو کیمپن بہتر رہے گا۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔

یہ ایک قابل اعتراض پیشکش تھی جس میں اس کے گال پر تھپڑ بھی مار سکتی تھی لیکن ایک لمحے میں، میں نے قبضہ کیا کہ ایک تھپڑ سے کیا فائدہ، ذرا چند لمحوں کے بعد ایک دلچسپ پروگرام پیش کر دوں گی کیونکہ بہت دن سے کوئی ورزش نہیں ہوئی تھی۔

”ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں گے۔“ وہ دوبارہ بولا۔

”چلیے۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم اس کیمپن میں داخل ہو گئے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ اس میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تصمین۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور میرے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔ ”میں آپ سے اپنا تفصیلی تعارف نہیں کر سکتا ہاں چند ضروری باتیں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔“

”میں تمہیں بہت وقت سے دیکھ رہی ہوں اور تمہیں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔“

”لیکن یہ نہیں جانتیں میں کون ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے اونٹوں کے نام سے پکار سکتی ہیں۔“

”بات کیا کرنا چاہتے ہیں آپ مسٹر اونٹ؟“

”ہاں، میں بھی بتانے میں دیر نہیں کرنا چاہتا، کون جانے کون سا لمحہ وقت بدل جانے کا ہو، اس لیے

ضروری بات فوری کیے لیتا ہوں۔“

”یہی بہتر ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اصل میں مجھے آپ سے خاص انیسیت ہے۔ آپ بے حد ذہن اور اعلیٰ کارکردگی کی مالک ہیں اور میں

اس طرح کے لوگوں سے خاص عقیدت رکھتا ہوں جس مشن پر آپ آئی ہیں میں اس کے بارے میں اچھی طرح

جانتا ہوں۔“

میرے رونگھٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ کون ہے یہ بدنما انسان اور کیا جانتا ہے میرے بارے میں۔ اس کے

الفاظ تو بڑے مشکوک ہیں۔ یہ میری کون سی اعلیٰ کارکردگی کی بات کر رہا ہے۔ اس طرح بات کر رہا ہے جیسے

مجھے بہت پہلے سے جانتا ہے لیکن فوراً میں بے تاب ہو جانے کا مطلب ہے کہ اگر اس نے میرے بارے میں ہکا

مارا ہے تو کامیاب ہو جائے۔

میں نے اسے سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر تم میری اعلیٰ کارکردگی کے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ میرا ایک گھونسا جیڑا

توڑ دیتا ہے۔“

”اوہ مجھے نہیں معلوم تھا لیکن خیر کبھی اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔“

”ضرور کیجیے۔ آپ کے یہ دو دانت ویسے بھی آگے نکلے ہوئے برے لگتے ہیں۔ میں انہیں بلا معاوضہ

ٹھیک کر دوں گی۔“

”آہ کاش! یہ دو منحوس دانت میری زندگی میں شامل نہ ہوتے تو.....“ اس نے افسردگی سے کہا اور مجھے

ہنسی آگئی۔

”تو کیا ہوتا؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن درحقیقت میں اندر سے بڑی مضطرب تھی اور یہ جانتا چاہتی تھی کہ وہ

میرے بارے میں کیا جانتا ہے۔“

”میں آج تک کسی.....؟..... کے ہونٹوں کی حلاوت سے محروم ہوں۔ چلیے چھوڑئیے، ہم غلط بحث میں پڑ

گئے۔ میں آپ سے جو اہم بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ غلط جگہ آئی ہیں۔ ڈاکٹر لیونسکی ہانگ کانگ میں

نہیں ہے۔ وہ اب آپ کے ہاتھ آ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے اب اس کے حصول کی کوشش آپ کے لیے بے

مقصد ہوگی اور جو لوگ اس کے دوبارہ حصول کے لیے سرگرداں ہیں انہیں ناکامی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے

گا۔“

نہ جانے کتنی اعصابی قوت کو بروئے کار لا کر میں نے اپنے بدن کی تھر تھری کور کا تھا اور اس کے بعد سنبھل

کر کہا تھا۔

”تو کیا واقعی ڈاکٹر ہیر یہاں نہیں ہے۔“

”نہیں، کل رات میں اس لیے کانگ کانگ چھوڑ دیا ہے اور اس وقت وہ کسی نامعلوم جگہ محفوظ ہے۔“

”ایسٹرن کلاسکس میں ایک نام سامری جادوگر کا آتا ہے۔ مجھے آپ کے اندر اس کی جھلک نظر آتی ہے

مسٹر اونٹ، اپنی بڑی جادوئی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ میں نے کہا اور اس کے

ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑی مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے نفرت سے

ناک سکوڑ کر رخ بدل لیا۔ اپنی جمالیاتی جس سے میں سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی۔

www.paksociety.com

”تاہم آپ کوشش کر سکتی ہیں لیکن اس میں آپ کو بہت سے خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں۔ آپ کو یہ اطلاع دینا بھی ضروری ہے۔“

”بے حد شکر یہ۔“ گویا آپ کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر اس وقت ہانگ کانگ میں موجود نہیں ہیں۔

”جی اور میرا بہترین مشورہ ہے کہ آپ جس قدر جلد ہو واپس چلی جائیں مس ایلسی۔ یہ آپ کے لیے ضروری ہے۔“ اس نے کہا اور اچانک میرا خون سیروں بڑھ گیا۔ اس سے مجھے ایسی کہہ کر پکارا ہے۔ اس لیے وہ جو کوئی بھی ہے، جتنا بھی خطرناک ہے لیکن مجھے ہیمر کی سیکریٹری ایلسی کی حیثیت سے ہی جانتا ہے اسے اس سے زیادہ میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے میں مسکرا دی اور میں نے کہا۔

”مفت مشورے کے لیے شکر یہ۔ میں یہ بھی نہیں پوچھوں گی کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے آپ کو ہر اس جگہ دیکھا ہے جہاں سے آپ نے میرا پیچھا کیا ہے لیکن میں کسی فضول بات پر کبھی اس وقت تک غور نہیں کرتی جب تک وہ میرے لیے کوئی مشکل نہ بن جائے اور میرے پیارے شخص، میں ایکی ہانگ کانگ میں رہوں گی اور اپنے طور پر ساری باتیں معلوم کروں گی۔“

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بھیا تک مسکرا دیا اور میں نے رخ بدل لیا۔ اس کی آواز ابھری۔

”ہاں ہانگ کانگ کی سیر کرنا آپ کا حق ہے لیکن اپنے مقصد میں آپ کو کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔ البتہ میں آپ کو ایک پیشکش کر سکتا ہوں۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”پیشکش؟“

”ہاں۔“

”وہ کیا؟“

”کیا آپ ڈاکٹر ہیمر کے ساتھ رہنا پسند کریں گی؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ ان کی سیکریٹری رہیں اور یقیناً آپ کو ان سے انیٹ ہوگئی ہوگی اور یہی انیٹ آپ کو یہاں خطرات سے دوچار ہونے کے لیے بھیج لائی ہے۔ اس لیے آپ چاہیں تو ہمیشہ ان کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔“

”آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کروں۔“

”نہیں۔ بلکہ انسانیت کی خدمت کے عظیم مقصد کے لیے۔“ اس نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر لونسکی شائریکا کے انسانیت دشمن یہودی سرمایہ کاروں کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ اس کا ضمیر جاگ گیا اور اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ اب وہ مظلوم فلاکت زدہ انسانوں کے لیے کام کرنا چاہتی ہے۔ اس مشکل میں آپ چاہیں تو اس کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔“

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”آپ کے پاس سیل ہے؟ میرا مطلب ہے مقامی طور پر اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔“

”ہاں کیوں؟“

”مناسب سمجھیں تو مجھے نمبر دے دیں۔ میں آپ سے دوبارہ گفتگو کر کے آپ سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ بھی ابھی کر لیں مسٹر اوئینڈ۔ ممکن ہے میں دوبارہ آپ سے بات کرنا پسند نہ کروں۔“ میں نے کہا۔
 ”کچھ باتیں وقت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ویسے آپ کی مرضی اگر مجھے آپ سے ملاقات کی ضرورت پڑی تو
 میں آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“
 ”بیکار ہوگا۔“ میں نے کہا۔
 ”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں نے آپ کی فضول بکو اس پر توجہ نہیں دی ہے۔“ نہ ہی میں یہاں سے اس طرح واپس
 جانے کے لیے تیار ہوں لیکن پھر بھی میں اپنا نمبر تمہیں دیے دیتی ہوں۔“ میں نے کہا اور اس نے میرا نمبر فیڈ
 کر لیا۔ ”اور کچھ۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بہت کچھ، لیکن وقت آنے پر۔ آئیے اٹھیں۔ اس نے کہا اور میں کرسی سے اٹھ گئی۔ ہم دونوں کیمین
 سے باہر نکل آئے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر ایک طرف چل دیا۔ ایک بھی الوداعی لفظ نہیں کہا تھا اس
 نے۔“

”کرائے کا سٹو۔“ میں نے زیر لب کہا اور اپنی میز پر آ گئی۔
 میز پر بیٹھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہ کہیں نہیں نظر آیا تھا۔ میں اس پر غور کرنے لگی۔ کچھ سمجھ
 میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ کوئی عام بندہ نہیں ہے۔ البتہ اس بات سے
 مطمئن تھی کہ وہ مجھے ایسی کی حیثیت سے جانتا ہے اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں معلوم۔“
 تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر میں اٹھ گئی۔ اب یہاں دل نہیں لگ رہا تھا اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو یہ بات بڑی
 مایوس کن تھی کہ ڈاکٹر ہیر اس وقت ہانگ کا ٹنگ میں نہیں ہے۔ پھر وہ کہاں ہے اور میں اسے کیسے تلاش کروں
 گی لیکن خیر یہ مشکل کا حل نکل ہی آتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں اس کے بارے میں معلوم کرنے کی ہر
 ممکن کوشش کروں گی۔“

پھر میں وہاں سے اٹھ گئی۔ اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ باہر میرا رکشہ کھڑا ہوا تھا۔ رکشہ والے کو میں نے
 اتنے پیسے دے دیئے تھے کہ وہ ساری رات میرا انتظار کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ رکشہ چھوڑ کر کہیں آس پاس گیا
 ہوا تھا۔ کسی سے کہیں ہانگ رہا ہوگا۔ میں رکشہ میں بیٹھ گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ کہیں سے نمودار ہوا اور رکشہ کی
 سیٹ پر جا بیٹھا۔ ”میں نے اس سے کہا۔“
 ”میرے ہوٹل چلو، جہاں سے میں نے تمہیں ہانگ کیا تھا۔“

اس نے کوئی جواب دیئے بغیر رکشہ آگے بڑھا دیا۔ میں سوچوں میں گم ہو گئی۔ بہت سے خیالات دل میں
 تھے۔ یہ شخص ممکن ہے لاکھوں چن انتظامیہ کا کوئی اہم رکن ہو اور اس کی ذمہ داری ہے کہ مجھے ڈاکٹر ہیر سے ملنے
 سے روکے یا پھر مجھے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ یہ میری
 کامیابی تھی، باقی رہی ہیر کی بات تو اس سے مل تو لوں۔ اس کے بعد فیصلہ کروں گی۔

رکشہ ڈریگن کلب کی طرف جا رہا تھا لیکن اچانک وہ سیدھی سڑک پر چلتے چلتے ایک گلی میں مڑ گیا اور رکشہ
 والے نے گلی میں داخل ہوتے ہی ایک خاص ٹیکنیک سے رکشا کا اگلا پہیہ اوپر اٹھالیا۔ میرے لیے یہ بالکل غیر
 متوقع تھا۔ میں بے اختیار رکشا سے باہر سڑک پر آگری۔ رکشا چلانے والا کوڈر میری طرف جھپٹا اور مجھے اپنی
 غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ یہ رکشا ڈرائیور وہ نہیں تھا جس کے ساتھ میں آئی
 تھی۔ رکشا ممکن ہے وہی ہو، جگہ بھی وہی تھی جہاں میں نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا لیکن بندہ بدل گیا تھا۔ پتا
 نہیں اس بے چارے پہلے رکشا والے کے ساتھ کیا کیا۔

رکشا سے کوڈر نیچے اترنے والا میری طرف جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے خنجر کو میں نے صاف دیکھ

لیا۔ میں زمین پر گری تھی جو نبی وہ خنجر سنبھالے مجھ پر جھکا میں نے دونوں لاتیں جوڑ کر اس کے سینے پر ماریں۔ وہ میری طرح لڑکھڑایا تو میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پوری مہارت کے ساتھ گھوم کر ایک لات اس کی ناف کے نچلے حصے پر ماری اور وہ چیخ مار کر گر گیا۔

لیکن یہ ساری سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ وہاں اس کا دوسرا ساتھی بھی موجود تھا جس کی لات پوری قوت سے میری کمر پر پڑی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے پئی۔ دوسرے لمحے دوسرے خنجر کی دھار چمکی۔ جو نبی خنجر میری طرف لپکا میں نے جھکائی لے کر اس کا وار خالی کر دیا۔ دوسرا حملہ آور کسی قدر بھاری جسم کا مالک تھا۔ اس کا توازن خراب ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے پوری مہارت سے خنجر کا دوسرا وار کیا۔ مجھے رکشہ ڈرائیور کی طرف سے بھی کٹہرہ تھا کہ وہ نیچے گرے گرے میری ٹانگیں پکڑ کر گرانے کی کوشش نہ کرتا۔ اصولی طور پر اسے اس وقت یہی کرنا چاہیے تھا۔ ادھر دوسرا حملہ آور اس وقت اپنی لڑائی بھڑائی کی مہارت کے ساتھ مناسب پینتھرہ بدل رہا تھا تا کہ اس کا دوسرا وار خالی نہ جائے اور اس نے کیا بھی یہی۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کے خنجر کے وار سے بچنے کی کوشش میں تھی لیکن اس نے مجھ پر فلائنگ کک لگا دی۔

مجھے بس اتنا کرنا پڑا تھا کہ اس کا نشانہ خالی دے دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ زمین پر گر کر تو میں نے گھوم کر ایک لات اس کے ماری جو اس کی پسلیوں پر پڑی اور اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

لیکن رکشا ڈرائیور نے وہی کیا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ اس نے گرم گرم میرا پاؤں پکڑا اور پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ اس بار میں بری طرح گری تھی لیکن دونوں بے وقوفوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ سب تو میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ نیچے گر کر ہی میں نے اپنی چوٹ بھول کر لوٹ لگائی اور رکشا والے کی زد سے بچ گئی جس نے چھلانگ لگائی اور بڑے آرام سے اپنے ساتھی پر جا کر لیکن اس بار اسے شدید نقصان پہنچا تھا کیونکہ نیچے گرے ہوئے شخص کا خنجر اس کی ران میں پیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گالی نکلی تھی۔

پتا نہیں اس وقت ان دونوں کے دلوں میں کیا خیال ہو گا۔ ایک مست شباب دو شیزہ سے تو پیار کیا جاتا ہے۔ اس کی دلکشی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے لیکن یہاں ہڈیوں کی مزاج پر سی ہو گئی تھی سب کچھ لٹا ہو گیا تھا۔ اور پھر ان کے بھاگنے کا منظر بڑا دلچسپ تھا۔ ان میں سے ایک ران کا زخم پکڑے بھاگ رہا تھا اور دوسرا کمر پر ہاتھ رکھ کر لنگڑا لنگڑا کر بھاگ رہا تھا۔ ابھی میں ان کے بھاگنے کا منظر دیکھ رہی تھی کہ مجھے گلی کے دوسرے سرے پر قدموں کی آواز سنائی دی اور میں اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ یہ صورت حال خراب تھی۔ ہو سکتا ہے ان کے دوسرے ساتھی ہوں جو اس صورت حال کے نتائج دیکھتے آرہے ہوں لیکن آواز دوبارہ نہ آئی۔ دونوں بھاگنے والے گلی کے دوسرے سرے سے باہر نکل گئے۔ گو میں بھی اسی طرف چل پڑی۔ گلی کے دوسرے سرے پر نکل کر میں نے اپنا حلیہ تبدیل کیا اور پھر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی جسے میں نے اشارے سے روکا اور اپنے ہونٹ چل پڑی۔

☆☆☆

اگر میں آپ سے کہوں کہ یہی سب میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہے اور میں اس میں خوش رہتی ہوں تو آپ اسے سخی خوری کہیں گے۔ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ اپنے آپ کو منفرد دکھا ہر کرنے کی کوشش ہے۔ جو انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ آپ کہتے رہیں آپ کا حق ہے جو بھی سمجھیں۔ میں یہ سب کے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں واقعی صنف نازک کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہوں۔ مجھے مار پیٹ، دنگوں اور قتل و غارت گری میں جو مزہ آتا ہے کسی اور چیز میں نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے خطرناک ترین حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ ایسے کہ میری جان کے لالے پڑ جائیں اور میں اپنی جان بچانے کی کوشش کروں۔ اس میں سب کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ ہوں میں انسان۔ مکمل انسان، مکمل نوجوان۔ اب آپ کو لفظی چاشنی فراہم کرنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ بس یوں سمجھ

لیں کہ..... ڈش..... ڈش۔
تو جناب میں ہوٹل پہنچ گئی۔ اس کم بخت رکشہ والے کے ساتھی نے کمر پر جولانے ماری تھی اس نے کمر کی کچھ بڈیوں کی مزاج پرسی کی تھی۔ ہوٹل کے کوریڈور میں چل کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دل چاہ رہا تھا کہ تھوڑی سی لنگڑا کر چلوں۔ لیکن شرم آتی تھی۔

البتہ کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا۔ اور پھر ایک خاص قسم کی ورزش کی جس کی تفصیل آپ کو نہیں بتاؤں گی۔ سوری۔ خیر۔ اس کے بعد سوچوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہانگ کا تک میں دلچسپ استقبال ہوا تھا اور امیہ تھی کہ بہت سے دل والوں سے واسطہ پڑے گا۔ اور ٹھیک ٹھاک ورزش کرنی پڑے گی۔ اب صحت سونا چاہتی تھی۔

دوسری صبح پر سکون تھی۔ بلکہ خوش گوار تھی۔ اور اس وقت مزید خوش گوار ہو گئی جب ہوٹل کے ریپشن سے فون موصول ہوا۔ ”میڈم آپ جاگ رہی ہیں۔“

”ہاں۔ کیوں؟“

”آپ کی کال ہے۔“ ریپشنٹ نے کہا اور میرے فون پر کال ملا دی۔

”ہیلو!“ دوسری طرف ایک کھر کھرائی آواز سنائی دی۔ اور میں غور کرنے لگی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی آواز بدل کر بول رہا ہو۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرے لگی۔ اور میرے ذہن کی گہرائیوں سے ایک نام ابھرا۔ اونیو مکروہ صورت اونیو۔ ہاں بولنے کے انداز میں تھوڑی سی مماثلت پائی جاتی تھی۔ ”ہیلو۔“ آواز دوبارہ سنائی دی۔

”ہیلو۔ کون؟“

”نہ دوست نہ دشمن۔“ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”فون کیوں کیا ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں کیا۔

”تھوڑی سی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”کس سلسلے میں۔“

”تمہیں ڈاکٹر لیونسکی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت لائی چن میں نہیں ہے۔ میں تمہیں اطلاع دیتا ہوں کہ وہ اس وقت ہانگ کا تک میں ہے۔“

”میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟“

”فضول بکو اس مت کرو، پتا نوٹ کرو۔ ویونے کرخت لہجے میں کہا۔ بڑا توہین آمیز انداز تھا۔ میرے سامنے ہوتا تو بتاتی۔ غصے کی وجہ سے میری آواز نہ نکل سکی۔ لیکن دوسرے لمحے میرے اندر کی اپنی پارک جاگ اٹھی جو چالاک اور مصلحت ساز تھی۔ اگر اس شخص پر توجہ نہ دی تو کم ہو جائے گا اور میں اس سے اپنی توہین کا بدلہ نہ لے سکوں گی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے پتا لگاؤ۔“

”نوٹ کرو۔“

”بتاؤ“ میں نے کہا اور وہ ایک ایڈریس مجھے سمجھانے لگا۔ میں نے ایڈریس اچھی طرح سمجھ لیا اور پھر تھکاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے ٹھیک پتا بتایا ہے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اپنے پاس سے ملنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ ممکن ہے میں ان کے ساتھ یہیں رہ پڑوں۔ لیکن میں تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ تم سمجھا رہو۔“

میں نے اس پر بھرپور وار کیا لیکن نتیجہ بڑا مایوس کن تھا۔ ایک مکروہ قہقہہ میرے کانوں میں ابھرا اور فون بند

گیا۔ میری آنکھوں میں اوشو کی گراہت بھری شکل گھوم مٹی خاص طور سے وہ دونوں دانت جو اس کے نچلے ہونٹ پر رکھے تھے۔ ذوق حسن کا میری فطرت میں اچھا خاصا دخل تھا اور جب کبھی اپنے اندر جھانکتی تو یہ سوال ضرور میرے دل میں ابھرتا کہ میری نسوانیت کی کائنات پر چھا جانے والا کیسا ہوگا۔

اوشو کا تصور ذہن میں آیا تو ایک عجیب سی توہین کا احساس ہوا۔ بے شک میں اس وقت اپنی پارک نہیں بلکہ لیونسکی کی سیکریٹری، ایسی کے روپ میں تھی اور میرے چہرے پر ایسی کامیک آپ تھا لیکن ایسی بھی کیا بُری تھی۔ اس منحوس خرگوش جسے دانتوں والے کو تو قریب سے دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہے گا۔ پھر خود پر ہنسی آگئی۔ بلاوجہ سلگ رہی ہوں بھاڑ میں جائے۔ لیکن۔ ارے اوہ یہ تو سوچا بھی نہیں اس نے مجھے لیونسکی کا پتا کیوں بتایا ہے۔ آخر کیوں..... جب بہت سی احتیاطیں میرے ذہن میں ابھریں۔ کیا کوئی کسی خاص وجہ سے مجھے ایڈریس پر بلانا چاہتا ہے۔ اوہ۔ گڈ۔ میں آؤں گی۔ میری جان ضرور آؤں گی۔ اپنی پارک تو جان ہتھیلی پر لیے ہوتی ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ موت سے بچہ کشی ہے۔ وہاں ایسی نہیں اپنی پارک آئے گی۔

☆☆☆

جس علاقے کا مجھے پتہ بتایا گیا تھا میں وہاں پہنچ گئی۔ بہت عجیب جگہ تھی۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ مکان تھے مگر قبروں کی طرح خاموش، ویران ویران۔ بالکل مقبرے معلوم ہو رہے تھے۔ روشنی کی ایک جھلک کہیں نہیں تھی۔ لوگ شاید جلد سو جانے کے عادی تھے یا پھر یہ مکان ہی غیر آباد تھے۔ ویسے ڈاکٹر لیونسکی جس پائے کا شخص تھا اس کا مجھے اندازہ تھا کہ اس کی سخت نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ وہ لوگ اس کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جس مکان کا مجھے پتہ دیا گیا تھا وہ بھی دوسرے مکانوں کی طرح ویران نظر آ رہا تھا۔ میں نے چند لمحوں اس کے جائے وقوع کا اندازہ لگایا۔ اس شخص کو تو بہت سخت پہرے میں رکھنا چاہیے تھا اس کے ارد گرد زبردست سیکورٹی ہونی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں اسے اس جگہ کیوں رکھا گیا ہے۔ یا پھر مجھے یہاں دھوکے سے بلایا گیا ہے۔ لیکن میں محتاط تھی۔ میں نے اس مکان کی کال بتل پر انگلی رکھی اور دوسری گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بھیا تک وجود دروازے میں نظر آیا۔

میرے خدائے انسان تھا یا روائتی کہانیوں کا دیو، اس کے دونوں شانے چوکھٹ کی چوڑائی کے برابر تھے۔ بالوں سے بھرے ہوئے بازو آدمی آستین کی نمیش کے باہر موٹی موٹی شاخوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ چہرہ فٹ بال کے سائز کا گول اور ناک کئی کلچروں میں مٹی ہوئی تھی یہ غالباً بار بار ضرب لگنے سے خراب ہوئی تھی۔ آنکھیں برق کی طرح تیز اور چمکدار تھیں۔ بال چھوٹے چھوٹے تھے اور گردن جیسے تھی ہی نہیں۔ تھوڑی گویا سینے پر لگی ہوئی تھی۔ قد سات فٹ سے بھی کچھ اونچا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے زمانے کا آدمی اس دور میں نکل آیا ہو۔ میں نے عجوبوں میں بھی اتنا بھیا تک آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس کی غراہٹ ابھری۔

”کیا بات ہے؟“

”مجھے ڈاکٹر ہیر لیونسکی سے ملنا ہے۔“

”وہ یہاں نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ۔“ اس نے پھر بھٹریوں جیسے انداز میں غرا کر کہا اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

میں خاموش کھڑی رہ گئی۔ میرے اندر غصہ جاگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ ویسے میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ دروازے کے پاس سے گیا نہیں ہے اس کے علاوہ دوسری طرف سے بھاری سانسوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بھینسا کھڑا کر کر رہا ہو۔ میں وہ آواز سنتی رہی۔ اس

وقت میری ناک پر پانی کی ایک بوند پڑی اور میں نے چونک کر آسمان کی طرف۔ بادل بہت گہرے ہو رہے تھے اور شاید بارش تیار تھی۔

اس موٹے پھینسے کی ایسی تھسی، آج بلڈوزر سے زور آزمائی سہی، میں نے دل میں سوچا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میں وہاں سے ہٹی اور مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس کے عقب میں چلی گئی۔ یہاں مین کے چھوٹے بڑے ڈبوں اور بوتلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جیسے بیکار چیزیں پھینکنے کی جگہ ہو۔ اس احاطے میں مکان کا عقبی پھانک بھی موجود تھا۔ میں آرام سے آگے بڑھی اور پھانک پر چڑھ کر اندر کود گئی۔ دوسری طرف اچھا خاصا لان تھا چاروں طرف گھاس تھی اور درمیان میں نوارہ لگا ہوا تھا۔ مکان سے کوئی چھ فٹ دور ایک گھنا درخت نظر آ رہا تھا جس کی بلندی مکان کے جتنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی۔

میں نے گردن ہلائی اور پھر درخت کی طرف بڑھ گئی۔ اس قسم کے کاموں میں مجھے زبردست مہارت حاصل تھی چنانچہ میں درخت پر چڑھ گئی۔ اوپر جا کر شاخیں پتلی اور کمزور ہو گئی تھیں یہ شاید میرا بوجھ نہ سہا سکیں لیکن یہی چلی کھڑکی تک پہنچا سکتی تھیں۔ یہ میرے لیے لمحہ فکر یہ تھا۔ اب کیا کروں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان پتلی شاخوں کو آزماؤں اگر گر گئی تو کتنی چوٹ لگے گی اس کا اندازہ بھی کیا تھا۔ درخت کافی اونچا تھا اور نیچے زمین سخت تھی۔

اور پھر جتنا شک کا کھیل شروع ہو گیا۔ کافی خطرناک کھیل تھا۔ میں ایک شاخ نازک پر جھولا جھول رہی تھی۔ اور میری نظریں بھوکے بلی کی طرح کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ میں اس پر کب لگاؤں گی اور اندر جا پڑوں گی۔ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز ضرور ہوگی۔ اور پھر میں ہوں گی اور وہ افریقہ کا بھینسا۔ کیونکہ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز پر وہ ضرور آئے گا اور میری اس سے بڑھ بیٹھ ہوگی۔

تین چار جھکولے لے کر میں نے شاخ چھوڑ دی اور دونوں پاؤں بند کھڑکی پر مارے۔ ویسے میری بہت سی کامیابیوں میں میری خوش قسمتی کا بھی دخل رہا ہے۔ بات چاہیے چھوٹی ہو یا بڑی، وہ ہوتی ہے جس میں کامیابی حاصل ہو، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ خیر میں بتا رہی تھی کہ اس وقت بھی وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہیں

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'تاشون' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ

ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق و اثرات

سعادت و خوشحالی کا حساب، حیرت و تجسس پر مبنی ناول

تحریر: شازی سعید مغل

تاشون

۲۵۰ صفحات

Postage
Rs 50

برصغیر میں علم تفسیر کے بانی حضرت کاش البرنیؒ کی

عاملیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا

کے تجربات و مشاہدات پر اسراریت کے نئے راز کھولنا ایک

سحرانگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنیؒ "بنام"

"تاشون" ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کروائیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر اپنا آرڈر بک کروائیں۔

قیمت ۵۰۰ روپے

Aureq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74500



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

تھی، یعنی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس کے دونوں پاٹ بس بھڑے ہوئے تھے اور چٹنی نہیں لگی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں کھل گئے اور میں اندر جا پڑی۔ اور اندر بھی فرش پر موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ گویا قدرت نے یہ دونوں آسانیاں مجھے فراہم کر دی تھیں۔

ہوش وحواس درست ہوئے تو میں بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے کا ماحول تاریک نہیں تھا اس میں بہت ہی نفیس قسم کا نائٹ بلب جل رہا تھا جس کی مدھم روشنی کمرے کے ماحول کو اجاگر کرتے ہوئے بتا رہی تھی کہ وہ بیڈروم ہے۔ مزید غور کیا تو بیڈروم کے بیڈ پر ایک انسانی جسم نظر آیا جس نے کروٹ بدلی ہوئی تھی اور اس کے گہرے سانسوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

میں نے پھرئی سے پستول نکال لیا اور دبے قدموں چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ترین ہو گئی۔ کیا یہ ممکن ہے یا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ کیا دنیا کے ذہین ترین سائنس دان، ایک مایہ ناز موجود تک رسائی اتنی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ یہ شخص تو حکومت لائی چن کے لیے ہیرے کی کان ہے اس سے تو اسے بڑے زبردست فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کسی بیرونی شخص کی رسائی اتنی آسانی سے اس تک ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ ہیرم لیونسکی ہی تھا۔ میں نے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا اور بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اسے آواز دی۔

”ڈاکٹر لیونسکی۔“

میری اس ہلکی سی آواز پر ہی انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔

”یہ میں ہوں ڈاکٹر۔ ایسی براؤن۔“ میں نے کہا اور میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کے منہ سے ہلکی سی بڑبڑاہٹ نکلی۔

”ایسی براؤن؟“

”آپ کی سیکریٹری ایسی۔“ میں نے کہا اور اچانک ڈاکٹر زور سے اچھلا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف۔ میرے حواس کانوں نے بھی دروازے سے دوسری طرف بھاری قدموں کی آوازیں سن لی تھیں۔

میں نے پھرئی سے پستول لباس میں چھپا لیا۔ اس وقت دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور وہی دیو قامت بھینسا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن وہ تنہا نہیں تھا اس کے پیچھے ایک اور شخص بھی تھا جو شب خرابی کے لباس میں ملبوس تھا۔ بڑی پروقار شخصیت کا مالک تھا اور مقامی باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ دیو قامت جانور نما شخص نے میری طرف اشارہ کیا اور غراتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ کہا..... نو وارد نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے ہٹا کر آگے بڑھا۔ اس نے میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے نرم اور پراحترام لہجے میں ہیرم لیونسکی سے کہا۔

”یہ کون ہیں ڈاکٹر؟“

”میرا نام ایسی براؤن ہے۔ شائریکا میں، میں ان کی سیکریٹری تھی۔“ ڈاکٹر کے بولنے سے پہلے میں بول پڑی۔

ڈاکٹر لیونسکی کو جیسے ہوش آ گیا۔ آنے والا شخص اب بھی میرے بجائے ڈاکٹر ہی کی طرف متوجہ تھا۔ ڈاکٹر نے سنبھل کر کہا۔ ”ہاں یہ ایسی ہے۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

دیو قامت شخص نے پھر میری طرف دیکھ کر بدستور خونخوار لہجے میں کچھ کہا جابا لیکن نو وارد نے اسے روک دیا اور تعظیسی انداز میں گردن جھکا کر بولا۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر آپ ضرور باتیں کیجیے۔“ ساتھ ہی اُس نے پھر دیو قامت کے بازو کو چھوا اور اسے

ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر ہیر کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کے چہرے کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں خود کو اس معاملے میں بہت ذہین نہیں کہتی لیکن مجھے صاف اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر اپنی مرضی سے یہاں محصور نہیں ہے۔

میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے آنکھوں کا تاثر سخت کیا جیسے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ پھر بولا۔
 ”میں جانتا تھا کہ تمہاری محبت تمہیں مجھ سے دور نہیں رہنے دے گی۔ لیکن بے بی، بعض معاملات ویسے ہی ہوتے ہیں جن میں محبت سے کام نہیں چلتا، البتہ تم نے واقعی بڑی ہمت کی۔ لیکن تم یہاں تک آئیں کیسے؟“
 ”درخت پر چڑھ کر۔“ میں نے ہنس کر کہا اور کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے میری ہنسی میں میرا ساتھ دیا اور بولا۔

”تم نے بے چارے درخت سے زندگی چھین لی۔ کل وہ ضرور کٹ جائے گا۔“
 میں غور سے ڈاکٹر کا جائزہ لے رہی تھی۔ ڈاکٹر کو ان حالات میں جو باتیں کرنی چاہیے تھیں، وہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں خفیہ مائیکروفون نصب تھے جن پر یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور سنی جاسکتی تھی۔ اس کے امکانات بھی تھے کہ کیمرے بھی چھپے ہوئے ہوں کیونکہ کسی طرح کے اشارے بھی نہیں کر رہا تھا۔
 ”میرا خیال ہے میں بے آرام بیٹھی ہوں۔ کیا میں وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاؤں گا۔“
 ”ہاں ضرور..... مگر کرسی اس طرف لے آؤ۔“ اس نے نیبل لیمپ کی طرف اشارہ کر کے کہا اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ نیبل لیمپ ہی خطرناک ہے۔

”ہم سب آپ کے لیے پریشان تھے۔ آپ نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ آپ شائیکہ چھوڑ رہے ہیں۔“
 ”میں نے تمہارے ملک سے تعلقات ختم کر لیے ہیں اور اب میں مستقل طور پر یہیں رہوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کی کوئی خاص وجہ۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف پہنچی۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس کچھ عوامل تھے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سرمایہ دار، انسانیت کے بدترین دشمن بن چکے ہیں وہ ہر طرح سے سکوں کی سیاست کو اپنی کھٹی میں لے کر دنیا کو تباہ کر رہے ہیں۔ کون سے شعبے کو انہوں نے چھوڑا ہے۔ صنعت، زراعت اور انسانی زندگی سے متعلق جو کچھ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ سائنسی تجربات سے مخلوق کو ختم کر رہے ہیں۔ میں اس سازش میں ان کا ساتھ نہیں دینا چاہتا۔“
 ”کیا آپ لائی چن میں قیام کریں گے۔“
 ”ہاں۔ یہی ارادہ ہے۔“
 ”وجہ۔“

”تم بھی جانتی ہو۔ وہ ایک انسان دوست ملک ہے۔ وہاں خوفناک ایٹمی ہتھیار نہیں بنائے جا رہے ہاں اگر انہوں نے اس طرح کی کچھ چیزیں بنائی بھی ہیں تو صرف اپنی بقا کے لیے تاکہ ایٹمی ممالک اسے تر نوالہ نہ سمجھیں۔ اس کے علاوہ لائی چن جو کچھ کر رہا ہے انسانیت کی بقا اور مخلوق کی فلاح کے لیے کر رہا ہے۔“
 ”آپ کے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔“
 ”کس بات کا۔“

”یہ کہ آپ شائیکہ واپس نہیں جائیں گے۔“
 ڈاکٹر چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے پر تشویش نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک کاغذ

کا پیڈ اور پینسل اٹھالی اور اس پر کچھ لکھتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے اتنا بڑا قدم میں نے سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے۔“

”آپ کے فیصلے میں کوئی گنجائش ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر لیونسکی نے کہا۔

”میرا خیال تھا میں آپ کو واپسی کے لیے آمادہ کر لوں گی۔ میں نے طویل عرصہ تک آپ کے ساتھ کام

کیا ہے اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“

”میں تمہارے خلوص کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میں واپس نہیں جاسکتا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کی تحریر پڑھی۔ لکھا تھا۔ ”میری بیوی اور بیٹا

کچھ انتہائی خطرناک لوگوں کی قید میں ہیں۔ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ان دونوں کو ہلاک کر دیں

گے۔ یہ ان کا انتباہ ہے۔ اس کاغذ کو کسی طرح تلف کر دو۔“

میرے بدن میں کھنسنی دوڑ گئی۔ یہ ایک شدید اہم انکشاف تھا جس کے بارے میں میرے سوا کسی کو نہیں

معلوم تھا۔ اور اس کے پیچھے بہت سے سوالات تھے جو میں نے کسی طور پر اس سے نہیں کر سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ میں

پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ لائی چنز ہیں؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کاغذ کے پرزے کی گولی بنائی اور اسے مٹھی میں چھپا لیا۔

”میں تمہاری اس کوشش کا شکر گزار ہوں۔ لیکن تم واپس جا کر حکومت شائریکا کو یہ بتا دو کہ وہ میری جتنوں نہ

کرے۔ اور میرے بیوی بچے کو بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس

کے علاوہ میری بیوی اس فیصلے میں میری شریک نہیں ہے۔ وہ جب چاہے مجھ سے طلاق لے سکتی ہے۔ میں اس

کے لیے تیار ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اشارے سے کاغذ کی گولی نگلنے کے لیے کہا۔

”یہاں واش روم ہے ڈاکٹر۔“

”ہاں۔ وہ واش روم کا دروازہ ہے۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

”پلیز..... ایک منٹ۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر واش روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں آ کر

میں نے کاغذ کی گولی تلف کی۔ پھر واپس آ کر کہا۔ ”گویا آپ کی طرف سے کوئی بچک نہیں ہے۔“

”ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔“

”اوکے سر۔ میں چلتی ہوں۔ کل فلائٹ سے واپس چلی جاؤں گی۔ اس لیے خدا حافظ۔“

”خدا حافظ ایسی.....“ ڈاکٹر نے کہا اور انگلی سے میز کے نیچے لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد

دروازہ کھلا اور وہی شخص اندر داخل ہو گیا۔ جو دیو قامت کے ساتھ آیا تھا۔

”یہ جارہی ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”بہت بہتر جناب۔“ اس شخص نے گردن جھکا کر بڑے احترام سے کہا۔

میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا اور ایک طرف اشارہ کر کے اپنے

مخصوص لہجے میں کہا۔

”ادھر اس طرف میڈم۔ اس کا اشارہ ایک طویل کوریڈور کی طرف تھا جس کے دونوں طرف کمروں کے

دروازے سے نظر آ رہے تھے۔ میں اس طرف بڑھ گئی۔ وہ میری رہنمائی کے طور پر مجھ سے چند قدم ہٹ کر

چل رہا تھا۔ کوریڈور میں کوئی دس گز کے آگے چلنے کے بعد اچانک وہ پلٹا اور اس نے ایک کولٹ کا ٹیو میرے

سینے سے لگا دیا جس کی نال بہت لمبی تھی۔

میری آنکھیں حیرت سے پھل گئیں۔ ایک لمحے کے اندر میرے ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔ میں جس طرح یہاں آئی تھی اور جس طرح انھیں میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کافی حد تک غیر فطری تھا۔ لیکن مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب صورت حال کھل کر سامنے آئی تھی۔ ان لوگوں نے اتنی شرافت سے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔

”کیا مطلب۔“ میں نے وحشت کا مظاہرہ کیا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ نہ ہی تم اتنی فرشتہ صفت ہو کہ خاموشی سے چلی جاؤ گی۔ کیونکہ جس طرح تم عمارت میں داخل ہوئی تھیں وہ عام بات نہیں ہے۔“

”کیا چاہتے ہو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔ صرف اتنا کہ اب خاموشی سے چلی جاؤ۔ تم نے اپنا فرض پورا کر لیا ہے۔ ہمیں ہمارے فرض کی ادائیگی کے لیے مجبور نہ کرو۔“

اس شخص کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اب وہ ایک سفاک شخص نظر آ رہا تھا اور میری چھٹی حس دیکھ رہی تھی کہ وہ مجھے اتنی شرافت سے نہیں جانے دے گا۔ چنانچہ میں بھی تیار ہو گئی۔

”جاؤں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے کہا اور واقعی اس نے مجھ سے گھر سے باہر نکلنے تک کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن میرے اعصاب اب بھی کشیدہ تھے۔ ناممکن ہے یہ۔ جو ہو رہا ہے وہ ناممکن ہے۔ تاہم میں گھر کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ باہر اب باقاعدہ بوند باندی ہو رہی تھی اور سڑک گیلی ہو رہی تھی۔ راستہ دھندلایا ہوا تھا۔ ٹیکسی کا بھی پتہ نہ تھا۔

وہی ہوا جو میری چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ میں تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اچانک ایک کال بوتھ کے پیچھے سے وہی دیو قامت نکل آیا جس سے میرا عمارت کے اندر واسطہ بڑ گیا تھا۔

میرے قدم رک گئے۔ وہ مجھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے پھرتی سے جگہ تبدیل کی اور نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن اپنی جسامت کے خلاف وہ بڑا پھرتیلا نکلا۔ اس نے جھپٹ کر میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے زور سے دھکا دیا۔ میرا سر ایک مکان کی دیوار سے ٹکرایا اور سارے جسم میں تھر تھراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بچنے کی طرح اٹھالیا اور پھر پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔

جان لیوا کوشش تھی۔ میری ہڈیاں چور چور ہو جاتیں لیکن میں نے جو بھڑوڈ کے پینترے کو استعمال کیا اور پیروں کے بل زمین پر آئی۔ مجھے سچ کر وہ پیچھے ہٹا اور میں پیروں کے بل کھڑی ہو گئی۔ لیکن وہ بھی لڑائی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے حلق سے غراہٹ نکال کر میری گردن پکڑ لی۔ خدا کی پناہ انگلیاں لوہے کی بنی گئی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے بڑی مہارت کے اس کی ناک پر گھونٹے لگائے۔ پھر سینے اور پیٹ پر کئی چاپ مارے۔ یہ چاپ اچھے اچھے کولمبا کر سکتے تھے۔ لیکن اس شخص کو تو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔ اس نے میری گردن نہ چھوڑی اور میری ذہنی قوتیں ساتھ چھوڑے دے رہی تھیں۔ آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک ایسی آواز ہوئی تھی جیسے کسی بوتل کا کارک کھلا ہو۔ دوسری آواز ہوئی اور میرا گلا چھوٹ گیا۔ لیکن ساتھ ہی میں نے ایک کریہہ منظر دیکھا۔ اس کا بھیجہ اڑ گیا تھا۔

(اپنی پارک..... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔)

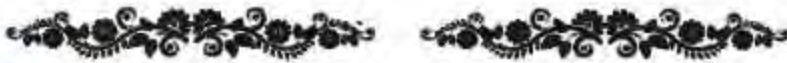
اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

گھر کی

ارم ناز



عورت کے انتقام کی ایک منفرد داستان جسے ارم ناز کے قلم نے پیراہن دیا



والی عورتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ بے وفا اور دھوکے باز ہوتی ہیں۔ خدا بہتر جانے مجھ سے پہلے وہ کتنے تجربوں سے گزر چکا تھا مگر میرے لیے شک کا کینڑا اس کی کھوپڑی میں کلبلا تار ہتا تھا۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتا میں حالت امتحان میں رہتی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں ایسے چبھتی جیسے دیوار پر ناخن رگڑ کر کوئی چونا کھریج رہا ہے۔ خدا کی مہربانی یہ تھی کہ ساس تندوں کے منہ جھٹ سے آزادی مگر چھٹی کے روز میرا شوہر میری ساس اور تند بن جاتا تھا۔ باورچی خانے کی صفائی پر دیر تک سناٹا، روٹی کے موٹے کوٹے دکھا دکھا کر سیکڑوں طعنے دیتا۔ وہ ایک کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا۔ خدا کو میری آزادی منظور تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ میرا شوہر سلیم جس کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا اس مل کا مالک دیوالیہ ہو گیا، مل بند کر لی پڑ گئی۔ سلیم بیس روز تک تلاش روزگار میں مارا مارا پھرتا رہا مگر نہیں کوئی کام نہ ملا۔ سلیم کے مل کے ہی پانچ دوست کام کے سلسلے میں فیصل آباد جا رہے تھے کیونکہ فیصل آباد میں کپڑے کی بہت بڑی صنعت ہے لہذا وہاں کام ملنا مشکل نہ تھا۔ سلیم بھی دوستوں کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے راضی ہو گیا۔ اب میرا مسئلہ تھا۔ ماں باپ مجھے رکھنے کو راضی نہ تھے اور میں خود بھی وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ سلیم نے آج تک

میں زمین کی طرح اپنے مدار میں گھوم گھوم کے تنگ آ گئی تھی۔ میرے آقا نے میرے قدموں کے آگے لکیر کھینچ دی تھی اور میں اس کی زرخیز بونٹی اس لکیر سے آگے جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ بغاوت کی سوچ بھی میرے بدن سے کھال اتر سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اسے سب کچھ معاف تھا۔ عیاشی تو اس کا حق تھا۔ میں پہلے جس گھر میں رہتی تھی وہاں کے مرد اپنا مزاج دکھاتے تھے پھر انہوں نے مجھے ایک دوسرے مرد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اب میں اس کا مزاج دیکھ رہی ہوں۔

میں کہاں ہوں؟ میری پسند ناپسند، میرا غصہ میرا پیار۔ میرا روٹھنا یہ سب تو مرچکا تھا یا شاید کبھی تھا ہی نہیں۔ میری ماں نے سمجھایا تیرا شوہر تیرا مالک ہے۔ اس کے قدموں میں فرش کی طرح بچھ جا اور میں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بچھ گئی۔ وہ روز مجھے اپنے قدموں تلے کھلتا اور آف کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ آٹھ سال گزرنے کے باوجود بھی خدا نے مجھے اولاد کی دولت سے نہ نوازا تھا۔ بغیر جانچے پرکھے مجھے باآسانی قصور وار ٹھہرا دیا گیا۔ بانجھ ہونے کا میڈل بھی میرے ماتھے پر چسپاں کر دیا گیا۔ سونے پر سہا گایہ کہ میری بھوری آنکھیں میری خوب صورتی نہیں بلکہ بے وفائی کی علامت تھیں۔ بقول میرے مجازی خدا کے بھوری آنکھوں

کمرے کی پچھلی کھڑکی روڈ کی طرف کھلتی تھی مگر سلیم نے یہ کھڑکی کبھی نہ کھولی تھی۔ کھڑکی کھولنا تو دور کی بات میں تو ارادہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سلیم کے ہاتھ کی مار سے زیادہ تکلیف وہ اس کی زبان کی مار تھی۔ خیر میں نے کھڑکی کھول لی۔

تازہ ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے نکلایا، عرصے بعد تازہ ہوانے میری روح کو طمانیت بخشی۔ اس قید میں رہتے ہوئے میں کسی دوسرے شخص کا چہرہ دیکھنے اور آواز سننے کو ترس گئی تھی۔ روڈ زیادہ چلتا ہوا تو نہ تھا مگر پھر بھی اکاؤنٹ گاڑیاں اور لوگ گزرتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی لڑکا لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے گزرتے، کبھی کوئی میاں بیوی اپنے بچوں کی فوج کو کھینٹتے ہوئے نظر آتے، کبھی کوئی برقع والی سینے میں شرابور سودا سلف اٹھائے دوڑی جا رہی ہوتی۔ میرا بھی دل کرتا کہ روڈ پر بلا مقصد گھوموں مگر بڑی بی تو اپنے دروازے پر میری جاسوس بن کر بیٹھی رہتی۔ چند دن گزرے بڑھیا اپنی ڈیوٹی سے اکتانگی اسے کوئی ایسی بات نظر نہ آئی کہ مرچ مسالا لگا کر سلیم کو بتاتی۔ اب بڑی بی

مجھے قید میں رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اپنی مٹھی سے آزاد کرے۔ مالک کے لیے پٹے سے بندھے وفادار کتے کو آزاد کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور وفادار بھی ایسا جو ہر حکم پر دم ہلائے..... طے یہ پایا کہ مجھے اسی گھر میں رہنا ہوگا۔ بلا ضرورت گھر سے نکلنا سختی سے منع بھی تھا۔ مہینے کے آخر میں سلیم ایک چکر کراچی کا لگا جائے گا۔ پیسے اور ضرورت کی اشیاء مہینے کے آخر میں وہ گھر میں ہی فراہم کرے گا، مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوگی۔ بہت مجبوری میں صرف ڈاکٹر کے کلینک جانے تک کی اجازت ملی۔

تمام شرائط لاگو کر کے سلیم فیصل آباد کے لیے نکل کھڑا ہوا اور میں گھر میں اکیلی رہ گئی۔

یہ ایک نئی آبادی تھی اس لیے بہت کم گھر آباد تھے، زیادہ تر خالی پلاٹ اور تالائے مکانات تھے۔ یہ گھر بھی دو کمروں تک ہاتھ روم اور کچن پر مشتمل تھا۔ سلیم سامنے کے مکان والی بڑی بی کو میری جاسوسی پر لگا گیا تھا۔ چند دن تو میں خالی گھر میں بوکھلائی بوکھلائی پھری، پھر میں نے بھی مصروفیت ڈھونڈ لی۔



Downloaded From
Paksociety.com

روز گھر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

شیر کے منہ خون لگ چکا تھا۔ اسے روکنا اب مشکل تھا۔ اپنی دانست میں میری طرف سے یہ سب سلیم کے لیے سزا تھی۔ میں سلیم سے انتقام لے رہی تھی۔ اشرف سے روز روز کی ملاقاتیں رنگ لائیں، میں حاملہ ہو گئی۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کھوٹ مجھ میں نہیں سلیم میں ہے۔ آٹھ سال بچہ ہونے کا طعنہ برداشت کرتی آئی۔ دل میں تیزی سے یہ خواہش ابھری کہ سلیم کا گریبان پکڑ کر اسے بانجھ ہونے کا طعنہ دوں مگر اس کا انجام سوچ کر جھرجھری آگئی۔ میں نے اشرف کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی کہ میں اگلے مہینے سلیم کے ساتھ فیصل آباد جا رہی ہوں، رہی سامان باندھنے کی بات تو سامان ہی کیا تھا..... چند جوڑے میں بیگ میں ٹخنوں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

مہینے کا آخر قریب آیا تو میں نے کھڑکی بند کر دی۔ دو دن ہی گزرے تھے کہ سلیم کی آمد ہو گئی۔ میں نے سلیم کو یہ نہ بتایا کہ میں حاملہ ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے اتنی دور کا سفر کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ میں اگر یہاں رکتی تو اشرف بھی باخبر ہو جاتا۔ میں یہ بچہ کسی طور کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سلیم دو روز کا تیسرے دن ہم مکان میں تالا ڈال کر فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہاں سلیم نے کرائے کا گھر لیا ہوا تھا۔ میں نے یہاں آ کر سلیم کو اپنی خرابی طبیعت کا بتایا۔ سلیم مجھے قریبی ڈاکٹر کے لے گیا۔ ڈاکٹر نے میرے حاملہ ہونے کی تصدیق کر دی۔ اس خبر نے سلیم کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھنے لگا۔ ہر شام کام سے آ کر مجھے ہمیں نہ کہیں گھمانے لے جاتا۔

وقت پورا ہوا اور میں نے ایک مٹے کو جنم دیا۔ بچے کی شکل و صورت اشرف اور مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ سلیم بچہ پا کر بہت خوش تھا۔ وہ پرانی اولاد کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ جب بھی بچے کو گود میں لے کر پیار کرتا، سینے سے لگاتا تو میرے دل میں طمانیت سی اتر جاتی۔ میں دل میں سوچتی سلیم صاحب یہ ہے عورت کا انتقام، جس سے آپ بے خبر ہو کر ساری زندگی خود کو آزاد نہ کرا سکیں گے۔ اب اس نئی کھڑکی کو میں قطعی بند نہ کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

صرف صبح کے وقت دروازے پر بیٹھتی۔ دھوپ تیز ہوتے ہی گھر کے اندر چلی جاتی۔ جاسوسہ کا خوف بھی مر چکا تھا۔ کمر میں بہت درد تھا، سوچا ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی ہوں دوا بھی لے لوں گی، سیر بھی ہو جائے گی۔ اگر بڑھی نے دیکھ لیا تو بتا دوں گی کہ بیمار ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی کیونکہ وہاں کا اجازت نامہ تو حاصل تھا۔

میں نے منہ دھویا، چادر لپیٹی آنکھوں میں سرمہ ڈالا سر سے بھوری آنکھیں اور نمایاں ہو گئیں۔

کلینک میں زیادہ رش نہ تھا۔ بہت کم لوگ تھے اس سے پہلے میں سلیم کے ساتھ ایک مرتبہ بخار کی دوا لینے آ چکی تھی۔ گپوڑ رہانے بہانے سے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب دیکھتا میں مسکرا دیتی۔ اپنی باری پر میں ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ دوا کی پرچہ باہر آ کر گپوڑ کو پکڑا دی۔ دوا دے دئے ہوئے ہمارے درمیان جو باتیں ہوئیں اس میں ہم نے اگلی ملاقات طے کر لی۔

اس کا نام اشرف تھا۔ اشرف دو پہر کے وقت کھڑکی میں آ جاتا اور ہم پہروں باتیں کرتے۔ دو پہر سنسان ہوتی بڑھیا بھی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گھر کے اندر چلی جاتی۔ کئی دن گزر گئے۔ اس دوران سلیم بھی آیا اور دو دن رہ کر واپس فیصل آباد چلا گیا۔

یہ دو دن بڑے بھاری گزرے۔ یہی خوف رہا کہ سلیم، اشرف کے بارے میں نہ جان جائے۔ اشرف کو میں بتا چکی تھی کہ جتنے دن کھڑکی بند دیکھے، واپس چلے جانا۔ سلیم کے آنے سے ایک دن پہلے ہی میں نے کھڑکی اچھی طرح بند کر دی تھی۔ میری پلاننگ بہت عمدہ تھی۔ سلیم کو ذرا شک نہ ہوا، سلیم بڑی بی بی سے مل کر بھی مطمئن ہو چکا تھا۔ اسی لیے شرافت سے دو دن گزار کر واپس چلا گیا مگر کہہ گیا کہ سامان باندھ کر رکھنا، اگلے مہینے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ سلیم کے جاتے ہی میں نے کھڑکی کھول لی۔

☆.....☆.....☆

اشرف سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اب اشرف کے تقاضے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ اب گھر کے اندر آنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے بار بار کہنے پر میں نے اسے موقع دیکھ کر ایک روز گھر میں بلا لیا۔ پھر کیا تھا کیلے جوان مرد اور عورت کے بیچ شیطان کو آتے دیر کتنی لگتی ہے۔ اشرف اب

کارنامہ

شعبان کھوسہ



مغرب سے بھڑکتا ایک شعلہ جس کی آغوش شرق کے ہر گھر میں محسوس کی جائے گی



پاتے ہیں۔ مگر جہاں تک میری اہلیت کا تعلق ہے تو
درحقیقت میرا تعلق نہ پہلی قسم سے تھا اور نہ دوسری قسم
سے۔ میں ذہنی طور پر تلاش ایک ایسی احمق لڑکی تھی
جسے بنے بنائے کام کو بگاڑنا ہی آتا تھا۔ اگر میں اچھے

نا اہلیت کے بھی درجات ہوتے ہیں کچھ لوگ نا
اہل ہوتے ہیں مگر انہیں اپنے آپ..... کو اہل ثابت
کرنے پر ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ کچھ باصلاحیت
افراد زمانے کی ناقدر شناسی کے باعث نا اہل قرار

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھلے خوشگوار دن کا آغاز ناشتے میں تو س جلا کر کرتی تو شام اس طرح ہوتی کہ ٹائم پین میں ضرورت سے زیادہ چائی بھر دینے کے باعث اس کی کمائی چٹ سے ٹوٹ جاتی اور میں اس کی مرمت کرنے کے خیال سے چھوٹے بڑے سارے پرزے نکال کر باہر ڈال دیتی۔

یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ میں اپنی اہلیت سے نالاں اور پریشان تھی۔ نالاں اور پریشان کہنے سے اس خراب حالات کی ترجمانی نہیں کر سکتی جو مجھ پر طاری تھی۔ صبح سے شام تک میں کام بگاڑتی اور اس تصور سے کانپا کرتی کہ ہاورڈ مجھ جیسی لڑکی کو کہاں تک برداشت کرے گا۔ یہ بات بھی ناقابل فہم تھی کہ وہ اپنی اس ناکارہ اور فضول بیوی سے محبت کیوں کرتا ہے جس کے ہر کام میں بھونڈا پن ہے۔ پھو ہڑپنا ہے۔ ہر یہ بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ یقیناً ایک نہ ایک دن قوت برداشت جواب دے جائے گی اور تب اس کی ساری محبت، اتنی شدید ترین نفرت میں تبدیل ہو جائے گی اور اسے میرا نام تک ناگوار گزرنے لگے گا۔

ایک بار جب وہ کسی کاروباری کام سے شہر کے باہر گیا ہوا تھا۔ میں دو دن اور ایک رات تک سردی سے ٹھنرتی اور تاریکی سے لرزتی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے بجلی کا فیوز لگانا نہیں آتا تھا۔ ہاورڈ واپس آیا تو میں ہسٹریائی انداز میں روتی چیختی ہوئی اس کے بازوؤں سے لپٹ گئی۔

”بس بس اہیلی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں گھر آ گیا ہوں۔“

اس نے بڑے پیار سے مجھے تھکتے ہوئے کہا اور اس وقت تک اپنے سینے سے چٹائے رکھا۔ جب تک میری طبیعت بحال نہیں ہوگی۔ لیکن جب کپڑے خشک کرنے والی مشین میں آگ لگی کیونکہ میں اس کے اینٹ اسکرین کو صاف کرنا بھول گئی تھی۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ میں محض اتنی ہی نہیں بلکہ خطرناک طور پر پاگل ہوں۔ ضروری تھا کہ میں فائر ڈیپارٹمنٹ کو فون کرتی لیکن مجھے وہاں کا نمبر معلوم نہیں تھا اور ٹیلی فون نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی۔ میں نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ ایسی صورت میں آپریٹر کو فون کیا جا

سکتا ہے چنانچہ میں نے ہاورڈ کے دفتر میں فون کیا اور جب وہ فون پر آیا تو میں نے رورو کر اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔ فائر مین اور خود ہاورڈ کے آنے سے پہلے پہلے پوری دیوار سیاہ پڑ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے آگ پر بہت جلد ہی قابو پا لیا گیا اور جو کچھ نقصان ہوا۔ وہ میری توقع سے بہت کم تھا۔

”اگر تمہاری بیوی“ فائر مین نے ہاورڈ سے کہا۔ ”صرف پلگ نکال لیتی تو نہ مشین بیکار ہوتی اور نہ دیوار جلتی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تو بھی کو معلوم ہوتی ہیں۔“

ہاورڈ نے جواب دیا۔ ”مگر ہو سکتا ہے کہ دھواں دیکھ کر اس کا دھیان پلگ کی طرف نہ گیا ہو۔ اگر عورتوں سے ایسی بدحواسیاں نہ ہوں تو ان میں اور ہم میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔“

فائر مین نے سنجیدگی سے سر ہلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتیں واقعی بدحواس ہوتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی یاد نہیں رکھ سکتیں۔ وہ دونوں میرے بارے میں اس طرح گفتگو کر رہے تھے جیسے میری موجودگی سے بے خبر ہوں مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں ہمیشہ سے تو ایسی کبھی نہیں تھی۔ میرا لڑکپن اچھی بھلی حالت میں گزرا۔ ہائی سکول میں، میں نے ہمیشہ لڑکوں سے زیادہ نمبر لیے۔ مقابلوں میں کسی لڑکے کی مجال نہ تھی کہ وہ مجھ سے بازی لے جاتا پھر یہ اچانک شادی کے بعد مجھے کیا ہو گیا تھا۔ روز بروز میری حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر مجھ پر مزید گھبراہٹ سوار ہو جاتی تھی کہ اگر کسی روز کوئی حرکت ہاورڈ کو ناگوار نہ گزری تو؟

تو اسی روز وہ مجھے گھر سے نکال باہر کر دے گا۔ لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اسے مجھ سے بہتر بیوی مل جائے گی مگر میں کیا کروں؟ میں تو ہاورڈ پر اتنی منحصر ہو کر رہ گئی تھی کہ تھوڑا عرصہ بھی اس کی پناہ کے بغیر نہیں گزار سکتی تھی۔ مسئلہ غیر معمولی سنجیدگی کا حامل تھا اور میرے سامنے اس کا ایک ہی حل تھا کہ جب بھی موقع ملے اپنی حماقتوں پر جی بھر کے رویا کروں اور دعا کیا

”میں ایک ہفتے کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا۔
ڈیر!“

اور پیار سے میرے بالوں کو بکھیرتا ہوا چلا گیا۔
میں ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح کرسی پر گر گئی مجھے
یوں محسوس ہونے لگا جسے ہاورڈ کے تحفظ کے بغیر ساری
دنیا میرے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی اور میرا جینا دو بھر کر
دے گی۔ پہلے دو دن قدرے سکون سے گزرے غالباً
اس وجہ سے کہ میں نے خوف و دہشت کے باعث گھر
سے باہر جھانک کر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا مگر تیسرے
دن پوری الماری خالی ہو گئی۔ کھانے کو کچھ بھی نہ رہا۔
میں نے مجبوزاً کار نکالی اور سپر مارکیٹ سے ضروری
سودا سلف لانے کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں
اچانک کار کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ میں نے
دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے کار
کوٹ پاتھ کے ایک حصے پر کھڑا کیا اور سوچنے لگی کہ
مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہاں ایک رہائشی علاقہ تھا اور میں
جانتی تھی کہ قریبی سروس اسٹیشن وہاں سے تقریباً چھ
بلاک کے فاصلے پر ہے۔ کیا مجھے پیدل چلنا چاہیے؟
میں نے سوچا مگر اس وقت کیا ہوگا جب میں وہاں اتنا
طویل فاصلہ طے کر کے پہنچوں گی اور سروس اسٹیشن
والے معذرت چاہتے ہوئے کہہ دیں گے کہ کوئی آدمی
خالی نہیں ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ بہتر ہوگا کہ کسی
کے ہاں سے سروس اسٹیشن پر فون کر دیا جائے لیکن کسی
کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجھ جیسی اجنبی لڑکی کو اپنا فون
استعمال کرنے کی اجازت دے؟ اور اگر اجازت مل
جائے تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سروس
اسٹیشن سے کوئی شخص ٹائر بدلنے کے لیے دوڑا چلا آئے
گا۔ ان لوگوں کو ہزار کام ہوتے ہیں۔

مجھے ذہن میں یہ خیال بھی آیا اگر میں پڑوس
کے کسی شخص کو معقول معاوضے کی پیش کش کروں تو
شاید وہ ٹائر بدلنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی صورت
میں معقول معاوضہ کتنا ہونا چاہیے۔ پانچ ڈالر یا دس
ڈالر؟ شاید دس ڈالر سے کم پر کوئی شخص راضی نہ ہو لیکن
دس ڈالر دینے کے بعد میرے پاس کل اتنی رقم بچے
گی۔ جس میں بمشکل ایک وقت کھانا کھایا جاسکے گا۔

کروں کہ ہاورڈ کی محبت کا سائبان ہمیشہ میرے اوپر
سایہ کیے رہے۔ فائر مین کے جانے کے بعد ہاورڈ
تقریباً نصف گھنٹے تک مجھے پیار کرتا رہا۔ اس نے
میرے آنسو خشک کیے۔ کپڑے بدلنے میں میری مدد
کی اور خصوصی برتاؤ کے طور پر مجھے ایک قیمتی
ریستوران میں ڈنر کھلانے کے لیے لے گیا۔ اس قسم
کے موقعوں پر وہ مجھ سے بڑی نرمی اور بے حد محبت کا
سلوک کیا کرتا تھا اور اس کے اسی طرز عمل نے مجھے
کھل طور پر مغلوب کر رکھا تھا۔ اس روز بھی
ریستوران میں اس کی آنکھیں اس وقت تک چمکتی
رہیں جب تک میں نے کھانے کے بعد بیئر کا گلاس
ہاتھ میں لیتے ہوئے نصف سے زیادہ بیئر اس کے قیمتی
سوٹ پر نہ چھلکا دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی
آنکھوں کی چمک غائب ہوئی اور چہرے سے ناگواری
کا احساس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ ایمی ڈارلنگ۔“
اس نے پیار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔
مجھ سے مسلسل حماقتیں سرزد ہوتی ہیں اور وہ
مسلسل مسکرا مسکرا کر میری حماقتوں کو نہ صرف نظر انداز
کرتا رہا بلکہ میرے اس احساس کو بھی پختہ کرتا رہا کہ
اس کے بغیر میری زندگی نامرادی اور ناکامی کا موقع
بن کر رہ جائے گی۔ پھر ایک روز اس نے بتایا کہ اسے
سالانہ کاروباری میٹنگ میں شرکت کے لیے نیویارک
جانا ہے۔ تنہائی کے احساس نے مجھے سر سے پاؤں تک
لرزادیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے پیروں
تلے کی زمین نکلنے والی ہے۔ میں اپنا زیادہ سے زیادہ
وقت ہاورڈ کے ساتھ گزارنے لگی۔ پچھلے چند دن سے
ہاورڈ میرے کمرے کو گرم رکھنے کے لیے آتش دان بنا
رہا تھا۔ میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی اور اسے اینٹوں اور
سیمنٹ سے کھلتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ہاں اس کے
لیے ایک قسم کا تھیل ہی تھا۔ مشکل سے مشکل کام بھی
اس کے ہاتھوں میں پہنچ کر آسان ہو جاتا تھا میں دل
کی گہرائیوں سے ہاورڈ کو پوجتی تھی۔ کتنا عظیم انسان
تھا وہ۔ چند ہی دنوں بعد اس نے مجھے الوداعی پیار
کیا۔ میرے کندھے کو تھپ تھپا کر کہا۔

بستر اور کوئی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ کاش ہاورڈ نیویارک نہ گیا ہوتا۔ مجھے اس کی کتنی شدید حاجت تھی۔ معا میری پشت سے کسی عورت کی آواز آئی؟

”شاید تم کسی پریشانی کا شکار ہو لڑکی؟“ میں نے جلدی سے گھوم کر کہا ”پشک پشک کیا تمہارے شوہر گھر میں ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ بولی ”تاہم ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ خدمت کر سکوں۔“

”شکر یہ!“ میں نے کہا۔ ”مگر مجھے ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو میری کار کا ٹائر تبدیل کر سکے۔“ وہ مسکرائی ”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ذرا جیک تو نکالو۔“ میں نے جیک نکالا۔ اب ان پہیوں کے نیچے کچھ پتھر رکھ دو۔ شاہاش بس جیسے جیسے ہی ہدایات دوں تم ان پر عمل کرتی رہو۔ ڈرو نہیں ایسا کون سا کام ہے جو عورت نہیں کر سکتی۔ سب سے پہلے ہب کیب ہٹاؤ۔ اب اس ریچ سے نٹ ڈھیلے کر دو۔“ میں ایک مسخور شخص کی طرح اس کی ہدایات چون و چرا کے بغیر مانتی رہی۔ تھوڑی سی دیر محنت تو ضرور کرنا پڑی مگر ٹائر بدل گیا۔

”دیکھا تم نے کتنا آسان کام کیا ہے؟“ اس عورت نے مسکرا کر کہا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں حیرت اور خوشی سے اتنی مبہوت ہو گئی تھی کہ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک شکر یہ ادا کرتی رہی۔ پھر خاک و دھول میں اٹی ہنستی ہوئی سپر مارکیٹ گئی اور ضروری اشیاء خرید لائی۔ دن کا باقی حصہ میں نے بڑے جوش و خروش سے گزارا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی نیا جنم لیا ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ سے کسی کام میں کبھی گڑ بڑ نہیں ہوئی ہے۔ میں نے ویکيوم کلیئر کو آپریٹ کیا۔ واشنگ مشین میں کپڑے دھوئے۔ ڈرائر میں کپڑوں کو خشک کیا۔ اپنے لیے کھانا تیار کیا اور کسی دوسرے چھوٹے موٹے کام انجام دیئے کوئی غلطی نہیں، کوئی

بدحواسی نہیں۔ شام سرد تھی اور میں گھڑی بنی ہوئی بستر میں پڑی تھی مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ کاش نیویارک جانے سے پہلے ہاورڈ آتشدان کا کام مکمل کر دیتا۔ میں نہیں جانتی وہ کون سی قوت تھی جس نے ایسا کیا مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اتنا سا کام تو میں بھی انجام دے سکتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ٹائر بدلنے والے واقعہ نے مجھے اعتماد دیا تھا۔ میں میرے یقین کو بحال کر دیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں ہٹائی جا رہی تھیں۔ صرف چند درجن نئی اینٹیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں خالی جگہ میں جما کر آتشدان مکمل کرنا تھا۔ میں ہاورڈ کو کام کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اینٹوں کو کس طرح جمایا جاتا ہے۔ بڑی احتیاط سے میں نے گارا تیار کیا۔ ایک حصہ سیمنٹ، تین حصے ریت اور چار حصے عزم اور آتشدان تیار کرنے کے لیے گھڑی ہو گئی۔ میں نے بہت ہچکچاتے ہوئے کام کا آغاز کیا تھا لیکن چند اینٹیں جمانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ آسان کام تو ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دس دن قبل ایک برف والے ٹیک کی تھیں چڑھاتے ہوئے مجھے جتنی پریشانی ہوئی تھی۔ اینٹیں جمانے کا کام اس کا عشر عشر بھی نہیں تھا حالانکہ دونوں کا اصول ایک ہی تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو محض اتنا کہ اینٹیں مجھ سے تعاون کر رہی تھیں جبکہ برف والے ٹیک نے عدم تعاون پر کمر باندھ رکھی تھی۔ کام کی تکمیل کے بعد میں نے فخریہ طور پر تسلیم کر لیا کہ میرا کارنامہ دیکھنے میں برائیں ہے۔

پھول ہی پھول کھلے ہیں مرے گلزاروں میں۔ گنگناتے ہوئے میں انھی غسل کیا، گرم گرم کوئی تیار کی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی بستر پر چلی گئی۔ مجھے برسوں بعد اتنی روحانی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ہاورڈ مجھ پر فخر کیا کرے گا۔ اس کی محبت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔

چند روز بعد جب ہاورڈ واپس آیا تو میں دروازے ہی پر انتہائی خوشی کے ساتھ اس سے

چہرے سے یہ محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی کوئی بہت ہی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اب سب کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کی حکومت کھو گئی تھی۔ برتری دم توڑ گئی تھی۔ وہ انا ضائع ہو گئی تھی جس کے بل بوتے پر اس نے مجھے بالکل بے قابو اور بالکل بے دست و پا کر رکھا تھا۔ میں اس دستِ مگر نہیں رہی تھی۔ یہ وہ ہاورڈ تھا جو اپنی جھوٹی محبت سے میری صلاحیتوں کو ہڑپ کر گیا تھا۔ جو دل سے چاہتا تھا کہ میں ہمیشہ اس کی باندی بنی رہوں اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مجھے انتہائی نا اہل اور ناکارہ ثابت کرے۔ اس ظالم نے مجھے میری اپنی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میری حماقتوں اور بدحواسیوں کی ساری ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی اور وہ پیار کا اظہار کرتے ہوئے خوشی سے پھولانہ سا ہوتا تھا۔ میری کمزوری اسے طاقتور بناتی تھی۔ میری بیچارگی نے اسے عظمت عطا کی تھی۔ مجھے چل کر اسے تسکین حاصل ہوتی تھی۔

وہ میرا خوبصورت کارنامہ دیکھنے کے لیے جھکا۔
”بدھو ہوا۔ سہلی تم بالکل بدھ ہو ہمیشہ بدھو ہی رہو گی۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ آتشدان کیسے.....“ میں نے قریب پڑا ہوا پھاؤڑا اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کیا ”تم نے کبھی مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ فیوز کس طرح لگانا چاہیے۔“ اور اس روز رات گئے تک ”میں عورت سب سے برتر ہوں مجھے کیا نہیں آتا؟“ گنگلاتے ہوئے میں نے اینٹوں اور گارے کا کام جاری رکھا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب راتوں کو بیرونی مصروفیات کے باعث مجھے آتشدان کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چنانچہ میں بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اس میں اینٹیں چن کر اسے بند کرنے میں مصروف رہی۔ میں نے یہ کارنامہ بھی انتہائی خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا تھا اور حقیقت میں اس طرح میرے اس کارنامے نے میری اور ہاورڈ کی رشتے داری پر خوب پکا اور کبھی نہ اکھڑنے والا سینٹ پھیر دیا۔

☆☆.....☆☆

لیٹ گئی۔
”ارے ڈیر! تم تو بڑی عظیم نظر آرہی ہو۔“ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں چھپالیا۔
”معلوم ہوتا ہے میری غیر موجودگی میں رات دن سوتی ہی رہی ہو۔“
”نہیں نہیں یہ بات نہیں۔“

میں نے پراسرار انداز اختیار کرتے ہوئے کہا
”حقیقت میں بہت ہی زیادہ مصروف رہی۔“
لیکن میں زیادہ عرصے تک سسپنس برقرار نہ رکھ سکی اور ایک چھوٹے سے بے چین بچے کی طرح اس کا ہاتھ چبھتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ مکمل آتشدان کو دیکھ کر ہاورڈ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا،
”اسہلی“ اس نے کہا۔

”خواہ مخواہ مزدوروں کو بلا کر رقم ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔“
”تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سارا کام میں نے انجام دیا ہے۔“
وہ ہنس پڑا۔

”یہاں بازی چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کتنی رقم خرچ ہوئی۔“

”سچ بچ ہاورڈ، کام میں نے ہی کیا ہے اور یہی نہیں میں نے کار کا ٹائر بھی بدلا ہے اور ٹیس کے سارے چولہوں کو کھول کر ان کی صفائی بھی کی ہے۔“
میں چڑیا کی طرح چھپا کر بولی۔

”ناممکن ہے تم کبھی کوئی کام درست نہیں کر سکتیں۔“ اس نے کہا وہ اب بھی مضحکہ خیز انداز میں ہنس رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں میری آنکھوں میں خدا جانے اسے ایسی کیا چیز نظر آئی کہ اس کا منہ لٹک گیا۔ بادل ناخواستہ اس نے میری بات تسلیم کر لی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری محبت ساری ہمدردی کا فور ہو گئی وہ نفرت بھرے انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

تم۔ تم۔ تم۔ احمق۔ احمق اور بیوقوف لڑکی۔۔۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔“ اس کی آواز میں حقارت چھپی تھی۔

تیسرا شعلہ

ندامت

مریم مہربان ملک

حسن کے نشے میں پورا اس حسینہ کا قصہ عبرت جو آج بھی اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے

ڈھولک بھی بج کے رک گئی۔ ادھر تیری تیاری ہی ختم نہیں ہوئی۔“ امی مجھے مسلسل آوازیں دے رہی تھیں۔ اور میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا حسن سنوار رہی تھی۔ امی کی آوازوں سے تنگ آ کر میں بولی۔

”ارے اماں تیری بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ ٹکڑا تیاری نہ بھی کرے تب بھی بے بہا خوب صورت ہے۔“ اُف میرا یہ حسن میں اگلائی کتنی ہوئی بولی۔

بڑی شان دار اداؤں سے بال لہرائی ہوئی میں اماں کے ساتھ چلنے لگی۔ اماں نے بڑی تیزی سے رک کر کہا۔ ”ایسے ننگے سر کہاں چلی۔ پگلی جا جا کر چادر لے کر آ۔“ اماں ڈانٹتی ہوئی بولی مگر اس کے برعکس میں کسی کی سنتی کب تھی۔

خدا نے حسن تو دیا ہی تھا ساتھ مجھ میں نزاکت کی بھی فراوانی تھی۔ اور میں مست ہرنی کی طرح لہرا لہرا کے چل رہی تھی۔ ادھر شادی والے گھر میں خوب رونق تھی اور میں شادی والے گھر میں اترا اترا کے چل رہی تھی۔ شادی میں عام سی نین نقوش والی لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اپنے حسن پر ناز ہو رہا تھا۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں خوب ہنسنے لگی اور بلند آواز میں اماں کو آواز دینے لگی۔

میں فقط زندگی کو زندہ لاش کی طرح جی رہی ہوں۔ زندگی کے کورے کاغذ پر محبت کے رنگ بکھرے تھے۔ وہاں پر میں نے نفرتوں کی تصویر بنائی۔ میں نے خود ہی اپنی قسمت پر کالی سیاہی کے چھینٹے پھینک دیے، کسی مظلوم کی آہ اور بددعا نے مجھے آسمان سے زمیں پر لا پھینکا اور میں بربادیوں کی پاتال میں گرتی چلی گئی۔ بے پناہ دولت، بے انتہا حسن، ماں باپ کے لاڈ پیار نے غرور و تکبر کی اعلیٰ صف میں لاکھڑا کیا۔ جہاں مجھے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہتے ہیں غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ ہاں میں غرور و تکبر کی سزا پارہی ہوں۔ میں کبھی اپنے ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔

آج میں ایک چھوٹے سے بدبودار کمرے میں اپنی پھیلائی گندگی پر بیٹھی سڑ رہی ہوں۔ مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں کہ دو گھونٹ پانی ہی پی لوں کہ گلا خشک ہونے کی وجہ سے آواز بھی نہیں ک نکل رہی، آواز جیسے گلے میں چپک سی گئی ہو۔

اور نہ جانے کب تک اپنی بنائی جہنم میں جلتی رہوں گی۔

ثریا اوثریا! بیٹا جلدی کرنا تم دیکھو ہاں مہندی کی

Downloaded From Paksociety.com

ہم بچپن سے ایک ساتھ لے پڑھے ایک ساتھ ہی پڑھے میں آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ فردوس میری اماں اور آفرین آذر کی ماں دونوں بہنوں میں بھی بے انتہا پیار تھا۔ میری اور آذر کی محبت نے اس چاہت کو اور بھی گہرا بنا دیا۔

بارات والے دن میں نے اپنی چوٹس پر گرین رنگ کا سوٹ پہنا، سوٹ میں بڑی نقاست سے میں آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی۔ بارات آچکی تھی۔ تمام مہمانوں کی نظر مجھ پر اور آذر پر تھی۔ ہم دونوں کی جوڑی دیکھ کر ہماری محبت کو داد دے رہے تھے۔ لوگوں کی تعریفیں سن کر میرے غرور کو اور ہوا ملی۔

میں باراتیوں کو ویلکم کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں ایک معذور عورت جو سانولے رنگ کی تھی۔ اس کا نام چاندنی تھا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئی۔

ارے او ماں۔ چل مجھے گھر چھوڑ آ یہ کہاں لے آئی ہے تُو مجھے۔ کالی کلونی لنگڑی لولی عورتوں کے درمیان میرا کیا کام۔“

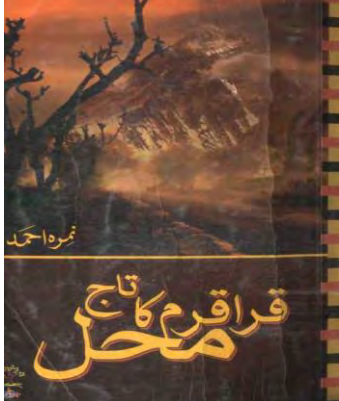
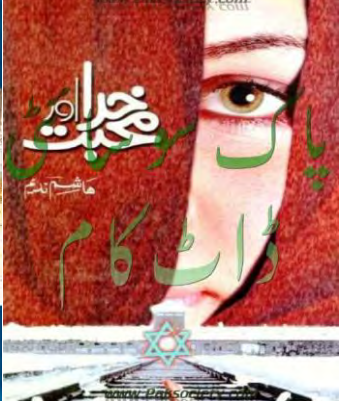
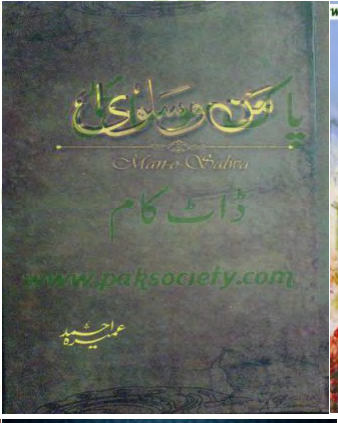
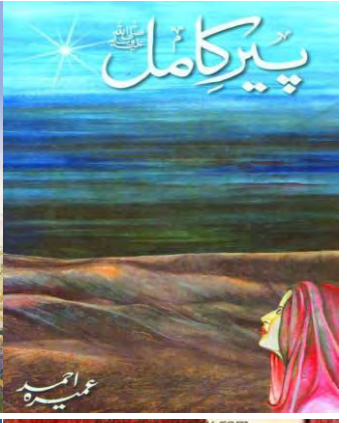
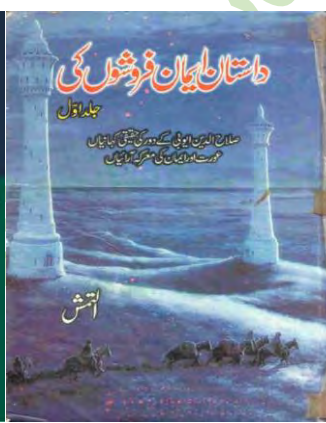
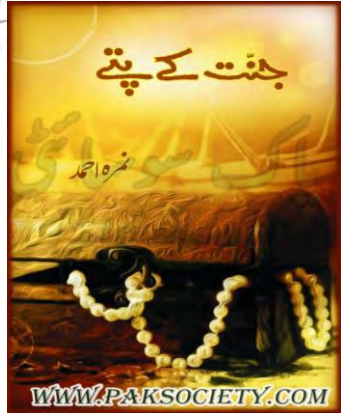
پاس ہی چار پانی پر ایک معذور جواں لڑکی بیٹھی تھی۔ نہایت ہی ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”نا لڑکی خدا کا خوف کر۔ خدا کی لاشی بے آواز ہوتی ہے۔ یہ مصیبت تجھ پر بھی آ سکتی ہے۔“

اور میں گاؤں کی اس معذور لڑکی کا مذاق اڑاتی ہوئی بولی۔ ”چل جا بھلا رب خدا میرا کچھ لگاڑے گا۔ دیکھ ذرا میں کتنی سوہنی ہوں۔“ ڈھولک کی تھاب پر دہن کے ہاتھوں میں مہندی رچنے لگی میں آذر کی یادوں میں گم ہو گئی۔

آذر اور میں دونوں خالہ زاد کزن تھے اور بچپن سے ہی ہم ایک دوسرے کے نام سے منسوب تھے۔ اگر مجھے کسی سے محبت تھی تو صرف آذر سے ہی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



www.paksociety.com

پر آگئے تھے۔ آذر نے دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے میری دھڑکنیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

آذر نے میری ٹھوڑی پکڑ کر میرا سرا پر کیا میں شرمائی۔

”ثریا آج تو تم دلہن بنی چودھویں کا چاند لگ رہی ہو۔ جیسے سارے حوروں کا حسن تم پر آ گیا۔“

آذر کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ آذر نے مجھے بانہوں میں بھر لیا۔ مجازی خدا کی بانہوں میں آ کر میں خود بیگانہ سی ہو گئی۔

آذر فروٹ کا کاروبار کرتا تھا اور ساتھ ہی ان کے ذاتی ڈیری فارم بھی تھے۔ کافی خوشحال گھرانہ تھا۔ آذر کے گھر میں، میں ملکہ بنی پھرتی تھی۔ نوکروں پر خوب رعب جھاتی، گھر کا کام سچ نہ کرنے پر خوب انھیں بے عزت کرتی، ہماری شادی کو پانچ سال ہونے کو تھے۔ مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی کوئی امید بر نہیں آئی۔ آذر کا رو بار کی وجہ سے کم ہی ٹائم نکال پاتے تھے۔ گھر کے نوکر میرے پاس آنے سے گتراتے تھے۔ آہستہ آہستہ میں تنہائی اور مایوسی کا شکار ہونے لگی۔ آذر کو کئی دفعہ کہا میرے لیے وقت نکالو میں گھر میں اکیلی بیٹھی بوری ہوتی ہوں۔“ آذر نے بے زاری سے ڈانٹ کر کہا۔

کیا تمہیں اپنے سر پر بیٹھا کر گھماتا پھروں، لاکھوں کام کرنے ہوتے ہیں۔ تمہیں سنبالوں یا کہ کاروبار کو۔“

آذر کی باتیں تیر کی طرح دل میں پیوستہ ہو گئی اور دیر تک اپنی قسمت پر روتی رہی۔

میں پچھلے کئی گھنٹوں سے آذر کا انتظار کر رہی تھی۔ رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آذر دیر سے سہی پر ضرور آ جاتا تھا۔ پر آج اتالیٹ..... اللہ خیر کرے میرے دل میں دسو سے اٹھنے لگے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے فون رسیو کیا۔ دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

”آپ مسز آذر ہیں۔“

میں نے حقارت بھری نظر اس پر ڈالی اور بولی۔

”او باجی چل پرے ہٹ۔ تیرا نام تو کسی نے غلطی سے چاندنی رکھ دیا ہے پر تو کالی اندھیری لگ رہی ہے۔“ پاس ہی نازک سے بچی اماں، اماں کہتی ہوئی اس عورت کے گلے لگ گئی۔ میں زور سے ہنسنے لگی۔ اور زور سے بولی۔

ارے واہ۔ اولاد بھی کالی۔“ چاندنی نے قدرے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”لڑکی یہ تو خدا کے کام ہیں۔ خدا کے کاموں میں دخل اندازی نہ کر، خدا کی لاشی بے آواز ہوتی ہی کسی دن چل گئی تو، تو کہیں کی نہیں رہے گی۔“

شادی کے جن جنم ختم ہو چکے تھے۔ اور میں واپس گھر آ گئی۔ گھر واپس آ کر اپنی روٹین میں آ گئی۔

سارا دن آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا حسن سنوارتی رہتی۔ اور آئینے کے سامنے بیٹھی بہت سی باتیں کرتی۔ خود ہی اپنی تعریف کرتی اور خود کو داد دیتی۔ میں صبح کو ناشتا کر رہی تھی۔ دروازے پر ایک فقیر نے صدا لگائی۔

”اللہ کے واسطے روٹی دے بابا بھوکا ہوں کئی دنوں سے۔“

میں غصے سے ناشتے سے اٹھی۔ اور دروازے پر کھڑے فقیر کو اچھی خاصی شادی۔

”اوہ تم۔“ فقیر نے یہ سن کر بلند آواز میں بددعا۔ ”جاٹو بھی اس کاروبار کا حصہ بنے۔“ فقیر مجھے بددعا دیتے جانے لگا تو میں فقیر پر چیختے ہوئے کہنے لگی۔

مجھے کچھ نہیں ہو سکتا تم جیسوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔ ایک چھوڑ کے دس بددعا میں دے میری جوتی کو۔“ یہ کہتی ہوئی میں شیرنی کی طرح غراتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔

20 فروری کا شام میں بھری اداؤں کے ساتھ حسن برساتی آذر کے گھر آ گئی۔ دلہن بنی کمرے میں بن سنور کر بیٹھی تھی آسمان کے ستارے جیسے زمین

اسی طرح میں نے ایک فقیر کو اپنے گھر سے بے عزت کر کے دھکا دیا تھا آج وہی سب کچھ میرے سامنے آ رہا تھا۔ آج اسی فقیر بابا کی بددعا سے میں اسی کاروبار کا حصہ بن گئی تھی۔

ان کی بددعاؤں سے در در کی ٹھوکریں میرے نصیب میں لکھ دی گئی ہیں۔ کبھی بھی کسی کو حقیر یا کم تر نہ جانو کہ بادشاہ کو فقیر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ جب خدا --- پڑتا ہے تو دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

ایک دن فٹ پاتھ پر بیٹھی بھیگ مانگ رہی تھی کہ کچھ آوارہ لڑکوں نے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے مجھے نکر مار دی گاڑی کی زوردار نگر سے میں دور جاگری میں شدید زخمی حالت میں سڑک پر پڑی رہی۔ کسی خدا ترس رکشے والا خدا کا خوف کرتے ہوئے خیراتی ہسپتال کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ کئی دنوں تک خیراتی ہسپتال میں پڑی رہی تو ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ سڑک پر آگئی۔ کئی دنوں فاقہ کشی کے بعد میں کافی کمزور ہو گئی تھی چلنے پھرنے سے رہ گئی تھی کہ قریبی رشتے داروں نے سڑک پر بھیگ مانگتے ہوئے دیکھ لیا، تو وہ سڑک سے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے اور مجھے اپنے گھر کے ایک سائیڈ روم میں ایک چھوٹا سا کمرہ دے دیا۔

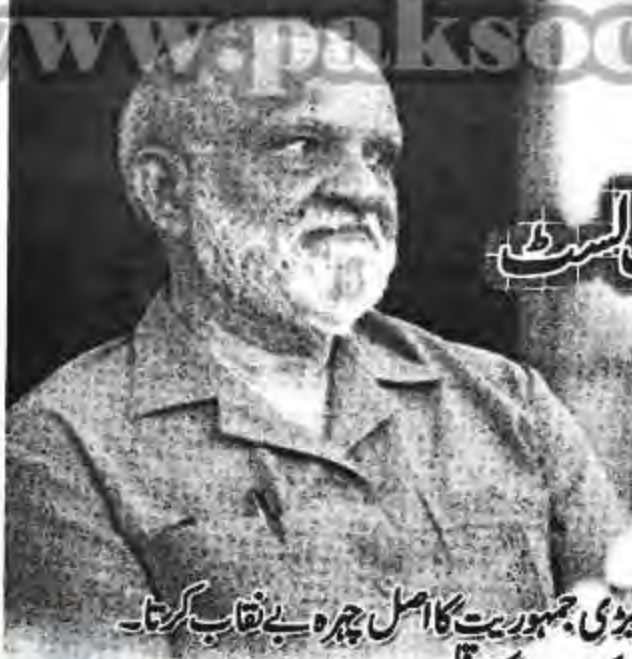
کچھ دن تک تو وہ روٹی کھلاتے رہے لیکن آخر کب تک۔ آہستہ آہستہ آخر وہ بھی مجھے بھول گئے اور میں اب ایک بے یار و مددگار زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔

اپنے کے برنامہ ہوں کہ میں غرور و تکبر میں آ کر یہ بھول گئی تھی کہ خدا کی لاشی بے آواز ہوتی ہے۔ اللہ سے رورو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں کہ یا اللہ مجھے جلد اپنے پاس بلا لے مجھ میں زیادہ دکھ سہنے کی طاقت نہیں اور میں اپنے کیے کی سزا پارہی ہوں۔

☆☆☆

”جی میں سزا آؤر بول رہی ہوں۔ میں میٹل ہسپتال سے ڈاکٹر خرم بول رہا ہوں۔ آپ کے شوہر کو گولیاں لگی ہیں اور ان کی لاش ہسپتال میں ہے۔ آپ ضروری کارروائی کے بعد لاش لے جاسکتی ہیں۔“ فون رسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں گرتی پڑتی ہسپتال پہنچی تو آزر آنکھیں بند کیے ہوئے سوئے تھے۔ ڈاکٹر کو گھر آتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر کے، گاڑی اور نقدی چھین کر لے گئے اور میری دنیا ہی اجاڑ دی۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش میرے حوالے کی۔ آزر تو شہر خوشاں چلے گئے مگر مجھے دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ آزر کے جاتے ہی ان کے بھائیوں نے اپنی اصلیت دکھانا شروع کر دی۔

سب سے پہلے دیوروں نے مجھے گھر سے بے دخل کیا۔ ماں باپ پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا اور میں سڑک پر آگئی۔ کئی دنوں تک فاقوں میں رہنے کے بعد جب سخت بھوک لگی تو بھیگ مانگنے پر مجبور ہوئی۔ پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھانے کے لیے کئی سالوں تک بھیگ مانگتی رہی۔ بھوک پیاس، سارا دن سڑک پر پڑا رہنے کی وجہ سے چہرے پر گرد مٹی کی ایک تہہ سی جم گئی۔ کبھی جو مجھے اپنے حسن پر ناز ہوا کرتا تھا۔ وہ حسن باقی نہیں رہا۔ ایک سردشام میں سردی اور بھوک سے تنگ آ کر میں نے ایک گھر کی چوکھٹ پر دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا اور مجھے دروازے پر ہاتھ پھیلائے دیکھا تو مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا شرم نہیں آتی بھیگ مانگتے ہوئی۔ منہ اٹھا کر بھیگ مانگنے چلی آتی ہو۔ اچھا کاروبار کھولا ہوا۔ بھیگ مانگنے کے بہانے گھر میں تاک جھانک کرتی ہو اور بعد میں اپنے عاشقوں کو بلا کر گھر کا صفایا کرتی ہو۔ چلو نکلو یہاں سے کوئی خیرات نہیں ہے۔ داتا دربار سمجھ رکھا ہے۔“ لڑکی سے یہ سن کر مجھے اپنا ماضی یاد آ گیا۔



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامہ بھارت

نواں حصہ

لے جاتے ہیں۔ سز توش بھی مجھے اپنی نظموں کی
کتاب پیش کرتی ہیں۔ وہ پنجابی میں خوب صورت
آزاد نظمیں لکھتی ہیں۔

دونظمیں ذرا ملاحظہ ہوں:

گلاس بر چھاں دا جوڑا

بھریا، لدیا، ججیا،

گلابی، لال، عنابی گلاساں نال

ترکاں دی، ڈھپ وچ لشکدے

گوہڑے، ہرے، چٹیاں نال ڈھکیا

جیویں کوئی، اچالماں گھبرو، کوئی لاہڑا

مکت، سنہری جھالراں، پھل سہرا، پٹکا پائی

مشالاں والی، واجیاں والی، پہاڑی جج لے

جھم جھم کردی لاڑی نوں ڈولی جج پائی

گھوڑی چڑھ

اپنے گراں نو چلیاں ہووے

☆☆

آج پر بھاتے

بدلاں وچوں

لکدیاں تھپدیاں

بلراج ساہنی آج کل فلموں میں اداکاری بہت
کم کر رہے ہیں۔ کتابیں لکھ رہے ہیں۔ ایک کتاب
ہندی میں 'یادیں' مجھے پیش کی ہے۔ وہ ہندوستان
کی تمام زبانوں کے لیے روشن رسم الخط کی تحریک
چلا رہے ہیں۔ اس طرح ان کے خیال میں زبانوں
کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اسٹیج ڈراموں میں بھی کام
کرتے ہیں۔ بمبئی میں اسٹیج ڈرامے بہت مقبول
ہیں۔ مہاراشٹر زبان میں ڈرامے نے بہت ترقی کی
ہے۔ ایک اسٹیج آرٹسٹ کا نام کچھ مشکل سا ہے۔ وہ
اکیلا تین تین گھنٹے تک اسٹیج پر اداکاری کرتا ہے اور
لوگوں کو مسلسل محظوظ کرتا ہے۔ ڈرامے کا اسکرپٹ
بھی خود ہی لکھتا ہے۔ ہدایت کاری بھی خود کرتا
ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہے بلکہ
ڈرامینک سوسائٹی ہے۔ شہر میں اس ڈرامے کے سینئر
بھی نگے ہوئے ہیں۔ اس ایک آدمی کے ڈرامے
کے لوگ اتنے شیدائی ہیں کہ روزانہ ہال فل رہتا
ہے اور ڈرامہ کئی کئی مہینے چلتا رہتا ہے۔ میرے
میزبان یہ کہتے ہوئے کہ مہاراشٹر زبان میری سمجھ
میں نہیں آئے گی، اس لیے وہ مجھے ڈرامے میں نہیں

ہمارے ساتھ پھر ایک گائیڈ لیکچر ہے۔ یہ لائیں
 ایک مسلمان کی ہیں۔ محمدی لائج سروس، گائیڈ لیکچر
 بھی لائج کمپنی فراہم کرتی ہے۔ دو لائیں ساتھ
 ساتھ چل رہی ہیں جو اس گائیڈ لیکچر کی ذمہ داری
 میں ہیں۔ دونوں لائچوں میں غیر ملکی زیادہ ہیں۔ وہ
 بھی سفید قام، کچھ ٹورسٹ ہیں، ٹورسٹ لڑکیاں
 نوٹ بک میں تیزی سے لکھے جا رہی ہیں گائیڈ لیکچر
 کچھ دور دو لائچوں کو رکوا کر ان غاروں کے بارے
 میں بتا رہے ہیں کہ یہاں آپ کو نہ ہاتھی ملیں گے اور
 نہ غار۔ یہ ایک جزیرہ ہے۔ انسانوں نے خود یہاں
 پہاڑ کاٹ کر یہ مندر بنایا تھا۔ بہت اونچائی پر چڑھنا
 ہے۔ بوڑھے لوگوں کے لیے کہاں کھڑے ہیں
 بانسوں سے بندھی کرسیوں پر بٹھا کر اوپر لے جانے
 کا انتظام ہے۔ چار کہاں انہیں اٹھاتے ہیں۔ پانچ
 روپے ایک مرتبہ کے ہیں۔ انسان انسان کو اوپر اٹھا
 لے کر جاتا ہے اور پیٹ پالتا ہے۔ غار میں دیوی
 دیوتاؤں کے بڑے بڑے بت بنے ہوئے ہیں فن
 کے لحاظ سے یہ بہت عمدہ ہیں۔ چینی اور ہتھوڑی سے
 پہاڑ کو کاٹ کاٹ کر یہ فن پارے ابھارے گئے
 ہیں۔ گائیڈ لیکچر ہندو دیو مالا کے حوالے سے اپنے
 ان بھگوانوں کی تشریح کر رہا ہے۔ کہانیاں سنا رہا
 ہے۔ اندر گرمی بہت ہے۔ غیر ملکی سیاح بڑی دلچسپی
 سے یہ حکایات سن رہے ہیں۔ اس روشن خیالی کی
 صدی میں دیو مالائی کی کہانیوں میں اتنی دلچسپی۔ یہ
 بھی زندگی سے ایک فرار ہی تو ہے۔ کئی کئی ہاتھوں
 والے دیوتا اور دیویاں آگ، پانی، بارش، غلے، بجلی
 کے دیوتا۔ ان غاروں کے بارے میں سرکاری
 طور پر چھپی ہوئی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ وقت کم ہے۔
 ورتہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اجنا اور فلورا غاروں کی
 طرف بھی مجھے جانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں میرے
 لیے اتنی ہی سیر کافی ہے۔ آج اتوار ہے اور کچھ بھی
 نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سات بجے مجھے دہلی روانہ ہونا
 ہے۔ سواپنے ہوٹل لوٹتے ہیں۔ ٹھنڈے کمرے میں

برف نہاتیاں
 ریشماں آئیاں
 تن نال لکیاں
 جیوں پہلاں اُتے سدیوں
 سچا سچا پیار
 شگوفے دے کے گلابی پھل
 اچے جھڑے دی نہیں سن
 کہ
 ہنچھو بھر نیلے بدل
 آسماں وچ ذول پے

یہ پنجابی لوگ جو محبت کے بھوکے ہیں کاش
 ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسائل سلجھانے
 کے لیے کچھ زوردار کوششیں کریں کیونکہ جنگ
 چھڑتی ہے تو خون دونوں طرف پنجاب میں ہی بہتا
 ہے اور آگ بھی پنجاب میں ہی لگتی ہے۔ جذباتی
 محبت چھوڑ کر اپنی سیاسی بصیرت کو استعمال کریں۔
 میں بلراج کے خاندان سے رخصت ہو رہا
 ہوں۔ کون جانتا ہے کہ پھر ملاقات ہو یا نہیں، کرشن
 چندر بھی قریب ہی رہتے ہیں انہیں گھر چھوڑتے
 ہوئے ہم واپس ہوٹل آرہے ہیں۔ آج کل بمبئی
 میں بھی شادیوں کا موسم ہے۔ اس ہوٹل کے ہال
 بھی شادیوں کے لیے بک ہیں۔
 صبح مجھے ان لوگوں نے ”ایلی فینٹس کیو“،
 ”ہاتھیوں کی غار“ دکھانے کا پروگرام بنایا ہے۔ صبح
 پھر کافی فاصلے طے کر کے ہم گیٹ وے ٹوانڈیا پہنچتے
 ہیں۔ سامنے تاج محل انٹرکانٹی نینٹل ہے۔ پرانا حصہ
 بھی اور نیا حصہ بھی۔ کیمٹری کی یاد آرہی ہے۔
 لائیں مسافروں کو لے کر جا رہی ہیں۔ گیٹ وے نو
 انڈیا تاریخی دروازہ ہے۔ برطانوی بادشاہ پہلی
 مرتبہ ہندوستان آیا تو اس کا جہاز یہیں لنگر انداز ہوا
 تھا۔ بحیرہ عرب، کراچی کو بھی یہی سمندر چھوتا ہے۔
 یہی لہریں میرے وطن تک بھی پہنچتی ہوں گی۔ یہ
 ایٹمی ری ایکٹر نظر آرہا ہے۔ ایک گھنٹے کا سفر ہے۔

اطمینان سے سوتا ہوں۔ میں سبھی سے روانہ ہو رہا ہوں۔ جس میں کافی کراچیت مل رہی ہے۔ روشنی، ٹھنڈی ہوا، سڑکوں پر چڑھی سڑکیں، ساتھ ساتھ سمندر، سمندر کے کنارے کھڑی فلک بوس بلڈنگیں، جیسے خودکشی کے لیے سوچ رہی ہوں۔ سائنس کروڑ ایئر پورٹ، انڈین ایئر لائنز، مرکز کے ایک ڈپٹی منسٹر بھی اس جہاز سے جا رہے ہیں اس لیے مجھے بھی وی آئی پی الوداع مل جاتا ہے۔ سرکاری افسران کے ساتھ ساتھ مجھے بھی الوداع کہہ رہے ہیں۔ انڈین ایئر لائنز میں اب کے کھانا بھی مل رہا ہے مگر ایئر ہوسٹس ویسی ہی بور ہیں۔ پالم ایئر پورٹ، اسٹو کا ہوٹل، کمرہ میں دو کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب 265 ملا ہے۔

بنگلہ دیش ہائی کمیشن میں

صبح مجھے وزارت خارجہ کے سیکریٹری سے ملنا ہے۔ کیوں سنگھ..... وہ پاکستان میں بھارت کے ہائی کمیشنر بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے میری ملاقات دہلی میں متعین غیر ملکی اخباری نمائندوں کی طرف سے دیے گئے لنچ میں بھی ہو چکی ہے۔ ان سے معرکہ رہے گا۔

میں اس سے پہلے بنگلہ دیش ہائی کمیشن سے فون پر بات کر چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے مشرقی پاکستان بھی ہو آؤں، جسے لوگ اب بنگلہ دیش کہتے ہیں۔ دیکھوں کہ ڈھا کے پر کیا گزری۔ موتی جھیل کو کیا ہوا، رمن پارک میں اب کیا رونقیں ہیں۔ کے جی بھائی کیا کرتے ہیں۔ موتی صاحب کیسے ہیں۔ بنگلہ دیش ہائی کمیشن کا نمبر ان فون ڈائریکٹریوں میں تو نہیں ملتا، جو ہوٹل میں دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری اور ٹیلی فون کے سلسلے میں بھارت پاکستان سے بہت پیچھے ہے۔ ہمارے ہاں سال میں دو مرتبہ ڈائریکٹری تیار کی جاتی ہے ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ نمبر انکو آری سے حاصل کر کے فون کرتا ہوں۔ وہ لوگ اگلے روز فون

کے لیے کہتے ہیں۔ میں انہیں اپنا مدعا بیان کر دیتا ہوں۔ آج کچھ وقت بھی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ آج بنگلہ دیش ہائی کمیشن ہو آؤں۔ دیکھوں کیسا ہے؟ ایک پاکستانی سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ دشمن ملک میں اپنے ایک تازہ دشمن (جو کل تک ہمارے بھائی تھے) کے سفارت خانے میں جانا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جاؤں۔ ذہن کہتا ہے کہ نہیں جانا چاہیے۔ پھر سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے بھائی ہی ہیں۔ روٹھ گئے تو کیا ہوا۔ بہر حال میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں کہ بنگلہ دیش ہائی کمیشن کی طرف چلو۔ اسے معلوم ہے کہ ہائی کمیشن کدھر ہے۔ کراچی کے سوسائٹی جیسے علاقے اسٹیشن ایریا میں میں روڈ پر ہی بنگلہ دیش ہائی کمیشن ہے۔ پرچم لہرا رہا ہے۔ میں گاڑی باہر رکھواتا ہوں، عمارت کا جائزہ لیتا ہوں۔ مختصر سی عمارت، پھانگ پر چوکیدار سے پوچھتا ہوں۔ استقبالیہ کدھر ہے؟ وہ اندر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہوں۔ اگلے ہاتھ صوفے پڑے ہیں۔ ان پر ایک غیر ملکی تشریف فرما ہیں۔ سامنے استقبالیہ پر ایک اور صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے اگلے ہاتھ دیوار پر دروازے کے عین اوپر شیخ مجیب الرحمن کی تصویر لگی ہے۔ میں بنگلہ دیش کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔ استقبالیہ پر مامور ”بنگالی بابو“ سے انگریزی میں کہتا ہوں۔ مجھے پریس اسٹیجی مسٹر امیر الاسلام سے ملنا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں۔“ میں بلا تامل کہہ رہا ہوں۔ ”پاکستان سے۔“ بنگالی بابو ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے۔ ”اشلام علیکم۔“ میں بھی اسی گرمجوشی سے ہاتھ ملتا ہوں۔ ”علیکم السلام۔“ یہ میز ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ یہ حائل نہ ہوتی تو اب تک مشرقی اور مغربی پاکستان بغل گیر ہو چکے ہوتے۔ یہ میز نہ جانے کب سے حائل ہے اور کب تک حائل رہے۔ میں سوچ کیا رہا تھا اور ہو کیا رہا ہے۔ وہ اسی محبت گرمجوشی سے مجھے ایک کمرے کی

طرف لے جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ہے۔ جسے میں محسوس کر سکتا ہوں۔ نام نہیں دے سکتا وہ دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے ایک بنگالی نوجوان افسر بڑی بڑی قلموں اور بالوں والا بیٹھا ہے۔ ان صاحب سے وہ بنگالی میں بتاتا ہے کہ یہ پاکستانی صحافی ہیں۔ مسٹر امیر الاسلام سے میں فون پر بات کر چکا ہوں۔ اس لیے انہیں یاد آ جاتا ہے، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے ہاتھ ملاتا ہے۔ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھنے ہاتھ پڑے کالے صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں بھی قریب بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا حال ہے۔ آپ کراچی میں ہوتے ہیں، پنڈی میں، کراچی کیسا ہے۔ میں کراچی میں ہی ہوتا تھا۔ فارن انٹیرز میں۔“

ہم باتیں کر رہے ہیں۔ ایک ڈپلومیسی، ایک ذہنی تحفظ، درمیان میں حائل ہے۔ نہ میں پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا تھا کیوں ہمارے خلاف ہو گئے۔ نہ وہ پوچھتے ہیں کہ آپ اب ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ہائی کمیشن کے ایک اور نوجوان افسر بھی آ جاتے ہیں۔ وہ شاید کمرشل شعبہ سے منسلک ہیں۔ انہیں بھی کراچی یاد آ رہا ہے۔ ”اخبار جہاں“ یاد آ رہا ہے۔ اس کے سرورق یاد آرہے ہیں۔ اپنے کچھ ساکھی صحافیوں کا پوچھتے ہیں کچھ دوستوں کا۔ اسی اثناء میں روزنامہ ”سن“ کے ڈھا کہ میں سابق نمائندے عطاء الصمد اور آج کل بنگلہ دیش کی سرکاری نیوز ایجنسی کے دہلی میں نمائندے آ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مارننگ نیوز کے مسٹر خطیب بھی ہیں۔ ان سے میں ڈھا کہ میں ملا تھا۔ فوجی کارروائی کے بعد بھی یہ مورنگ نیوز ڈھا کہ میں کام کر رہے تھے۔ صحافیوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ عطاء الصمد پی ایف یو جے کے سرگرم رکن ہوتے تھے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اب کے انتخابات کیسے رہے۔ کون کون منتخب ہوا ہے۔ بتایا کہ کے جی بھائی وغیرہ کچھ روز پہلے ایشیا اسمبلی میں شرکت کے لیے

آئے تھے۔ میں بنگلہ دیش کے ہائی کمیشن میں بیٹھا ہوں۔ بنگلہ دیش جو کل تک ہمارا ہی حصہ تھا۔ ہمارا بھائی تھا مگر اب ہمارا تازہ ترین دشمن ہے یہ سفارت خارجہ ہمارے مستقل دشمن کی سر زمین میں ہے اوز میں واحد پاکستانی ہوں۔ یہ لوگ کیسے کھل مل رہے ہیں۔ پاکستان کی یادیں کیسے ستا رہی ہیں۔ تاریخ کتنی ظالم ہے۔ وقت کتنا سنگمگر ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا ہے۔ سیاسی حد بندیوں نے کتنے انسانوں کا خون پی لیا ہے۔ آپ چائے پیئیں گے یا ٹھنڈا۔ چائے ٹھیک ہے، چائے آرہی ہے۔ یہاں دنیا کا جو نقشہ لٹک رہا ہے اس میں بھی مشرقی پاکستان ہی چھپا ہوا ہے۔ اپنے ہاتھ سے اسے کاٹ کر بنگلہ دیش نکھرا ہوا ہے۔ یہ نوجوان آفسر، شاید اتنی جلدی اتنے بڑے عہدے پر نہ پہنچتے اگر بنگلہ دیش نہ بنتا۔ بنگلہ دیش کے قیام کی جدوجہد ان ہی لوگوں کی تو تھی۔ متوسط طبقے کی۔ ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کی۔ غریب پرولتاریوں کو ملک بنانے کی فکر کہاں ہوتی ہے۔ انہیں تو روٹی چاہیے، پاکستان تھا تب بھی انہیں مشکل سے روٹی ملتی تھی اور اب تو ان کے لیے روٹی اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ ملک بنتے ہیں، نوٹے ہیں، یہ ہمیشہ ٹوٹے رہتے ہیں۔ ملک بنتے ہیں تب ان کی بنیادوں میں پرولتاریوں کا خون دیا جاتا ہے۔ ٹوٹتے ہیں، تب ان کا خون بہتا ہے۔ چائے آئی ہے۔ مشرقی پاکستان کے جانے کے ساتھ ساتھ چائے بھی چلی گئی۔ ”میں پان نہیں کھاتا۔“ وہ پان کا پوچھ رہے ہیں۔ پان بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں نے باقاعدہ طریقے سے مشرقی پاکستان جانے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لیے بھی ویزا اور کار ہوگا۔ پاکستانی پاسپورٹ لے کر وہاں جانا پڑے گا۔ تاریخ ہمارا مذاق اڑاتی ہے، کمزور قوموں کے ساتھ تاریخ بھی تو ستم ظریفیاں کرتی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آج ہم ڈھا کے ٹیلیکس بھیج دیں گے کل یا پرسوں تک

میں پنجابی میں شروع ہو گیا۔ کیول سنگھ صاحب بظاہر بڑے ”پے“ آدمی ہیں۔ دھیما لہجہ، ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کرتے ہیں جیسے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بات سمجھاتا ہے۔ بات جنسی قیدیوں کے مسئلے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اپنا وہی موقف دہرا رہے ہیں کہ پاکستانی فوجیوں نے بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس لیے ان کی رہائی کے لیے بھی بنگلہ دیش کی منظوری ضروری ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو چاہتے ہیں کہ انہیں جلد چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس سے بہر حال کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے تو اس سے بدنامی بھی ہماری ہوتی ہے۔ ہماری فوجیں بیرونیوں سے باہر خیموں میں بیٹھی ہیں کیونکہ بیرونیوں کے پاس ہیں آپ خود بتائیں کہ ہم کیوں نہ انہیں رہا کرنا چاہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر آپ رہا کیوں نہیں کر دیتے۔ کیوں بدنامی مول لے رہے ہیں۔“

کہہ رہے ہیں بنگلہ دیش کی منظوری کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں۔“ میں نے انہیں کہا۔ ”بنگلہ دیش تو آپ ہی کی تخلیق ہے۔ آپ اگر چاہیں تو وہ کیسے تیار نہیں ہوگا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی اگر کسی بھی صورت میں بات ہو سکے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔“

”میں نے کہا۔“ آپ ان کی ملاقات کے لیے کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔“

”نہیں ہم تو اس میں دخل نہیں دیں گے۔ ملاقات کے لیے حال ہی میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل مسٹر ڈالڈ ہائیم نے بھی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”آپ پاکستان سے بہتر تعلقات اور اچھی خواہشات کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن عملی طور پر آپ کا جو رویہ بنگلہ دیش کے لیے

اس کا جواب مل جانا چاہیے۔ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔ میں اجازت لے رہا ہوں۔ اپنے روٹھے ہوئے بھائیوں سے مل کر ایک عجیب سی طمانیت ہو رہی ہے۔

سیکرٹری وزارت خارجہ کیا کہتے ہیں؟

ہوٹل سے ہوتا ہوا شاستری بھون جاتا ہوں۔ یہاں ایک سٹرل پمپنی کی لائبریری میں گزشتہ ہفتے کے پاکستانی اخبارات مل جاتے ہیں۔ یہاں یہ نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ راولپنڈی کا ”جنگ“ ہے۔ باقی اخبارات لاہور اور پشاور کے ہیں۔ کراچی کے اخبارات بہت کم آتے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کے سفارت خانے والے ہفتے کے ہفتے یہ اخبارات پہنچاتے ہیں۔ دہلی سے اخبارات لے کر وہ راولپنڈی پہنچاتے ہیں۔ جنگ کے بعد سوئٹزر لینڈ کا سفارت خانہ ہی پاکستان اور ہندوستان میں ایک دوسرے ملک کے مفادات کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے توسط سے یہ دوریاں کبھی کبھار ختم ہو جاتی ہیں۔

میں مسٹر جے این بھٹ کے ساتھ وزارت خارجہ کے سیکریٹری کیول سنگھ سے ملنے جا رہا ہوں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو کیول سنگھ صاحب (جو داڑھی مونچھ منڈواتے ہیں، سر کے بال بھی کٹواتے ہیں) اپنی نشست سے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ کونے میں پڑے صوفوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ان کے اٹنے ہاتھ بیٹھنے لگتا ہوں۔ تو وہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ یہ پروٹوکول ہے کہ آپ اٹنے ہاتھ نہیں میرے سیدھے ہاتھ بیٹھیں۔ میں نے پروٹوکول پورا کرتے ہوئے کاغذ قلم نکال کر میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”اگر یہ آپ کے پروٹوکول کے خلاف نہ ہو تو کیا میں پنجابی میں بات کر سکتا ہوں۔“ اس پر کیول سنگھ صاحب کے چہرے سے پروٹوکول ہوا ہو گیا اور وہ کہنے لگے۔ ”آہو جی۔ کیوں نہیں۔“

دفاع کے سینئر افسر سے پوچھی تھی تو اس نے کہا تھا کہ یہ غلط ہے ہم نے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے درمیان کتنا تفاوت۔ کتنا فاصلہ ہے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”اگر یہ بنیادی مسائل طے ہو جائیں اس کے بعد بھارت اور پاکستان میں تعاون کی کیا صورتیں آپ کے خیال میں ہو سکتی ہیں۔“

انہوں نے بتایا۔ ”جتنا تعاون بھارت اور پاکستان آپس میں کر سکتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اور وہ ملک آپس میں کر سکیں۔ میں ہندوستان کی طرف سے کئی ملکوں میں سفیر رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ پڑوسی ممالک آپس میں اقتصادی روابط بڑھاتے ہیں۔ مشترکہ فارمولے تیار کرتے ہیں۔ آپ کی بہت سی چیزیں ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ بہت سی چیزیں آپ ہمارے ہاں سے لے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کی سوئی گیس ہے۔ آپ کو پائپ ہی تو ڈالنا ہے اور کیا خرچہ ہوگا۔ ہم امریکہ کے لیے آپ کے محتاج ہو جائیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مرکز ان دنوں پاکستان کے گرد حصار قائم کرنا ہے۔ حال ہی میں آپ نے اور وزیر خارجہ نے بحرین کویت وغیرہ کے دورے کیے ہیں۔ یہ پاکستان کے دوست ممالک ہیں۔ آپ کی کوششوں سے لگتا ہے کہ آپ پاکستان کو تنہا (Isolate) کرنا چاہتے ہیں۔“

اس پر وہ انہوں نے کہا۔ ”نہیں نہیں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بحرین کویت وغیرہ کے وفد ہمارے ہاں آئے تھے۔ انہوں نے ہماری مصنوعات دیکھیں۔ ہمارے وفد ان کے ہاں گئے۔ وہ ہمارے قریبی ہمسائے ہیں۔ ہمارے پاس کافی ہیں۔ ان سے تجارتی لین دین کر سکتے ہیں۔ ہم تو سب کے ساتھ اچھے تعلقات کے خواہاں ہیں۔ خلیج فارس کی ریاستوں کے دورے کی ایسے سیاسی مقصد

ہے وہ پاکستان کے لیے نہیں ہے۔ پاکستان کے لیے کبھی بھی آپ کا رویہ دوستانہ نہیں رہا ہے۔“

وہ کہہ رہے تھے۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ حالیہ تاریخ کی وجہ سے بنگلہ دیش سے ہمدردی بڑھ گئی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی رنجشیں دور ہوں۔ صدر بھٹو کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں انتخابات کے بعد غور کریں گے کہ اسے تسلیم کیا جائے یا نہیں۔ آج کل ہم انتظار میں ہیں۔“

میں نے شہری جنسی قیدیوں کے بارے میں پوچھا۔ ”آپ نے کئی ہزار پاکستانی شہریوں کو بھی کیمپوں میں بند کر رکھا ہے۔ ان میں بوزھی عورتیں بھی ہیں، بچے بھی، شیرخوار بچے بھی اور ایسے بچے بھی جو ان کیمپوں میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا قصور کیا ہے؟ انہیں تو آپ چھوڑ دیجیے۔“

اس پر انہوں نے کہا۔ ”ہم نے تو پیشکش کی تھی کہ 6000 عورتیں بچے چلے جائیں۔ ان کے بدلے میں اتنے ہی بنگالی عورتیں بچے پاکستان چھوڑ دے۔ پاکستان نے اس کے بدلے میں پندرہ ہزار بنگالی بنگلہ دیش پہنچانے کی پیشکش کی۔ ان کی فہرست بنا ہے کہ بنگلہ دیش کے پاس آئی ہے۔“

میں نے ان کی بات کا نکتہ ہونے کہا۔ ”جہاں تک مجھے علم ہے پاکستان نے یہ پیشکش کی ہے کہ وہ ان بنگالیوں کو واہگہ کی سرحد تک پہنچا دے گا۔ بنگلہ دیش کے حکام اور بھارت کی حکومت انہیں وہاں سے بنگلہ دیش لے جانے کا انتظام کر لے لیکن بھارتی حکومت نے انکار کیا کہ وہ اپنے علاقے سے انہیں گزرنے نہیں دیں گے۔“

اس بات پر فارن سیکریٹری نے کچھ پہلو بدلا اور کہا۔ ”ہاں ہم اس میں نہیں پڑنا چاہتے تھے کیونکہ یہ مسئلہ بہر حال بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان ہے۔ اس لیے ہم بیچ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور اسی لیے ہم نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔“

مجھے یاد آ رہا تھا کہ یہی بات میں نے وزارت

کے لیے ہرگز نہیں کیے گئے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان سب کے آپس میں اچھے تعلقات ہوں۔ ایک دوسرے کے خلاف سیاسی کوششیں کرنے سے کسی کو بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر ہم آپس میں لڑتے رہیں گے تو فائدہ ہمیشہ تیسرا اٹھائے گا۔ انہی جھگڑوں کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان تک پہنچنے میں کافی دیر لگے گی لیکن یہ فاصلے ہمیں طے کرنے ہیں۔ ورنہ دوسرے ہم پر ہستے رہیں گے۔“

مرنجان مرنج۔ کیوں سنگھ دھیمے دھیمے لہجے میں یہ باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں اپنی جگہ مگر پرنا دل میں گر رہی ہیں۔ بنگلہ دیش میں الیکشن اور اس کو تسلیم کرنا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اچھے تعلقات ہوں مگر۔

میں نے ان سے اجازت لی تو انہوں نے کہا۔ ”آپ گھومیں پھریں، لوگوں سے ملیں دیکھیں ان کے کیا نظریات ہیں کیا چاہتے ہیں۔“

دہلی میں شام کافی گھمبیر ہوتی ہے، پرانے ٹیکر بیڑے کی سرخ عمارتوں میں یہ شام کچھ اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ آج دیوان بریندر ناتھ کے ہاں کھانا ہے۔ کافی لوگ وہاں آ رہے ہیں۔ سب سے ملاقات رہے گی۔

یہ نظام الدین ایسٹ ہے۔ قدیم علاقے میں جدید مکانات، بے این بھٹ، ان کی بیگم اور میں دیوان بریندر ناتھ کا مکان تلاش کر رہے ہیں۔ دہلی کی ویران رات شہر کو اور سنسان کر رہی ہے۔ دھیمی دھیمی روشنیاں، دیوان بریندر ناتھ اور ان کی بیگم منتظر ہیں اور لوگ بھی ہیں۔ یونیورسٹی کے لیکچرار

ایک دانشور، بزرگ صحافی جتنا واس اختر، امرتا پریم کو آنا تھا مگر وہ کسی کام کی وجہ سے نہیں آسکی ہیں۔ بھارتی وزارت خارجہ کے بخشی صاحب بھی اپنی بیگم کے ہمراہ آگئے ہیں۔ اب یہ اچھی خاصی کاک نیل بن گئی ہے۔ مختصر سا مکان ہے۔ اس میں بھی لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں اکیلا

پاکستانی ہوں۔ پاکستان کے بارے میں مجھ سے بار بار سوال ہو رہے ہیں۔ یہاں مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر کتنا فخر محسوس ہو رہا ہے۔ شری بخشی اور شری بھٹ پاکستان میں رہ چکے ہیں۔ وہ کراچی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ کھانے سب دیسی ہیں۔ گوشت بھی چل رہا ہے۔ اس حد تک تو اب ہندو ترقی پسند بلکہ گوشت پسند ہو گئے ہیں۔

رات کافی ڈھل چکی ہے۔ میں اپنے ہوٹل واپس جا رہا ہوں۔

آج مجھے ہندوستان میں آئے پورے دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ آج 27 فروری ہے۔ دشمن ملک میں 14 روز۔ ایک طویل عرصہ ہے۔ اپنے وطن سے بالکل کٹے ہوئے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ گھر پر کیا گزر رہی ہوگی۔ دوستوں کا کیا حال ہوگا۔ پاکستان

ریڈیو سن لیتا ہوں۔ ہندوستانی اخبارات میں کچھ خبریں پڑھ لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ کیا رابطہ ہے۔ آج وزیر خارجہ سے انٹرویو ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب سرکاری مہمانداری ختم کر دی جائے۔ کچھ روز اپنے خرچ پر بھی رہا جائے۔ ویسے بھی ہندوستان کا بجٹ پاکستانی صحافی کے لیے دو ہفتے سے زیادہ میزبانی کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

دیرے میں بھی تو سب کی ضرورت ہے۔ ویزا تو میں ایکسپریس پبلسٹی والوں کے حوالے کرتا ہوں اور خود پر ان سروال سے ملنے جاتا ہوں انہیں ملے کافی دن ہو گئے ہیں۔ سروال اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ بالٹی مورسن کا پورا بیورو چلا رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، سیلون اور نیپال۔ ان کے ذمے ہے۔ ایک مرتبہ پاکستان

بھی آچکے ہیں سروال انگریزی اخبار کے لیے کام کرتے ہوئے بھی اپنی پنجاہیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ گھر میں بھی یہ ماحول کچھ کچھ چلتا ہے۔

ہندوستان کی سیاحتی کارپوریشن

آج مجھے ہندوستان کی فورزم ڈوپلمنٹ

کارپوریشن کی طرف بھی جانا ہے۔ اپنے اس 14 روزہ قیام میں جہاں جہاں بھی مجھے سیاحتی کارپوریشن سے واسطہ پڑا ہے۔ اس کی کارکردگی نے متاثر کیا ہے۔ آئی ٹی ڈی سی انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن۔ ان کا نشان صرف ۱ ہے۔ آسان، سیدھا سادا۔ ہمارے سیاحتی کارپوریشن کی طرح تجریدی، آرٹھک اور گنجلگ نہیں ہے۔ ہر قابل دید عمارت، تاریخی نوادرات کے آس پاس یہ نشان ضروری نظر آتا ہے۔ لوگوں کو ان کے مکوں میں نفسیاتی طور پر مجبور کرنا کہ وہ ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئیں انہیں وہاں بیٹھے ہوئے ہی پورے پروگرام بنانے کی سہولت دینا۔ اپنے ملک سے چلنے سے پہلے ہی وہ کسی ہندوستانی سفارت خانے سے لٹریچر لے کر اپنا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ انہیں وہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے آسان اور سچت والا راستہ کون سا ہو گا۔ ہوٹل ان کی استطاعت کے مطابق کون سا بہتر رہے گا۔ ان کی اپنے جو پسندیدہ موضوعات ہیں ان کے مطابق کون سے مقامات موزوں ہوں گے۔ جب وہ پروگرام بنا کر ہندوستان پہنچ جاتے ہیں، تو ان کے مقام آمد سے لے کر ان کی منزلوں تک جانے کے لیے ہر قسم کی ٹرانسپورٹ موجود ہوتی ہے۔ امیرانہ، درمیانہ، غریبانہ، سیاح کو تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے نہ تکلیف کا۔ سیاحوں کو ان مقامات تک پہنچانا اور ان کے قیام کی سہولتیں فراہم کرنا انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا کام ہے۔ اس کے بعد ان سیاحوں کو ذہنی طور پر متاثر کرنا اور تاریخ کو مسخ کرنا محکمہ آثار قدیمہ کے گائیڈ لیکچراروں کا کام ہے۔ ان سارے مراحل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ افسر، چھوٹے بڑے، کلرک، چپڑا سی سب اپنے ملک سے محبت رکھتے ہیں اور اس سے وابستگی پر فخر بھی کرتے ہیں اور ان مقامات اور اپنے وطن کی دوسری باتوں کے بارے میں بڑے فخر سے باتیں کرتے ہیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر میں چاہتا تھا کہ ٹورزم کارپوریشن کے بارے میں کچھ جانا جائے۔ اس کے لائحہ عمل، طریق کار سے آگاہی حاصل کروں، اس کے بارے میں وطن لوٹ کر کچھ لکھوں، پاکستان ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن سے پاکستان کے لیے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ جو اب تک یتیم ولادارث ادارہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں عہدوں اور تنخواہوں میں اضافے کی فکر ہی رہتی ہے۔ پاکستان اور سیاحت کے فروغ کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ میں انڈیا ٹورزم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کی عملی کامیابیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور اب پی این سیٹھ صاحب سے اس کارپوریشن کے بارے میں مزید تفصیلات جان رہا ہوں تو مجھے بار بار حفت محسوس ہو رہی ہے کہ ہم اس میدان میں بھی ان سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کارپوریشن ایک خود مختار عوامی سیکٹر کارپوریشن کے طور پر 1966ء میں شروع ہوئی جس میں تین سرکاری ادارے ضم ہوئے۔ ہوٹل کارپوریشن آف انڈیا، انڈیا ٹورزم ٹرانسپورٹ، انڈیا ٹورزم کارپوریشن، سیٹھ صاحب بنا رہے ہیں کہ اس کارپوریشن نے بڑے بڑے مقاصد سامنے رکھے تھے۔

۱۰ سیاحوں کے لیے آرام دہ قیام گاہیں۔

۱۱ منظر بنی کے لیے بہتر کاریں اور بسیں۔

۱۲ سیاحوں کے لیے خاص سہولتیں، تفریح کا

سامان اور ڈیوٹی سے مستثنیٰ دکانیں۔

۱۳ پبلسٹی۔ جس کے ذریعے انڈیا میں سیاحوں

کے لیے دلکشی کے مقامات اور نظاروں کی باہر تشہیر

کی جائے اور خود ملک کے اندر ہندوستانیوں کو

سیاحت کی قومی اہمیت سے روشناس کرنا۔

گزشتہ سال (72-1971ء) میں اس

کارپوریشن کی آمدنی 6 کروڑ 70 لاکھ رہی۔

کارپوریشن کے سامنے 1980ء تک قیام کی

سہولتوں کو 5000 کمروں اور 9000 بستروں

کی فروخت کے علاوہ خود ہندوستان کی مصنوعات کے شوکیس کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ سیاحوں کی تفریح کے لیے صورت و نور کے پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ دہلی کے لال قلعے میں صورت و نور کا پروگرام مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہاں جا بھی چکا ہوں۔ اس پروگرام کو ہر سال کم از کم ایک لاکھ تیس ہزار افراد دیکھتے ہیں اس کے علاوہ احمد آباد، سری نگر میں بھی ایسے پروگرام ہیں۔

پلہنی کے لیے کارپوریشن، اندرون ملک اور بیرون ملک بھر پور مہم چلا رہی ہے۔ سیٹھ صاحب بتا رہے تھے بھارت کے بیرون ملک تعارف کے لیے اس سال کارپوریشن 75 لاکھ روپے کا لٹریچر تیار کرے گی۔ اندرون ملک 13 زبانوں میں سیاحت کی اہمیت پر اور اپنے ملک کو جاننے کے لیے کتابچے، پمفلٹ فوٹو پوسٹ کارڈ شائع کیے جاتے ہیں۔

لوگ کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں۔ ہم اپنے پاس سب کچھ رکھتے ہوئے بھی دامن ہیں۔ شکست، مایوسی اور اداسی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ہندوستان میں موجود تاریخی عمارتیں، زیادہ تر مسلمان شہنشاہوں کی یادگار ہیں جس سے مسلم تہذیب کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ اور سیاحتی کارپوریشن نے مل جل کر ان کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے اور کیسے خوب صورتی سے انہیں محفوظ رکھا ہے۔ اپنی زمین، اپنے تاریخی سرمائے سے یہ محبت، خلوص کا نتیجہ ہے کہ سیاح یہاں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کاروبار اس سے وابستہ ہے اور ہندوستان والے یوں اپنی ثقافت، تاریخی عظمت اور فن تعمیر کا رعب ڈالتے ہیں۔ اپنے ہاں یہ خلوص اور محبت تو کیا، ان کے کھنڈر بھی نہیں ملتے کس کارونارونیس۔

ہندوستان میں بیٹھے ہوئے اپنی محرومیوں کا

تک پہنچانے کا منصوبہ ہے۔ اس وقت صرف دہلی میں اس کارپوریشن کے زیر انتظام ہونٹوں میں 1250 کمرے اور 1700 بستر ہیں۔ اشوکا، اکبر پانچ ستاروں والے ہوٹل ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ہوٹل ہیں۔ اے کلاس، بی کلاس، سی کلاس۔ جس قسم کا سیاح ہو ویسی سہولت، چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ہوٹل اور موٹل ہیں لیکن صاف ستھرے، دور دراز تاریخی عمارات کے نزدیک بھی قیام کی پور سہولتیں ہیں۔ ہمارے اباؤ اجداد نے جو عمارتیں تعمیر کی تھیں وہ آج ہندوستانوں کے لیے نام اور دولت کمانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کارپوریشن کے ٹرانسپورٹ فلیٹ میں ٹورسٹ کاریں ہیں، لگژری کوچ ہیں، منی بسیں ہیں، فورڈ لموزین ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ دہلی کے علاوہ آگرہ، اورنگ آباد، بنگلور، بدم، گویا، بمبئی، حسن، حیدرآباد، بے پور، کھاجور، کووالام، مدراس، پٹنہ، سرینگر، اودے پور، بنارس میں بھی ٹرانسپورٹ یونٹ قائم ہیں۔ سیٹھ صاحب یہ تفصیلات بتا رہے ہیں۔ مجھے پاکستان ٹورزم ڈیپارٹمنٹ کارپوریشن کے باہمی تنازعے یاد آ رہے ہیں۔ جہاں ڈائریکٹروں کی چیقلش چلتی رہتی ہے۔ جہاں تاریخی عمارتوں کے آس پاس کوئی موٹل یا ہوٹل نہیں ہے جہاں گائیڈ بکچر بھی مشکل ہے جہاں پاکستان میں اچھی خاصی پرنٹنگ ہونے کے باوجود لٹریچر جرمنی اور دوسری جگہوں سے چھپوایا جاتا ہے۔ جہاں صرف واہگہ سے گزر کر افغانستان جانے والوں یا کوئٹے سے گزر کر بھارت جانے والے سیاحوں کے اندراج کو شمار کر کے ہی بعد میں فخریہ طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اب کے پاکستان میں اتنے سیاح آئے۔

پی این سیٹھ بتا رہے ہیں کہ چار بین الاقوامی ہوائی اڈوں بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دہلی پر ڈیوٹی سے مستثنیٰ دکانیں ہیں۔ ان سے درآمد شدہ سامان

شروع کریں، میں نے پنجابی میں بات شروع کر دی۔ سردار جی بھی پنجابی میں شروع ہو گئے۔ ”کنے دن ہو گئے نیں کی خیال اے۔ کی محسوس کیتا۔“

”آپ کہاں کہاں گئے۔“

”میں اپنے شہر راجپور سے پنیالے گیا ہوں۔

اگرے ہو کر آیا ہوں۔“

”سرہند شریف نہیں گئے۔ وہ تو پنیال سے

نزدیک ہی تھا۔ 18 میل دور ہی تو تھا۔ چندی گڑھ

ہو آئے۔ کیوں بھی چندی گڑھ لے جاتے انہیں

(بھٹ سے مخاطب ہیں) ہمارے وزیر اعلیٰ سے

ملواتے۔ پنیالہ یونیورسٹی دیکھی۔“ انٹرویو کی بات

چلی۔ میں شیپ ریکارڈ کھولنے لگا۔ کہنے لگے اے

رہنے ہی دیں۔ میں اس کی وجہ سے تیز تیز بولوں گا۔

پھر آپ کو اسے کاغذ پر اتارنا مشکل ہو گا۔ میں بات

کچھ گیا۔ شیپ ریکارڈ بند کر دیا۔ میں نے ان سے

پوچھا اردو میں بات چیت کریں گے یا انگریزی۔

انہوں نے انگریزی کو ترجیح دی۔ میں نے کہا۔

درست ہے۔ سردار جی بڑے محل مزاج ہیں۔ ٹھہر ٹھہر

کر بات کرتے ہیں۔ ناپ تول کرتا کہ کوئی بات

ایسی ویسی نہ نکل جائے۔ مجھے ہندوستانی صحافی

دوستوں نے بھی بتایا تھا کہ سردار جی سے کوئی خبر

نکالنی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس مشکل کا سامنا مجھے

بھی کرنا پڑا تھا۔ سردار جی ہر بات کو جنرل بات بنا

کر پیش کیے جا رہے تھے۔ ادھر وزیر اعظم اندرا

گاندھی کی تقریر کا وقت بھی ہو رہا تھا اس لیے سردار

جی بھی جلدی میں تھے۔ حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ

سردار جی کھل کر کوئی بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ان سے پوچھا گیا کہ بھارتی حکومت اور

پاکستانی حکومت کی طرف سے جنسی قیدیوں کے

سلسلے میں مختلف موقعوں پر دیے گئے بیانات کو پیش

نظر رکھتے ہوئے اگر پاکستان بنگلہ دیش کو جلد تسلیم

نہیں کرتا تو جنسی قیدیوں کی واپسی کے لیے متبادل

انتظامات کیا ہیں؟“

احساس کچھ زیادہ ہی ستاتا ہے کیونکہ یہ ہمارا دشمن نمبر ایک ہے جس سے ہمارا ہر میدان میں مقابلہ ہے۔ ہندوستان کی ساری منصوبہ بندیوں میں پاکستان کو زیر کرنا ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اسلحہ سازی میں نہیں۔ ہر جگہ برآمد میں، سیاحت میں، بیرونی تجارت میں لیکن اس کے مقابلے میں ہم کیا کرتے ہیں۔ مسابقت ایک اچھا جذبہ بھی ہے اگر اس میں اپنا استحکام بھی شامل رہے۔

سردار سورن سنگھ سے چند باتیں

اب مجھے وزیر خارجہ سے ملنے جانا ہے۔ سردار

سورن سنگھ ایک عرصے سے بھارت کی کابینہ میں کسی

نہ کسی حیثیت سے شامل چلے آ رہے ہیں۔ کافی

دلچسپ شخصیت ہیں۔ ان سے مختصر سی ملاقات شملے

میں تو ہوئی تھی آج ذرا اچھی ملاقات رہے گی۔ میں

مسٹر بھٹ کے ساتھ پارلیمنٹ کی عمارت میں پہنچا۔

قدم قدم پر پولیس والے روکتے ہیں۔ آج

وزیر اعظم بھی پارلیمنٹ میں صدر کی تقریر پر ہونے

والے اعتراضات کا جواب دینے آ رہی ہیں۔ اس

لیے کچھ زیادہ سخت انتظامات ہیں۔ پولیس والا

ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا ایک سا ہوتا ہے۔ بے

چارے بھٹ صاحب سپاہی سے کہہ بھی رہے ہیں

کہ یہ پاکستانی مہمان ہیں ان کا سردار جی سے

ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ان سے یہ کہہ رہے ہیں

کہ اندر جا کر کسی سے پوچھ لو۔ ہم یہیں رکتے ہیں۔

مگر وہ سپاہی خالص پولیسی لہجے میں بولا۔ ”چپ کر

کے کھڑے رہو، کوئی ادھر آئے گا تو اس سے کہوں گا

کہ پوچھ کے بتائے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”بھائی وقت گزر جائے گا۔“ مگر وہ اس بات کو کوئی

لفٹ نہیں دے رہا تھا۔ ایک اور سپاہی آیا۔ اسے

ہمارے ساتھ بھیجا تب ہمیں اس کمرے میں باریابی

ملی۔ سردار صاحب تنگ پانچوں کے پانچاے

شیردانی، پیڑی اور داڑھی میں بلبوس تھے۔

بیشتر اس کے کہ سردار جی انگریزی میں بات

ہماری خواہش ہے کہ ہمارے دونوں ہمسایوں کے تعلقات بہتر ہوں۔ بھارت کے وزیر خارجہ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ جنگی قیدیوں کی نظر بندی بھارت کے لیے بدنامی کا باعث نہیں ہے اور اس سے یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں نوے ہزار انسانوں کو سیاسی سودے بازی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر ان نوے ہزار قیدیوں اور ان کے خاندانوں کی بے بسی پر کوئی سیاسی فیصلہ کیا بھی گیا، مثال کے طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کر بھی لیا گیا تو کیا مجبوری اور دباؤ کے تحت کیے گئے یہ فیصلے دیر پا امن کے قیام کا باعث بن سکتے ہیں۔

سردار سورن سنگھ نے کہا۔ ”بھارت جنگی قیدیوں کو سیاسی مفادات کے حصول کے لیے برہمنال کے طور پر استعمال نہیں کر رہا ہے اس سلسلے میں کسی بھی قیاس آرائی کی میں پورے زور سے تردید کروں گا۔ ہم تو جنگی قیدیوں کے مسئلے کے حل کے خواہش مند ہیں۔ ہم انہیں ضرورت سے ایک دن بھی زائد قید رکھنا نہیں چاہتے ہمیں اس مسئلے کے انسانی پہلو کا شدت سے احساس ہے لیکن ہمارا ایک ناگوار احساس یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔“ سردار سورن سنگھ نے کہا کہ پاکستانی ترجمان دوسرے عالمی دارالحکومتوں میں اس مسئلے کو پورے زور شور سے اٹھا رہے ہیں تاکہ سیاسی مفادات حاصل کیے جاسکیں جب کہ دونوں فریق باہمی بات چیت پر رضامند ہوئے تھے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اس مسئلے پر دوسرے مقامات پر احتجاجی رویہ اختیار کیا گیا ہے حالانکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اس مسئلے کا حل متعلقہ پارٹیاں ہی تلاش کر سکتی ہیں بھارتی وزیر خارجہ الزام لگا رہے ہیں پاکستان نے مسلح افواج کے بنگالی ارکان کو نظر بند کر رکھا ہے۔ پاکستان نے ابھی تک کوئی وجہ نہیں بتائی کہ وہ ان افراد کو کیوں روکے ہوئے ہے اور بنگلہ دیش جانے

و۔ کبھے لگے۔“ ہم نے بھارتی حکومت کی طرف سے شملہ میں پاکستانی وفد کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی کہ جنگی قیدیوں کے مسئلے کے مکمل حل کے لیے بنگلہ دیش کی رضا مندی اور شمولیت ضروری ہے ہمیں واضح طور پر تاثر دیا گیا کہ پاکستان کے نزدیک یہ پوزیشن متنازعہ نہیں ہے ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ احساس موجود ہے کہ بنگلہ دیش کو مسلسل تسلیم نہ کرنا پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے اور اس سمت میں قدم تیزی سے اٹھایا جانے کیونکہ پاکستان اس وقت آئین سازی میں مصروف ہے اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان کے کسی آئندہ آئین میں بنگلہ دیش کو شامل کرنا غیر حقیقت پسندانہ امر ہوگا کیونکہ آئین سازی میں بنگلہ دیش سے برائے نام نمائندگی بھی نہیں ہے۔ اس پس منظر میں جنگی قیدیوں کے مسئلے پر بات چیت کو کسی آئندہ وقت پر اٹھا رکھا تھا۔ بہت سی وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ واقعات رو مانا نہ ہوئے اب شاید پاکستان بنگلہ دیش کے انتخابات کے بعد اس سمت میں کوئی قدم اٹھائے۔ پاکستانی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً جو بیانات دیئے ہیں ان سے یہی تاثر ملتا ہے اس سلسلے میں بنگلہ دیش یا پاکستان جس نے بھی کوئی قدم اٹھایا اس سے مجموعی طور پر مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔ پوچھا گیا کہ ”اس سلسلے میں بھارت کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟“ سردار سورن سنگھ نے بتایا۔ ”بھارت اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرنے سے اس لیے ہچکچاتا ہے کہ صدر پاکستان نے کئی مواقع پر بیانات دیئے ہیں کہ وہ بالکل پسند نہیں کریں گے کہ بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان کوئی کردار ادا کرے۔ ظاہر ہے کہ ہم بنگلہ دیش کے درمیان بنیادی طور پر یا کسی نوعیت کے مسائل میں مداخلت پسند نہیں کریں جب تک دونوں فریق ہمیں ایسا کرنے کے لیے نہ کہیں لیکن

کی اجازت کیوں نہیں دے رہا۔ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر یہ ہوگا کہ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے اس سے بنگلہ دیش اور پاکستان کے رہنماؤں کے درمیان مفاہمت اور اعتماد پیدا ہوگا، معاہدہ شملہ جن اصولوں کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا پاکستان اور بھارت دونوں ان اصولوں کی پاسداری کریں گے۔ شملہ معاہدہ کے تحت فوجوں کی ایسی عمل میں آچکی ہے۔ جموں و کشمیر میں نئی کنٹرول لائن طے ہو چکی ہے۔ یہ دونوں میں طے پایا تھا کہ یہ کنٹرول لائن۔ امن کی لائن ہو گیا اور جموں و کشمیر کے سلسلے میں بھارت اور پاکستان کے پہلے سے جو موقف ہیں ان پر اس لائن کا کوئی اثر نہ ہوگا یہ بھی طے پایا تھا کہ اس سلسلے میں مکمل حل دونوں فریقوں کی رضا مندی سے تلاش کیا جائے گا۔ سردار سورن سنگھ نے کہا اگرچہ معاہدہ شملہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ تمام تنازعات طے نہیں ہوئے لیکن اس سے مسائل کے حل کے لیے پرامن اور باہمی رضا مندی کا راستہ ضرور نکل آیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھارت اور پاکستان میں شملہ معاہدہ پر نکتہ چینی کرنے والے حلقے بھی موجود ہیں لیکن پاکستان اور بھارت کے عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ پرامن تعلق اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں شکوک و شبہات کی جگہ اعتماد اور مفاہمت لے لے۔ چین اور بھارت کے تعلقات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں سردار سورن سنگھ اعتراف کرتے ہیں کہ 1971ء اور 1972ء کے دوران چین سے ہمارے تعلقات کو نقصان پہنچا تھا ہمارا اندازہ ہے کہ اگلے ایک یا دو برس میں تعلقات معمول کی طرف بڑھیں گے۔ بھارت اور چین دونوں کی طویل مشترکہ سرحدیں ہیں۔ اب سرحدوں پر صورت حال کشیدگی سے مبرا ہے۔ بھارت اور چین کے سفارت خانے بھی موجود ہیں۔ عالمی صورت

حال میں کشیدگی میں جو کمی پیدا ہو رہی ہے اس کے مطابق بھارت اور چین کے تعلقات بھی یقیناً بہتر ہوں گے اور ہم بھارت کی طرف سے اس بات کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔

سردار جی پارلیمنٹ کی طرف چلے گئے۔ ہمیں بھی اس اجلاس میں جانا ہے۔ دیکھیں وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے مخالفین کو کیسے جواب دیتی ہیں۔ صدر گری اپنی صدارتی تقریر کر چکے تھے۔ اس پر مخالف اور موافق تقریر بھی ہو چکی تھیں اب وزیراعظم اندرا گاندھی اس بحث کو سمیٹیں گی۔ آج پریس سیلری اور دوسری تمام ٹیلریاں کھینچا ہج بھری ہوئی تھیں ایک طرف آندھرا پر دیش کانگریس کے رہنما بھی بیٹھے ہیں۔ وہ اس توقع میں ہیں کہ شاید وزیراعظم ان کے مسئلے پر بھی کچھ اظہار خیال کریں۔ وزیراعظم سینک لگائے کچھ کاغذات سنبھالے، سرخ رنگ کی سازھی پہنے، تقریر شروع کر چکی تھیں۔ عورت ہونے کے باوجود ان کی آواز میں گرج تھی۔ ان کی تقریر غور سے سنی جا رہی تھی۔ پاکستان بھارت تعلقات، اسلحہ کی دوڑ، بھارت میں خشک سالی، پیلو مودی اپنے ضخیم جتنے سمیت اندرا گاندھی کی تقریر کے بیچ کوئی جملہ پھینک دیتے۔ اندرا گاندھی جھلا کر کاغذات سے نظریں ہٹاتیں۔ پیلو مودی کھلکھلا کر خاموش ہو جاتے لیکن صرف دو بارہ کسی مناسب موقع پر بولنے کے لیے۔ مغربی بنگال کے ممبر بھی کبھی کبھار نکلتے اٹھادیتے لیکن مجموعی طور پر اندرا گاندھی کی تقریر خاموشی سے سنی جا رہی تھی آج لوک سبھا کے بھی تقریباً سارے ارکان موجود تھے۔ سرکاری بچوں سے بار بار تالیاں بجاتی رہیں۔

ان دلچسپ سزوات سے کی سنی تیرہ روزہ
اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

169

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تعمیر
تعمیر کہاویں

تعمیر کہاویں کا سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

مفاد پرست

ایچ اے ایم



اس شخص کا قصہ جسے دوسروں کے جذبات کے بجائے ہمیشہ اپنا مفاد عزیز تھا

انہوں نے اصرار کیا کہ شان بھائی آپ اپنی تعلیم مکمل کر چکے ہیں تو کیوں نہ آپ کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔ شان تقریباً رضامندی کے انداز میں ہنسا۔ کچھ دن گزرے کہ شان کی بہنوں کے محلے میں ایک شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ شان نے بھی اس شادی میں شریک ہونا تھا۔ شان کی بڑی بہن کے سرایوں میں ایک لڑکی سحر تھی۔ جس نے جاں ہی میں ایم اے پاس کیا تھا۔

عجیب اتفاق ہوا کہ شان کی بڑی بہن نے سحر کا شان سے تعارف کروا دیا۔ سحر ایک خوبصورت اور مدبر لڑکی تھی۔ شان نے سحر کو دیکھا تو وہ پہلی ہی نظر میں سحر کو دل دے بیٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔

سحر کے ماں باپ بھی رضامند ہو گئے۔ لیکن ان کی ایک شرط تھی کہ فوری طور پر منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ فوری طور پر عزیز واقارب کی موجودگی میں منگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور یہ بھی طے ہوا کہ چھ ماہ یا سال کے اندر شادی بھی کر دی جائے گی۔ منگنی کی خوشی

شان ایک یا تیس سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکتا رہتا تھا۔ اس کے نقوش خدو خال عام لوگوں سے بالکل الگ تھلگ تھے اور چہرے پر دو چمکدار مقناطیسی آنکھیں آویزاں تھیں جو اس کی شخصیت کو چار چاند لگائے رکھتی تھیں۔ تعلیم ایم اے تھی۔ اگر کسی نوجوان میں یہ تمام خوبیاں موجود ہوں تو نوجوان لڑکیاں کبھی چلی آتی ہیں۔

لیکن شان کے ساتھ ایک المیہ ہو چکا تھا۔ اس کے والدین حیات نہیں تھے۔ اس کا ایک بڑا بھائی امداد تھا۔ جسے نشے کی لت پڑ چکی تھی۔ وہ دن رات نشے میں ڈوبا رہتا۔ آخر کار نشے کی لعنت نے اس کو اس قدر لاغر کر دیا کہ وہ فوت ہو گیا۔ اب شان کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ جو شادی شدہ تھیں۔ وہ اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہتی تھیں۔ شان کے گھر میں اس کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا بھائی شاہد بھی رہتا تھا جو ابھی زیر تعلیم تھا۔

اب شان کا اس دنیا میں دو بہنوں اور چھوٹے بھائی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک روز چھٹی کا دن تھا۔ دونوں بہنیں اپنے شوہروں کے ہمراہ شان کے گھر پہنچ گئیں اور

www.paksociety.com
پر ہمیشہ غالب رہتے تھے۔ طبیعت میں لا اباں پن بھی
بہت زیادہ تھا۔

ایک روز ایک کینے ٹیریا میں اس کا ایک پرانا

میں سحر کا چہرہ کھلے گلاب کی شکل اختیار کرنے لگا اور اس
کی شان سے حسین خیالوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔

شان ایک کھلنڈرانو جوان تھا۔ شدت جذبات اس



سوری! دیوان اچانک بولا "میرا موہاں اور سگریٹ کی ڈبیا تو کار میں ہی رہ گئے ہیں۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ آپ انجوائے کریں۔"

شان ارفع کا حسن دیکھ کر تقریباً مدہوش ہو چلا تھا۔ اس کی آنکھیں اس چمکا چوند ماحول میں مُند رہی تھیں۔ شان نے لاشعوری طور پر اپنا دایاں ہاتھ ارفع کی کمر میں ڈال دیا۔ ارفع شان کو دیکھ کر تقریباً بٹھکر چکی تھی۔ کیونکہ آج شان بھی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ارفع کا سارا وجود شان کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور وہ اس گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہتی تھی۔ شان ارفع کی سانسوں کی مہک اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دونوں محبت کے گہرے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

"رکھیں۔" ارفع نے گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بولی، "دیوان آنے والے ہیں۔" اسی اثناء میں دیوان کیمین میں آچکا تھا۔ "سوری! اس لئے تاخیر ہو گئی کہ باہر میرا ایک دیرینہ دوست مل گیا تھا۔"

کھانا شروع ہو گیا۔ شان انتہائی تذبذب کے عالم میں تھا۔ وہ دیوان سے ارفع کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب تینوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو شان سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اس نے ارفع کے بارے میں دیوان سے راز دارانہ لہجے میں ایک دوسوال کئے۔

دیوان نے کہا، "تم کل گھر آنا پھر کھل کر بات ہو گئی۔"

شان کا اگلا وقت تذبذب میں گزرا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ تو وہ فوراً دیوان کے گھر پہنچا۔ ارفع گھر میں نہیں تھی۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج کھل کر باتیں ہوں گی۔ ارفع کہاں ہے؟" شان نے اپنی بے تابی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہے، بس آنے ہی والی ہے۔" دیوان نے شان کو بتایا۔

ارفع کی وقتی طور پر غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے

دوست دیوان مل گیا۔ دونوں بے لگہم ہوئے اور خوب گپ شپ لگائی۔ دیوان نے شان کو گھر آنے کی دعوت دی۔ جو شان نے خوشی سے قبول کر لی۔

چنانچہ اتوار کو شان کو دیوان کے ہاں جانا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھانا تھا۔ شان مقررہ وقت پر دیوان کے ہاں پہنچا۔ دیوان گھر کے باہر شان کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ دیوان شان کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی زرق برق لباس پہنے ہوئے کھانا لے کر آ گئی۔

"یہ میری کزن ارفع ہے۔" دیوان نے ارفع کا شان سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! ارفع شان سے آنکھیں منکاتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

شان نے جواب میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے ارفع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" یہ جملہ شان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"شام کا کیا پروگرام ہے۔" شان دیوان سے مخاطب ہوا۔

"کوئی پروگرام نہیں۔ ارفع دو روز پہلے ہی امریکہ سے آئی ہے۔ تقریباً ایک ماہ پاکستان رہ کر واپس چلی جائے گی۔" دیوان نے جواب دیا۔

"تو آج شام میرے ہاں آ جاؤ۔ گلبرگ ریسٹورنٹ کی چائیس کھلاؤں گا۔ آئس کریم بھی چلے گی۔" شان نے بے ساختہ کہا۔

"ضرور آئیں گے۔" ارفع نے شان کی آنکھوں میں آنکھیں میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

شام کے ٹھیک سات بجے تھے۔ جب گلبرگ ریسٹورنٹ کے باہر ایک کار آ کر رکی۔

شان پہلے ہی سے ریسٹورنٹ میں بیٹھا دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی وہ دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے شان نے کھڑے ہو کر، "ویٹم۔" کہا۔ آج ارفع نیلے لباس میں ملبوس آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ شان ارفع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک کیمین میں چلا گیا۔ دیوان بھی ساتھ تھا۔

ساتھ والے سائبر روم میں لے گیا اور اپنے دل کا سارا حال کہہ ڈالا۔ ارفع نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔
 ”دیوان کو آنے دو، شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں۔ میں زمانے کی ستائی ہوئی لڑکی ہوں، تمہیں دیوان سے معلوم ہو گیا ہوگا۔“

دیوان آچکا تھا۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ خوب خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ دیوان کے علم میں ساری بات آچکی تھی۔ اس نے شان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
 ”ہم دونوں دوست ہیں، ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ کر اس سلسلے میں گفتگو کریں گے تاکہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

اگلی شام وہ دونوں ایک کینے میں بیٹھے تھے اور دونوں کا موضوع ارفع تھی۔ دیوان نے شان کو یقین دلایا کہ ارفع مان جائے گی۔ لیکن دیوان کا ایک سوال شان کے لیے معصوم بن کر آن کھڑا ہوا۔ کہ تم نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے اور ابھی تک تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ آخر کیوں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے میرے والدین انتقال کر چکے ہیں۔ میری بڑی بہنوں نے اپنے ایک عزیزوں کے ہاں میری بات ٹھہرائی ہے اور وہاں منگنی طے ہو چکی ہے۔ لیکن میں قطعی طور پر اس لڑکی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ میرا ارادہ امریکہ جانے کا ہے۔“ شان نے کہا۔
 ”تو پھر تم اس لڑکی کو کیا جواب دو گے۔“ دیوان نے کہا۔

”انکار کا جواب دوں گا۔“ شان نے کہا۔
 ”مگر ادھر ایک فائدہ ضرور ہے کہ ارفع تمہیں شادی کے بعد امریکہ ساتھ ضرور لے جائے گی۔ تم کل شام گھر آ جاؤ۔ ہم اس سلسلے میں کسی قطعی فیصلے پر ضرور پہنچ جائیں گے۔“ دیوان نے شاطرانہ انداز میں کہا۔
 اگلے روز شان مٹھائی کے ڈبے لے کر دیوان کے ہاں پہنچ گیا۔ اس وقت ارفع باتھ روم میں تھی۔

دیوان نے انتہائی رازدارانہ انداز میں کہا، ”کان ادھر لاؤ۔ میں نے ارفع کو منا لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ شادی کے لیے تیار ہے۔ لیکن اس بات کا قطعی راز نہ رکھو

ہوئے شان نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اپنے دوست دیوان سے اپنے دل کا حال کہہ دے۔ آخر دیوان اس کا دیرینہ اور بے تکلف دوست ہے۔

”دیوان میرے دوست میں ارفع کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟“ شان نے جذباتی انداز میں کہا۔

”بولو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ دیوان نے کہا۔
 ”میں ارفع کو پسند کرنے لگا ہوں اور غالباً وہ بھی۔ میں اس کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔“ شان نے کہا۔
 ”دیکھو شان میں ایک بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔ ارفع ایک دکھی لڑکی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک شخص پہلے بھی آیا تھا جو تین ماہ رہا اور دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب ارفع مایوسی کے گرداب میں گھری ہوئی ہے، اسے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب وہ ایک سماجی کارکن سے اور فلاح و بہبود کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ اگر تم اسے راضی کر لو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم میرے دوست ہو۔“ دیوان نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

”میں اسے راضی کر لوں گا۔“ شان نے جواب دیا۔

شان انتہائی پریشانی کے عالم میں تھا۔ اتنے میں ارفع گھر میں داخل ہوئی۔ شان تیزی کے ساتھ اٹھا اور انتہائی گرجبوشی سے اس کا ہاتھ اپنے طرف کھینچتے ہوئے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

ارفع شان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور دیوان سے مخاطب ہوئی، ”دیوان صاحب شان آئے ہیں، ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کریں“ اور ساتھ ہی اس نے اپنے پرس میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ دیوان کی طرف بڑھایا۔

شان نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا رہنے دیجئے، ”یہ تو جعلی ہے“ اور فوراً اپنی پاکٹ سے ایک نوٹ نکال کر دیوان کو دیا۔
 تینوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

دیوان کھانا لینے بازار چلا گیا۔ شان دیوان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارفع کو ڈرائنگ روم کے

سحر نے بتایا کہ، حال ہی میں میری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔“

ارفع نے بتایا کہ، ”میں تو مطلقہ ہو چکی ہوں۔ اس دنیا میں پریشان ہر کوئی ہے مگر ہر ایک کی پریشانی کا نام مختلف ہے۔“ ساتھ ہی ارفع نے کہا، ”میرے پاس میرے نئے منگیتر کی تصویر ہے۔“

سحر نے کہا، ”دکھاؤ تو۔“ ارفع نے شان کی تصویر پرس سے نکال کر دکھا دی۔ تصویر دیکھتے ہی سحر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ارفع نے معاملے کو بھانپ لیا اور سحر سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، اس سنڈے کو میری شان کے ساتھ شادی ہے، تم ضرور آنا، یہ شخص مجھ سے شادی نہیں کر رہا بلکہ میرے ساتھ امریکہ جانا چاہتا ہے۔ یقیناً دولت اکٹھی کرنا چاہتا ہے اور میرے حقوق بھی غصب کرنا چاہتا ہے۔ ہم دونوں اس کی خبر لیں گی اور مزہ چکھائیں گی۔“

☆☆☆☆

پورے ہفتے کے دوران شان نے ارفع سے دو تین بار فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر ارفع نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ، ”شان اب شادی کے دن قریب آ رہے ہیں، ہم دونوں میں دوری ضروری ہے۔“

شان نے سنڈے کو گھر اور محلے کو خوب سجایا اور شام کو دلہانہ بن کر باراتیوں کے ساتھ دیوان کے گھر پہنچا وہاں مکمل دیر اندہ تھا۔ نہ کوئی خیمہ، نہ کرسی اور نہ روشنی۔ درازے پر ارفع، سحر، دیوان اور چند دیگر لوگ کھڑے تھے۔

شان نے صورت حال دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہوئے ارفع سے کہا۔

”ارفع یہ کیا مذاق ہے اور تم دلہن کیوں نہیں بنیں۔“ ارفع نے جواب دیا۔

”تم خود غرض اور لالچی ہو۔ تم صرف امریکہ جانے کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس مفاد کے تحت تم نے سحر کو ٹھکرا دیا ہے۔ لہذا میں تم جیسے مفاد پرست شخص سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔“

☆☆.....☆☆

کہ تمہاری کہیں اور منگنی ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، وہ منگنی تو تمہیں توڑنی ہی پڑے گی، اس میں تمہارا بہت بڑا فائدہ ہے کہ ارفع شادی کے بعد تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جائے گی اور جو تمہارا ڈھیروں دولت کمانے کا خواب ہے وہ پورا ہو جائے گا۔“

ارفع جب ہاتھ روم سے باہر آئی تو وہ حیرت زدہ تھی کہ مٹھائی کس مقصد کے لیے آئی ہے۔ حیرت کے طے حلے جذبات اس کے چہرے سے ظاہر تھے اور وہ زریب مسکرا بھی رہی تھی۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔ بڑے غور و خوض اور لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ارفع شان سے شادی کرنے کے بعد شان کو امریکہ اپنے ساتھ لے جائے گی۔

اگلے روز دیوان شان کو ملنے کے لیے اس کے گھر گیا اور اس کو مشورہ دیا کہ، ”اس منگنی کو جتنی بھی جلدی ہو سکے توڑ دو۔“ شان نے یقین دلایا کہ، ”وہ یہ کام بہت جلد کر دے گا۔ اسے اس کام میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

☆☆☆☆

آخر چند دنوں کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور طوفان کی صورت میں پھیل گیا کہ کوئی شریف آدمی کیسے چاہے گا کہ اس کی بیٹی کی منگنی ٹوٹ جائے۔ لیکن یہ تو افراتفری کا دور ہے اس معاشرے میں ہر وقت ہر قدم پر کوئی بھی سانحہ رونما ہو سکتا ہے اور آخر وہی ہوا شان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ منگنی ٹوٹ گئی۔ اور اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ارفع سے شادی کرے گا اور شادی کے بعد ارفع اسے امریکہ ساتھ لے جائے گی۔

چند دن بعد وومن کلچر تنظیم کے زیر اہتمام ایک میننگ ہونے والی تھی۔ جس کا ایجنڈا عورت کے حقوق اور اس کو تحفظ دلانے کے بارے میں تھا۔ جس کی صدارت ارفع نے کرنا تھی۔ کیونکہ وہ ایک سماجی کارکن تھی۔ سنٹرل لائبریری میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ عورتوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اس ہجوم میں ہر طبقے کی عورت موجود تھی۔ تقریب کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ صدارت امریکہ سے آئی ہوئی ارفع نے کی۔ مہمان خصوصی کا جب اعلان ہوا تو سحر حیران رہ گئی کہ اس کی عزیز ترین سہیلی ارفع تھی۔ تقریب کے اختتام پر دونوں خوشی سے بغلیں ہو گئیں۔

دوسری مرد کہانی

امتحان

بابر نایاب



اُس مرد کی کہانی، جو دنیا میں خیر کا پیا میر تھا مگر.....

کالی اندھیری رات نے آخری پگلی بھری اور
مولوی چراغ دین وقت مقررہ پر جاگ اٹھا۔
چارپائی سے اٹھ کر مولوی چراغ دین نے نکلے کے

سر اور دُھند بھری رات اپنی حشر سامانیوں کے
ساتھ رخصت ہو رہی تھی سحر اپنا جلوہ افروز ہونے کی
نوید سنانے لگا۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی نے بھی زیادہ وفا نہ کی، جب چراغ دین بیسویں سال میں تھا تو حاجی غلام دین نماز ادا کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے آگے پیچھے کوئی خاص رشتے دار تھا نہیں باپ کا سایہ بھی چراغ دین سے اٹھ گیا۔

مگر اللہ کی رضا پر چراغ دین راضی رہا اور باپ کا خلا بھی چراغ دین کے لیے اذیت ناک تھا یوں چراغ دین کی زندگی غموں سے عبارت رہی مگر چراغ دین نے خندہ پیشانی سے تمام مصائب کا سامنا کیا۔ حاجی غلام دین مرحوم کی نیک نامی کو مد نظر رکھتے ہوئے گاؤں کے لوگوں نے چراغ دین کو بے آسرا نہیں ہونے دیا۔

خصوصی طور پر چودھری فلک شیر نے چراغ دین کا خوب ساتھ دیا اور چراغ دین کو اسی مسجد کا امام بنا دیا۔ چراغ دین کا کھانا چودھری فلک شیر کے گھر سے آتا تھا اور چراغ دین گاؤں کے بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتا تھا بہت ہی کم وقت میں چراغ دین کی شرافت اور پاکیزگی دیکھ کر گاؤں کے لوگ چراغ دین کی بہت عزت و قدر کرنے لگے بلکہ دین کے مسائل پوچھنے کے لیے مولوی چراغ دین کے پاس آیا کرتے۔ مولوی چراغ دین آسان لفظوں میں شرعی باتیں گاؤں کے لوگوں کا بتایا کرتا اور ساتھ یہ بھی تاکید ضرور کیا کرتا کہ نماز کی طرف آ جاؤ کیونکہ یہی ایک رستہ ہے جو کامیابی کی طرف لے جائے گا۔

مولوی چراغ دین مسجد کے ساتھ بنے ہوئے حجرے میں رہتا تھا۔

ابھی تک چراغ دین غیر شادی شدہ تھا۔ آج جب مولوی چراغ دین نے ظہر کی آذان دی تو خلاف معمول بڑی تعداد میں لوگوں کی مسجد میں آمد ہوئی چراغ دین کو بہت خوشی ہوئی، چراغ دین نے دل ہی دل میں رب کائنات کا شکر ادا کیا کہ آج کافی لوگ نماز کے لیے آئے ہیں۔ جماعت کے بعد چراغ دین نے دعا کروائی۔

جب مولوی چراغ دین نے کہا۔ اے اللہ تو ہم سے راضی ہو جا۔ ہمیں اس قابل بنا دے کہ تیرے

پانی سے وضو کیا اور پھر مسجد میں جا کر اذان دی۔ مولوی چراغ دین نے دو رکعت سنت ادا کی اور پھر نمازیوں کے آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ آج بھی فجر کے وقت صرف دو نمازی ہی مسجد میں آئے تھے۔ ایک نمازی فضل دین تھا جو کہ انتہائی ضعیف آدمی تھا مگر پھر بھی نماز مسجد میں باجماعت ہی ادا کرتا تھا۔ دوسرا نمازی چودھری فلک شیر تھا جو کہ گاؤں کی پنچایت کا سربراہ تھا۔ مولوی چراغ دین نے جماعت کروائی اور پھر سلام پھیرنے کے بعد چودھری فلک شیر سے مخاطب ہوا۔

چودھری صاحب آپ کوشش کیا کریں دو چار نمازیوں کو ساتھ میں لانے کی۔ اتنے بڑے گاؤں میں صرف دو نمازی ہی فجر کی نماز پر آتے ہیں۔“

”مولوی صاحب کیا کروں میں تو لوگوں کو بہت کہتا ہوں مگر مجال ہے جو کوئی عمل کرتا ہو مگر اب جب پنچایت لگے گی نا تو سب کو شرم دلاؤں گا۔“ چودھری فلک شیر نے در دہرے لہجے میں کہا۔

”چودھری صاحب بات شرم کی نہیں احساس کی ہے خیر یہ تو اللہ کی رضا ہے جسے چاہے تو توفیق دے، ہمارا کام تو محبت اور تحمل کے ساتھ تبلیغ کرنا ہے۔ اللہ پاک بہتر کرے گا۔“ مولوی چراغ دین نے یہ کہ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کروائی۔

مولوی چراغ دین نے اسی گاؤں میں آنکھ کھولی تھی مولوی چراغ دین کا والد حاجی غلام دین اسی مسجد کا امام تھا۔ مولوی چراغ دین جب بچپن کی دہلیز پر پہنچا تو والدہ کے انتقال جیسا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وہ وقت بہت کٹھن تھا جب ماں کی ممتا سے مولوی چراغ دین محروم ہو گیا۔ مگر باپ کی شفقت اور محبت نے مولوی چراغ دین کو ڈولنے نہیں دیا۔ حاجی غلام دین نے بڑی توجہ اور اُنسیت کے ساتھ چراغ دین کی پرورش کی اور اُسے دین کی ایک ایک بات انتہائی باریک بینی سے سمجھائی یہ باپ کی تربیت کا اثر تھا کہ چراغ دین ایک سلجھے ہوئے نیک انسان کے روپ میں ڈھلتا چلا گیا۔ حاجی غلام دین کی

غزل

اس کے سوال کا جواب دینا ہے
 بظاہر تو اسے گلاب دینا ہے
 ہوس ناچتی ہے شہر بھر میں
 آج تجھے میں اک نقاب دینا ہے
 اسے دکھانا ہے محبت کا نشہ
 اسے بھی اپنا خواب دینا ہے
 آج اس کی بھی نیند چرانی ہے
 اپنی بھی راتوں کا حساب دینا ہے
 اسے بھی ڈوبنا ہے وفا کے سنگ
 بدر آج گھرے کو چناب دینا ہے

شاعر: سید بدر سعید

شیر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا اور مقدمہ شروع ہو گیا۔
 ہجوم کے بالکل سامنے ایک عورت کالا برقع اوڑھے
 کھڑی تھی ساتھ میں اس کے دو بچے بھی تھے۔ ایک
 کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ ہو گئی دوسرا دس سال کا
 لگ رہا تھا۔ بچوں کے لباس سے غربت کی جھلک نظر
 آرہی تھی۔

چودھری فلک شیر نے کڑک دار آواز میں عورت
 سے مخاطب ہوا۔

”زبیدہ بی بی تجھ پر الزام ہے تُو نے گاؤں میں
 بدکاری پھیلائی تم۔ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتی
 ہو۔“

فلک شیر کے اس سوال پر زبیدہ کی آنکھوں میں
 آنسو کی لڑیاں شروع ہو گئیں چودھری فلک شیر کے
 ساتھ بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا۔

”بس بس یہ مگر مجھ کے آنسو مت بہاؤ۔ تیرے
 گھر میں کافی لوگوں نے اجنبی لوگوں کو آتے جاتے
 دیکھا ہے اب تُو بس اپنی فکر منا۔“

”اس کو سنگسار کر دو۔ مار ڈالو گندی عورت کو۔“
 ہجوم میں سے لوگوں نے فقرے کسنے شروع کر
 دیے۔ تب چودھری فلک شیر نے ہجوم سے کہا۔

”آپ لوگ خاموش ہو جائیں جو بھی فیصلہ ہوگا

دربار پر حاضری دے سکیں۔ تجھے سجدہ کر سکیں۔
 تیرے پیارے نبی کریم ﷺ کی سچے کے دل سے
 اتباع کر سکیں، تُو ہمیں اس قابل کر دے تو ہمیں توفیق
 دے دے۔“ یہ کہتے ہوئے چراغ دین کی آنکھوں
 سے آنسو چھلک پڑے اور پھر آمین کہہ کر دعا کو اختتام
 پذیر کیا۔

چراغ دین کی دعا نے ایک سماں باعدہ دیا سنت
 اور تو اہل ادا کرنے کے بعد تمام نمازی باری باری
 جانے لگے نماز ادا کرنے کے بعد چودھری فلک شیر
 مولوی چراغ دین کے پاس آیا تب تک چراغ دین
 بھی نماز ادا کر چکا تھا چودھری فلک شیر نے چراغ
 دین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ابھی گاؤں میں پنچایت لگ رہی ہے آپ کی
 بھی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ بھی پنچایت میں
 تشریف لائیے گا۔“ چودھری فلک شیر کی بات سن کر
 مولوی چراغ دین حیران ہوا اور فلک شیر کو کہا۔
 ”چودھری صاحب میں پنچایت میں آ کر کیا
 کروں گا۔“

تب چودھری فلک شیر نے جواب دیا کہ آج
 ایک ایسی عورت کا مقدمہ ہے جس پر الزام ہے کہ وہ
 گاؤں میں بدکاری پھیلا رہی ہے لہذا اس کا ہم نے
 فیصلہ کرنا ہے۔ آپ آئیں گے تو فیصلہ کرنے میں
 آسانی پیش آئی گی۔ تب چراغ دین نے اثبات میں
 سر ہلا دیا اور کہا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں اللہ نے
 چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔“

گاؤں کی پنچایت بیٹھ چکی تھی لوگوں کا ایک ہجوم
 اُٹ آیا تھا۔ پنچایت کے بڑے، نفاست کے ساتھ لگی
 ہوئی بڑی بڑی کرسیوں پر براجمان تھے اس پسماندہ
 گاؤں کے زیادہ فیصلے پنچایت ہی کرتی تھی۔ اکا دکا
 ہی کیس ہوں گے جن کے فیصلے عدالت میں ہوئے
 ہوں گے ورنہ یہاں مقامی پولیس کو بھی دخل دینے کی
 اجازت نہ تھی اور ویسے بھی پولیس یہاں کا رخ بھی
 نہیں کرتی تھی۔ چودھری فلک شیر کے آنے پر
 پنچایت کے باقی لوگ کھڑے ہو گئے چودھری فلک

وہ گاؤں کی بہتری کے لیے ہوگا۔ تب ہجوم میں خاموشی چھا گئی۔

”دیکھو زبیدہ تجھ پر جو الزام لگا ہے وہ کسی ایک نے نہیں لگایا بلکہ درجنوں لوگوں نے لگایا ہے اور اتنی بڑی تعداد میں لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے تم اپنی صفائی میں جو ہونا چاہتی ہو کھل کر کہو۔“ تب زبیدہ نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

لوگ ٹھیک کہتے ہیں میں سچ میں ہی ایک طوائف کا روپ دھار چکی ہوں۔ مجھے مار ڈالیں اور میرے بچوں کو بھی مار ڈالیں۔“ یہ کہہ کر زبیدہ اپنے بچوں سے بغل گیر ہو گئی بچے بھی ماں کو دیکھ کر رونے لگے۔

”یہاں گاؤں کی پنچایت کو موت کے فیصلہ پر اختیار نہیں اور نہ ہی ہم قانون ہاتھ میں لیں گے لیکن تم اپنے اوپر لگنے والے الزام کا اقرار کر رہی ہو فیصلہ تو ہوگا اور مجھے وہ بھگتنا بھی پڑے گا۔“ چودھری فلک شیر نے غصے سے زبیدہ کو کہا۔

پھر چودھری فلک شیر نے ہجوم پر ایک نظر ڈالی اور ایک آدمی کو بلا کر پوچھا۔ ”مولوی چراغ دین صاحب تشریف لے آئے ہیں یا نہیں تب آدمی نے جواب دیا، جی وہ آچکے ہیں ہجوم کے پیچھے بیٹھے ہیں تب فلک شیر نے کہا، جاؤ انھیں بلا لاؤ پھر آدمی چلا گیا اور چراغ دین کو ساتھ لے آیا۔

”مہلوی صاحب آپ نے یقینی طور پر ساری باتیں سن لی ہوں گی۔ آپ کی کیا رائے ہے اس حوالے سے۔“ چودھری فلک شیر نے چراغ دین سے پوچھا۔

”ہاں جی میں نے ساری باتیں سن لی ہیں جو الزام اس خاتون پر لگایا گیا وہ بھی اور جو خاتون نے جواب دیا وہ بھی۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”پھر کیا رائے ہے آپ کی اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ چودھری فلک شیر نے پوچھا۔

وہی سلوک کیا جائے جو انصاف کا تقاضہ ہو ورنہ روز قیامت انصاف نہ کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ چراغ دین نے چودھری

فلک شیر کو جواب دیا۔

”مگر کوئی بھی سزا تجویز کرنے سے پہلے آپ نے اس خاتون سے پوچھا ہے کہ اس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا۔“ مولوی چراغ دین نے فلک شیر سے سوال کیا۔

”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں مولوی صاحب کہ اس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا ہے، ہمیں تو جرم دیکھ کر فیصلہ کرنا ہے۔“ چودھری فلک شیر نے سرد انداز میں جواب دیا۔

پھر معاف فرمائیے گا چودھری صاحب آپ درست فیصلہ نہیں کر رہے آپ کا عدل عدل نہیں۔“ مولوی چراغ دین کے اس سوال پر ہجوم میں ایک سنانا چھا گیا چودھری فلک شیر کے چہرے پر برہمی کے آثار اُبھر آئے تب فلک شیر نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے زبیدہ سے مخاطب ہوا اور کہا۔

”زبیدہ بی بی بتاؤ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا۔ تب زبیدہ نے ہجوم کو دیکھا اور پھر چودھری فلک شیر کو در دہمراے انداز میں جواب دیا۔

”جب خاندن کی وفات کے بعد رشتہ داروں نے چند دن بعد حال تک نہ پوچھا، جب میرے بچے بھوک سے تڑپنے لگے جب گھر میں فاقے ہونے لگے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے پر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ صرف میری جوانی کی قیمت لگی۔ لوگوں کی بھوک نظر روں مٹنے اور رشتہ داروں کے طفر کے تیروں اور معاشرے کے کبھی عزت داروں نے ذلیل پر ذلیل کیا تو میں ذلیل ہونے پر مجبور ہو گئی مگر یہ سب کچھ اپنے بچوں کی بھوک کی خاطر کیا ورنہ مجھے تو بھوکا مرنا منظور تھا۔ یہ ہے میرا جرم اور مجھ پر الزام عائد کرنے والے زیادہ تر وہی ہیں جو رات کے اندھیرے میں میری شرم کو تار تار کرتے رہے۔“

زبیدہ کے اس جواب پر چودھری فلک شیر حیران پریشان ہو گیا اور ہجوم پر بھی خاموشی چھا گئی کافی لوگوں کے سر جھک سے گئے۔

”سن لیا آپ نے اس خاتون کا اقرار جرم اگر یہ مجرم ہے تو اس سے پہلے آپ سب گاؤں والے

مجرم ہیں جنہوں نے اس خاتون کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا مفلسی سے تو ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ نے بھی پناہ مانگی تھی، تنگ دستی اور غربت تو اللہ معاف فرمائے کفر تک لے جاتی ہے آپ کا ہمسایہ بھوکا سوتا رہا اور آپ پیٹ بھر کر کھاتے رہے..... ہمارا پورا گاؤں اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اگر اس خاتون کو سزا دینی ہے تو سب پہلے آپ سب اپنے آپ کو سزا دیں۔“ مولوی چراغ دین کی ان باتوں نے سب کو چھوڑ کر رکھ دیا۔

”آپ سچ کہتے ہیں مولوی صاحب میں واقعی درست انصاف نہیں کر پایا۔ آج سے میں اس انصاف کی کرسی کا اہل نہیں مگر ذاتی طور پر ایک بات کا ضرور اہل ہوں۔“ یہ کہہ کر چودھری فلک شیر گری سے اٹھ کھڑا ہوا اور زبیدہ کے پاس جا کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”آج سے تم میری بیٹی ہو۔“ یہ سن کر سب میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی لوگوں نے چودھری صاحب زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہ سن کر زبیدہ رونا شروع ہو گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

”چودھری صاحب میں کسی کی بیٹی بننے کے لائق نہیں میں داغدار ہو چکی ہوں۔ آپ کیوں اپنی عزت کو زسوا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی کر چکی ہوتی۔“

”اللہ پاک جب اپنے کسے بندے پر کرم اور فضل والا معاملہ فرماتے ہیں تو اُس کو یوں نہیں ٹھکراتے۔ چودھری صاحب نے جو عظیم فیصلہ کیا ہے اسی میں ہی آپ کی اور ہم سب کی بھلائی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے تمہیں تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے والا کرم فرما دیا۔ اب مایوسی والی باتیں مت کرو اور جو مل رہا ہے اُسے قبول کر لو۔“ مولوی چراغ دین نے زبیدہ کو کہا، تب زبیدہ نے سر جھکا لیا اور پھر کہا،

”ٹھیک ہے مگر میں تو ساری زندگی چودھری صاحب پر بوجھ بنی رہوں گی۔ مجھے تو کوئی اپنا بھی نہیں سکتا۔ میرے گناہوں کا بوجھ کون اٹھا سکتا ہے۔“

جب مولوی چراغ دین نے جواب دیا۔ ”ندامت کا ایک آنسو، توبہ کا ایک لفظ انسان کے تمام گناہوں کا مداوا کر سکتا ہے اگر وہ سچے دل سے رب کائنات سے معافی مانگ لے۔ اُس کے حضور پیش ہو کر سچے دل سے توبہ کر لے اللہ پاک بہت رحیم ہے اُسکی رحمت انمول ہے آپ اللہ پاک سے توبہ کریں وہ اپنے بندوں کو ضرور معاف فرما دیتا ہے ایک بار بندہ اُس کے دربار میں پیش ہو کر اُس سے معافی مانگے تو سہی اور میں چودھری فلک شیر کے توسط سے آپ کو نکاح کا پیغام دیتا ہوں۔ اگر آپ رضامند ہیں تو میں فی الفور آپ کو اپنی منکوحہ بنانا چاہتا ہوں۔“ مولوی چراغ دین کی اس بات سے تو گویا ایک دھماکہ سا ہو گیا۔ لوگ حیران ہو کر مولوی چراغ دین کو دیکھنے لگ گئے تب چودھری فلک شیر نے چراغ دین کو خود سے بغل گیر کیا اور زبیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بس اب گھر چلو، میرے ساتھ اب میں تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا۔“ تب زبیدہ کی آنکھوں سے زار قطار آنسو بہنے شروع ہو گئے جو کہ خوشی کے آنسو تھے چودھری فلک شیر زبیدہ کو لے کر گھر چلا گیا اور دوسرے ہی دن سادگی کے ساتھ مولوی چراغ دین کے ساتھ زبیدہ کا نکاح ہوا۔

مولوی چراغ دین نے اسی رات شکرانے کے نوافل ادا کیے خالق کائنات کا شکر ادا کیا جس نے ایک بڑے امتحان میں چراغ دین کو سرخرو کر دیا گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں مولوی چراغ دین کی عزت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ زبیدہ مولوی چراغ دین کے نام کے ساتھ منسوب ہو کر شرم و حیا کا ایک پیکر بن گئی۔ زبیدہ گھنٹوں سجدے میں پڑے اللہ پاک کا شکر ادا کرتی رہتی جس نے ایک نئی خوبصورت زندگی بخشی۔ انسان کے گناہوں کی طوالت کتنی بھی ہو مگر رب کریم کی رحمت کی وسعت انسان کے سوچ و خیال سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

☆☆☆

نصیب میں نہیں ہے جو.....



مور شاہد حسین

اُس مرد کی کہانی جس کی پہلی محبت ہی زمانے کی دھول بن گئی تھی

آٹھویں جماعت کے ایگزام دینے کے بعد فرمان چھٹیوں پر اپنے گاؤں چلا گیا۔ جب اس کی واپسی ہوئی وہ ساتھ میں اپنی چھوٹی بہن فرزانہ کو بھی پڑھائی کی غرض سے بہاولپور لے آیا تھا۔ فرزانہ کو پیار سے سب فری بولتے تھے۔ وہ جوانی کی دہلیز کو چھو رہی تھی۔ پانچ فٹ سے لگتا ہوا قد، تندرست و توانا جسم، اونچی ناک، کشادہ پیشانی، سیاہ گھنے بال، سفید دانت، گلابی رخسار، مسکراتی آنکھیں، کتابی چہرہ، ہونٹ جیسے پھول کی دو پتیاں رکھ دی گئی ہوں اور ان کے درمیان شیرینی بھردی گئی ہو۔ اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ وہ حسن کی مالک تھی اس کی رسی مسکراہٹ اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیتی تھی۔

جب میں نے فرزانہ فری کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دیکھا ہی رہ گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس نے مجھے اس طرح گھائل کر دیا تھا کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میرے دل میں ابھرتے جذبات میرے لیے بہت اونگھے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میرا دل اس کی طرف کیوں مائل ہوتا جا رہا ہے۔ میں دن بدن اس کی طرف کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ میں اسے دیکھوں، اس سے ملوں بات

میرا نام ساحل عباس ہے۔ میرا تعلق اچھے گھرانے سے ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر چوتھا ہے۔ ابو ذرا شور ہیں اور بڑا بھائی سرکاری ملازم ہے۔ میں بھی ایک کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہے۔ ہمیں بھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں پرسکون ماحول ہے۔ ہم سارے بہن بھائی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو اپنی زندگی سے جڑی ایک حقیقی آپ بیتی سناؤں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میں اور بڑوسی دوست فرمان جو اپنے ماموں کے گھر پڑھائی کی غرض سے رہتا تھا۔ اسکول اکٹھے آتے جاتے تھے۔ ہماری دوستی مثالی تھی۔ اسکول کے بعد ہمارا سارا دن گھومنے پھرنے میں گزر جاتا تھا۔ رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر بھی بے دھڑک چلے جاتے تھے کیوں کہ فرمان کا ماموں برسوں سے ہمارے پڑوس میں رہتے تھے وہ اچھے مزاج اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔



کروں مگر میں خود کو ملامت کرتا کہ اس کے دل میں میرے لیے ایسا کچھ بھی نہیں ہے تو میرا دل کچھ دن بہل جاتا تھا مگر جب وہ نظر سے گزرتی تھی تو دل میں پھر وہی تماشا شروع ہو جاتا تھا۔ میرا دل اس کے لیے بہت بے چین بے قرار رہنے لگا۔ میں نے کئی بار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کا سوچا مگر ہمیشہ اس کے سامنے آتے ہی میری ساری ہمت گھوکھلی ہو جاتی تھی پھر میں اگلی بار اظہار کرنے کی خود سے قسمیں کھاتا مگر میں یہ سب دل میں سوچ کر رہ جاتا تھا۔

رات کی تنہائی میں جب میں دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹتا تو وہ خیال بن کر چھا جاتی تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں اس سے اظہار محبت نہ کر پاتا۔ یوں چھ ماہ گزر گئے۔ میرے دل میں خاموش محبت کے سمندر تھے۔ میں اسے دیکھتے دیکھتے اس پر قربان ہو جاتا تھا۔ اسے دیکھے بغیر میرا دل اداس اداس رہتا تھا۔ میں کسی نہ کسی بہانے ان کے گھر جاتا تھا یوں کسی نہ کسی بہانے اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ دل کرتا تھا وہ صرف باتیں کرتی رہے اور میں اس کی خوب صورت آواز سنتا رہوں۔

فرزانہ جب بھی میرے سامنے آتی تھی میں اسے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ جانے اس میں کون سی کشش تھی کہ میں اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اس کو خط لکھا جو ایک بچے کے ہاتھوں اس تک پہنچایا تھا۔

دل و جان!
السلام علیکم

جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا میرے دل میں ایک ہلچل سی گنج گئی تھی اور تم اس پہلی ہی نظر میں میرے دل میں اتر گئی ہو۔ میرا دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے میں تمہیں پہلی نظر میں دل دے بیٹھا ہوں۔ تم میری ہر سوچ اور خیال میں ساتھ ساتھ رہتی ہو۔ میں دل ہی دل میں تمہیں پانے کی خدا سے دعائیں مانگتا ہوں۔ جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تمہارا خوب صورت سا چہرہ میرے سامنے مسکراتا ہے۔ مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ شاید تم

میرے خیالات کو نہ سمجھو میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں بس اتنی سی التجا ہے کہ پیار کا جواب پیار سے دینا۔

تمہارے پیار کا طلب گار

ساحل عباسی

فرزانہ فری تک خط پہنچ چکا تھا۔ میں اس کے جوابی

محبت نامے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دو سے تین دن گزر

گئے۔ اس کا کوئی جوابی محبت نامہ نہیں ملا۔ میں ڈر کے

مارے ان کے گھر بھی نہیں جا رہا تھا۔ یوں اس دوران میں نے دوسرا محبت نامہ لکھنے کا ارادہ کیا اس میں لکھا تھا۔

دل و جان!
السلام علیکم

میں اس امید سے خط تحریر کر رہا ہوں کہ تم جواب ضرور دو گی۔ نہ جانے تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو بس جو میرے دل میں ہے سچائی کے ساتھ کہہ دیا آگے تمہاری مرضی ہے۔ میرے بارے میں جو رائے رکھو اگر تم میرے سچے پیار اور محبت پر یقین رکھتی ہو اور مجھ سے محبت کرتی ہو پلیز جواب ضرور دیجئے گا ہاں اگر تمہیں مجھ سے کوئی بھی شکوہ شکایت یا کسی قسم کا اعتراض ہو بے شک بتا دو۔ میں تمہاری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔

جواب کا مختصر
ساحل عباسی

جس دن دوسرا محبت نامہ فرزانہ فری کی نظر سے گزرا اسی دن کی شام کو اس کا جوابی محبت نامہ ملا تھا اس نے لکھا تھا۔

دل و جان!
و علیکم السلام

میں نے جب تمہیں دیکھا تھا تم بہت اچھے لگے تھے۔ میرے دل میں بیٹھا بیٹھا درو جاگ اٹھا تھا اور اپنے اندر ایک انجانی سی کسک محسوس ہوئی کہ تم مجھے اچھے کیوں لگتے ہو۔ جب تم میری آنکھوں سے اوچھل ہوتے ہو میں تمہارے ہی خیالوں میں گم ہوتی ہوں اور اداس اداس رہنے لگتی ہوں۔ تمہارا ہی خیال ستاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور میں تمہارے پاس اڑ کر آ جاؤں جب تم میری نظروں کے سامنے ہوتے ہو۔ میں تمہیں ہی دیکھتی رہتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم صرف میرے لیے بنے ہو میں تمہارے ہی سینے دیکھتی ہوں۔ میری نظر میں تمہارا مقام بہت بلند ہے اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بے پناہ محبت کرتی ہوں۔

تمہاری پیار کی طالب
فرزانہ فری

اس کا جوابی محبت نامہ پڑھ کر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور خوشی سے آنکھیں پر نم ہوئیں۔ یوں محبت ناموں کے ذریعے ہماری محبت پروان چڑھنے لگی۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا میں ان کے گھر روز جاتا تھا ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو جاتے تھے۔

روز بروز ہماری محبت میں شدت آنے لگی تھی اور وقت بھی بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہم اسکول سے کالج پہنچ چکے تھے۔ پھر ہم کالج ٹائم میں ملاقاتیں کرنے لگے یوں ہماری ملاقاتوں کا بھی سلسلہ چل نکلا۔ ملاقاتیں معمول بن گئی تھیں اس کے علاوہ وہ بہانے بہانے ہمارے گھر کا چکر لگا لیا کرتی تھی یا میں ہی ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ ہم ہر بار ملنے کے نئے نئے بہانے تلاش کرتے تھے۔ ہم جب تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے تھے بے چین رہتے تھے۔ جب ہم ملتے تھے ایسے لگتا تھا جیسے یہی زندگی ہے۔ دل کرتا تھا وقت رک جائے اور ہم اس طرح خوشیاں سمیٹتے رہیں ہم ان لمحوں سے لطف اندوز ہوتے تھے ہر موسم بہار بہار لگتا تھا اور دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ جب وہ مجھے اپنی نازک سی بانہوں میں لیتی تھی جیسے میرے بدن میں بجلی سی دوڑنے لگتی تھی۔

میں اور فرزانہ فری جب بھی ملتے تھے ہمیں وقت، حالات اور لوگوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز ابو اور میرے علاوہ گھر کے سارے افراد ماموں زاد کی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ ابو حسب معمول اپنی گاڑی سے گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ موقع دیکھ کر فرزانہ فری کو اپنے گھر بلا یا تھا۔ وہ سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ہمارے گھر چلی آئی تھی۔ ہم کمرے میں بیٹھے تھے۔ بمشکل پندرہ منٹ گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم بری طرح چونکے خوف سے ہم ایک دوسرے کا چہرہ تک رہے تھے اتنے میں ابو کی آواز ابھری۔

”ساحل بیٹا دروازہ کھولو۔“

ابو کی آواز سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم دونوں بری طرح کانپ رہے تھے۔ مجھے ہمت

کوٹھی۔

”فرزانہ..... فری!“ میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ کانپ رہی تھی۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہمارے سامنے اس کی چھوٹی خالہ کھڑی تھی۔ ہم شرم اور خوف سے چور چور تھے مگر خالہ نے تھوڑا برا بھلا کہنے کے بعد کسی کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔

میں نے جب فرزانہ فری کے بارے میں اپنے گھر والوں کو بتایا اور اس سے ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا اس بات پر گھر کے بڑوں سے ڈانٹ بھی پڑی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی تھی۔ دوسری طرف جب اس کے گھر والوں کو ہماری محبت کا علم ہوا، بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ایک زلزلہ آیا تھا میری اور فرمان کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ فرزانہ فری پر پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس کے ابو غصے سے آگ بگولہ ہوئے انہوں نے اپنی بیٹی کو گاؤں بلا لیا۔ اس کو بے دردی سے مارتا شروع کر دیا۔ وہ زخموں سے چور ہو کر نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا اور اس کی جلد سے جلد شادی کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور چند ہی دنوں میں اس کے اپنے خالہ زاد سے نکاح کر دیا گیا۔

ان دنوں سے میرے دل و دماغ پر اداسی چھائی رہتی ہے وہ مجھ سے جب سے جدا ہوئی ہے اس کی یادیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ یوں اکیلا ہی نہیں ہونے دیتی ہیں۔ آج بھی اس کی مصیبت میرے حواس پر چھائی رہتی ہے اور اس کی محبت دل میں اٹھ آتی ہے۔ کبھی کبھی دل اس سے ملنے کے لیے بے چین بے تاب کر دیتا ہے مگر میں دل کی اس خواہش کو ہمیشہ روکے رکھتا ہوں کہ کہیں اس کی پرسکون زندگی میں کسی قسم کی پہلچ نہ بچا دوں۔ بس میں نے قدرت کے فیصلے اور تقدیر کے لکھے کو ہنسی خوشی قبول کر لیا ہے میں اپنے رب کی اس رضا پر بخوشی راضی ہوں۔

فرزانہ فری آج اپنی نئی زندگی میں بہت خوش ہے میں بھی اپنے رب سے گڑگڑا کی خوشیوں کی دعائیں مانگتا ہوں اور میری تمام قارئین سے التماس ہے کہ اس کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

نہیں ہو رہی تھی کہ جا کر دروازہ کھولوں۔ وہ سردیوں کے دن تھے ہمیں پسینے چھوٹ رہے تھے۔ گھر کے تمام گرم بستر پڑے تھے۔ میں نے وہ سارے اس کے اوپر ڈالے وہ بھی ان کے نیچے لیٹ کر چھپ گئی جب مجھے اطمینان ہوا تو میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ابو گاڑی کے ضروری کاغذات بھول گئے تھے وہ لینے آئے تھے جب ابو چلے گئے تو میں نے فرزانہ کے اوپر رکھے بستر اٹھائے تو میرے حواس خطا ہو گئے۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر چھینٹے مارے پھر جی اسے ہوش نہیں آیا۔ میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے میں نے دو ہاتھ اٹھائے اور گڑ گڑا کر دعا مانگی اس کے بعد میں نے چند قرآنی آیات پڑھ کر اس پر دم کیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کو پانی پلا یا جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔

ہمارے وہ دن خوشیوں کے پینڈولے میں جھولتے ہوئے گزرے تھے۔ ہمیں ایسے لگتا تھا جیسے یہی زندگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے جاچتے تھے۔ دن بدن ہماری محبت میں شدت آنے لگی۔ ہم راتوں کی تارکی میں بھی ملتے تھے لیکن ہماری محبت بالکل پاکیزہ تھی۔ ہم نے کبھی بھی برے خیالات سے ایک دوسرے کو چھوڑا تک نہیں تھا وہ قسمیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلانی تھی اکثر کہتی تھی۔

”جان چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے میں صرف تمہاری ہوں اور تمہاری ہی دلہن بنوں گی۔ جب وہ دلبرانہ انداز میں بلاتی تھی میں خوشی سے سرشار ہو جاتا تھا اور اسے گلے لگا کر اپنی محبت کا بھی اظہار کرتا تھا ہم ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ ایک رات میں اور فرزانہ فری اس کے کمرے میں بیٹھے اپنے ارد گرد ماحول سے بے نیاز ہو کر محبت کی میٹھی میٹھی باتوں میں مصروف تھے۔ میں اس کے زانوں پر سر رکھ کے لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے بانوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اچانک کمرے میں غصے سے بھرپور آواز

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

بادبان

نورمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،
جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(ساتواں حصہ)

Downloaded From
Paksociety.com



خاموشی پھیل چکی تھی۔
 ”چینیلی خیریت تو ہے۔“ رانی نے ابھی
 آدھے لفظ ہی ادا کیے تھے کہ چینیلی بلک بلک کر
 رونے لگی۔

”رانی نے بڑی آپا کا ثبوت دیا سب کو
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چینیلی کا سر اپنے ساتھ
 لگا کر آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگی۔ چینیلی روٹی رہی،
 روتی رہی۔ رانی نرمی سے چینیلی کے بال سہلاتی
 رہی۔

تمام نفوس کے ذہن میں موجود سوال تحلیل
 ہونے لگے تھے۔ چینیلی کا یوں بلک بلک کر رونا
 وضاحت کر رہا تھا کہ وہ مہمان بن کر نہیں آئی۔

کسی کو کچھ کہنے یا بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی
 عقدہ آپ ہی کھل گیا تھا۔ چینیلی لوٹ آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

دقت کے پاؤں بھی کبھی رکے ہیں۔ وہ تو اپنا
 سفر جاری رکھتا ہے۔ دن گزرتے گئے، زوار کو
 عدم سدھارے دن مہینوں میں بدلنے لگے۔
 چینیلی کہاں گئی؟ یہ سوال کسی نے نہ اٹھایا جیسے کبھی
 چاہتے ہی یہی تھے کہ چینیلی کو چلے جانا چاہیے۔
 ایک سفر کا دل تھا جو بے چین ہوا۔ آخر سونی
 مرحوم باپ کی محبوب بیٹی تھی۔ اور اب شاید سفر
 کی ذمہ داری بھی۔

”رہنے دو سفر، گڑے مردے مت
 اکھاڑو۔“ اس نے فاخرہ سے چینیلی کا ذکر کیا تھا تو
 فاخرہ نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔ اور اس سفر
 مزید کچھ کہہ سکا اور نہ کچھ کر سکا۔

سدرہ کے رشتہ ٹوٹنے کی خبر بھی خاص و عام
 تک پہنچ چکی تھی۔ زوار کے چالیسویں پر صدر آئے
 تو کئی باتوں کے درمیان انہوں نے فاخرہ سے یہ
 بھی کہا۔

”بھابی میرا احمد سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ احمد اور
 سدرہ کی جوڑی چاند سورج کی ہی جوڑی ہوگی۔“
 فاخرہ نے دیور کو کوئی جواب تو نہ دیا البتہ سوچتے
 ہوئے سر ہلا دیا۔

”روزی تو ہی آکر میرا ہاتھ بنا دے تم سے
 جب کبھی کچھ بناتی ہوں، اپنی جان پر ہی ظلم کرتی
 ہوں تمہارے نکلے بس کھانے کے لیے آجاتے
 ہو۔“ دیکھی میں ڈوئی کھاتے ہوئے چندہ چلا رہی
 تھی کسی نے چندہ کے چلانے کی پرواہ نہ کی۔ اپنے
 آپ میں مست رہے۔

چینیلی قدم قدم چلتی آئی اور صحن کے پیچوں و بیچ
 کھڑی ہو گئی۔ آمنے سامنے موجود کمروں کے
 درمیان ٹوٹا پھوٹا صحن اور سامنے موجود باورچی
 خانے میں سالن میں چھج ہلاتی چندہ اور کمروں کی
 کھڑکیوں پر نکلنے شوخ رنگ کے پردے سب کچھ
 دیکھا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گئی تھی۔

آنکھیں آنسوؤں سے بلا وجہ بھری جا رہی
 تھیں، جیسی کمرے سے سیفی نکلا اور چینیلی کو یوں صحن
 میں کھڑے دیکھ کر چلا اٹھا۔

”چینیلی تو! میری بہن۔۔۔۔۔۔“ سیفی کی
 آواز میں جوش کا عنصر غالب تھا۔ آگے بڑھا اور
 جھٹ سے چینیلی کے گلے لگ گیا۔ سیفی کی آواز
 پورے گھر میں گونجی تھی۔ چولہے کی آج دیسی کرتی
 چندہ مسکراتے ہوئے باہر آئی۔ کمرے میں اپنے
 اپنے کاموں میں مصروف رانی اور روزی نے بھی
 باہر صحن کا رخ کیا تھا۔

”چینیلی تجھے دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے،
 تجھے بتا نہیں سکتے۔ کیسے اچانک ہمیں چھوڑ کر چلی گئی
 تھی۔ قسمت یوں بدلتی ہے۔ سچ بولو تو اس سے
 پہلے یقین ہی نہ تھا۔“ چندہ گلے لگی تو کتنی دیر ساتھ
 لگی کھڑی رہی۔

کبھی خوش تھے۔ خوشی ان کے ہر ہر انداز سے
 جھلک رہی تھی۔

”چینیلی تو مہمان خاص ہے۔“ چینیلی کو کھینچتے
 ہوئے چار پائی پر بٹھایا۔ ”چینیلی بڑے ٹھیک ٹائم پہ
 آئی ہے میں نے مغز پکایا ہے۔ مل کر مزے سے
 کھائیں گے اور تیرے سوا کسی کو نہیں کھلاؤں گی۔
 کسی نے میرا ہاتھ نہیں بٹھایا۔“ چندہ اپنی دھن میں
 کہے جا رہی تھی بھی رانی کو شک سا ہوا کہ چینیلی کی

کوشش کی تھی کہ کہیں کمی نہ رہ جائے اور اس نے محض اپنی محنت پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ دعاؤں پر بھی بھروسہ کیا تھا۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ہر نماز کے بعد لمبی لمبی دعائیں مانگی تھیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر سجدے کیے تھے اور خدا سے صرف ایک ہی چیز مانگی تھی۔

کامیابی۔

مگر کامیابی نصیب میں نہیں تھی۔

نتیجہ آیادعا امتیازی پوزیشن سے پاس تھی اور اس فرنا کام تھا۔ وہ تحریری امتحان ہی پاس نہ کر پایا تھا۔

دکھ کا ایک گہرا سمندر تھا جس میں اس فر غوطے لگا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ زندگی شاید ناکامیوں کا منہ دیکھنے کے لیے ہی بنی تھی۔ ناکامی ایک ایسا زہر ہے جس کا تریاق نہیں ہوتا۔

دعا کو اپنی کامیابی کی اتنی خوشی نہ ہوئی جتنی اس فر کی ناکامی کا دکھ ہوا۔ اس فر اس سے الگ تھوڑی تھا۔ کاش کہ اس فر کامیاب ہو جاتا یا پھر وہ ہی ناکام ہو جاتی۔ سوچیں تمہیں کہ لامحدود اور ہر سوچ کے پیچھے ایک کسک چھپی تھی۔ بہر حال انسان سے زیادہ بے بس کوئی اور مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔ دل میں بار بار بار خواہش جاگی اس فر سے رابطہ کرے۔ فون پر ہی سہی مگر ہمت نہ ہوئی۔

صاعقہ بے انتہا خوش تھی۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنا معمولی بات تو نہ تھی۔ انٹرویو اور انٹرویو کے بعد ٹریننگ وہ وقت دور نہ تھا جب ان کی بیٹی افسر ہوتی۔ خوشی ان کے ہر ہر انداز سے چھلکتی تھی۔

خوب سارا وقت صرف کر کے انہوں نے بادام کی تہہ در تہہ برتوں والا ایک بنایا۔ چکن جنجر دعا کی پسندیدہ ڈش تھی وہ بھی خوب لگن سے بنائی، فرقان، حنان اور والد صاحب بیش قیمت تحائف لیے دعا کے منتظر تھے۔ Princess of the day جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر خوشی کی وہ رمتق نہ تھی۔

ساتھ بیٹھی ہوئی راشدہ کا دل بھی عجب لے میں دھڑکا تھا دل تو چاہا تھا۔ اس فر کے لیے اپنی خولہ کا بھی تذکرہ کر دیں مگر وضع داری مانع آگئی۔

بی اے کا رزلٹ آ گیا اور سی ایس ایس کا تحریری امتحان بھی قریب آچکا تھا۔ اس فر نے عملی طور پر دل کو سنبھالتے ہوئے توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کی اور شب و روز پڑھائی کو دینے لگا۔

انہی دنوں دعا نے باقاعدگی سے چکر لگانے شروع کر دیے۔ کتابیں ساتھ لائی اور جہاں اس فر بیٹھا پڑھ رہا ہوتا وہاں کتاب کھول کر پڑھنے لگ جاتی۔ رفتہ رفتہ ہال کمرے میں پڑا صوفہ مخصوص ہو گیا۔ ایک روٹین ہی بن گئی۔ دعا دس بجے صبح تک آ جاتی اور شام چھ بجے تک دونوں کزنز اکٹھے مل کر پڑھتے دوپہر کا کھانا بھی ساتھ کھاتے۔ شام کو حنان یا فرقان لینے آتے اور دعا چلی جاتی۔

اس فر کی اچھی تیاری تھی۔ اس فر پر امید تھا اور دعا، دعا گو تھی کہ اس بار ہاں اس بار اس فر کو کامیابی ملتی چاہیے۔ اسی لیے تو وہ ان چیزوں پر گھنٹوں صرف کرتی، خوب ڈسکشن کرتی جو اس فر کی کمزور ہوتیں۔ ہر روز واپس اپنے گھر جاتے ہوئے دعا کو محسوس ہوتا اس کے دل میں اس فر کی محبت بڑھ رہی ہے اور وہ روزانہ جانے سے پہلے کہتی۔

”اس فر میں تم سے بے حساب محبت کرتی ہوں۔“ اس فر سے نہیں کہتی تھی، خود سے کہتی تھی دل میں۔

وقت سرک رہا تھا، سرکنا گیا یہاں تک کہ سی ایس ایس کا تحریری امتحان بھی آ گیا۔

☆.....☆.....☆

سی ایس ایس کا امتحان ملک بھر سے ذہین و فطین لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیتی ہے۔ کیا ڈاکٹرز، کیا انجینئرز، کیا وکلاء اس دوڑ میں کبھی شامل ہوتے ہیں۔ اتنے سارے ذہین و فطین لوگوں کی موجودگی میں اس فر جیسے متوسط صلاحیتوں والے لڑکے کو بھلا کہاں کامیابی نصیب ہوتی تھی۔ اس فر نے انتھک محنت کی تھی دعا نے بھی بھرپور

تمہیں منتقل کروا دیتی ہوں۔ میرے ریٹائرمنٹ کا سال بھی تو بس آ ہی چکا ہے۔ ٹیچنگ براپروفیشن نہیں دنیا کے بہترین پروفیشنرز میں مانا جاتا ہے۔“

اسفر ہنوز سر جھکائے بیٹھا رہا۔
 ”تم ایم اے، ایم ایڈ کر لو تب تک سیٹ تمہیں منتقل ہو جائے گی ایم اے کون سا مشکل ہوتا ہے۔ اگر تمہیں مناسب لگے تو ساتھ ساتھ دکان پر بھی چلے جاؤ۔ زوار کے جانے کے بعد دکان بند ہی پڑی ہے۔ دکان میں کچھ اور سامان ڈالوا لیتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت آمدنی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ پڑھائی کے ساتھ دکان دیکھ لیا کرو گے؟“
 قاخرہ بیٹے پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ مگر چارہ بھی نہ تھا۔ مشکل وقت کے لیے کی گئی پختہ لگ بھگ ختم ہو گئی تھیں۔

”اگر دوہری ذمہ داری نہ ادا کر سکو تو کوئی بات نہیں۔ ابھی ایم اے تو کرو دکان کو اور میں۔۔۔۔۔“ قاخرہ کی بات درمیان میں رہ گئی اور اسفر بول پڑا۔

”نہیں امی، کسی قسم کا بوجھ نہ ہوگا۔“ میں دونوں کام باسانی کر لوں گا۔“ وہ لڑکا جو ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ سرکاری افسر لگنا چاہتا تھا اس کے نصیب میں موبائل اسسٹنٹ اور ایڑی لوڈ کی دکان ہی تھی۔
 قاخرہ نے کچھ پیسوں سے دکان میں مزید سامان ڈالوا دیا۔ اور اسفر دکان میں اس سیٹ پر بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرنے لگا جس سیٹ پر بھی زوار بیٹھا کرتے تھے۔

”یہاں پر تمام کمپنیوں کے ایڑی لوڈ دستیاب ہیں۔“ چارٹ پر لکھے خوشخط الفاظ کو بے خیالی سے دیکھتا رہتا۔

ایم اے کی کتابیں اس نے خرید لی تھیں۔ کبھی کبھار کتاب لے کر دکان پر جاتا۔ لیکن ابھی تک کتاب کھول کر نہ دیکھی تھی۔ پڑھائی سے جیسے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہی تو وقت تھا حال دل بتانے کا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ گھر کے تمام افراد سیلبریشن کے لیے کمرے میں جمع تھے جب حنان نے پوچھا تھا۔

”ہوں وہ سر میں شدید درد ہے“ دعا کو بروقت بہانہ سوچھا اور چہرے پر ایک پھینکی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
 ”ڈاکٹر کے پاس چلیں۔“ حنان بہن کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے اسی وقت تیار ہو گیا۔
 ”نہیں، پین کلر لی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ سوری میں آج یہاں زیادہ وقت نہیں بیٹھ پاؤں گی۔“ دعا لب کھلتی کہہ رہی تھی۔ صاعقہ نے دھیان سے بیٹی کو دیکھا تھا۔ وہ درد سے کم اور دکھ سے بے حال زیادہ نظر آتی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ ایک کاٹ لو، پھر چلی جانا، لیکن ہم لوگ تو تمہاری کامیابی کا جشن منائیں گے ایسے مواقع روز روز تھوڑی آتے ہیں۔“ فرقان نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے ایک بہن کی طرف سر کا یا تھا۔

”ضرور“ ایک کاٹتے ہوئے بھی دعا کے لبوں پر پھینکی مسکراہٹ ہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”دل چھوٹا مت کرو اسفر یہ سب شاید تمہارے نصیب میں نہیں تھا۔“ قاخرہ کو بیٹے کی ناکامی کا دکھ تو ہوا۔ دل میں قلق بھی جاگا۔ لیکن بیٹے کو اس نے دلا سے بھی دیے۔ بہر حال اب دلاسوں کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ یوں بھی زوار کی وفات کے بعد قاخرہ کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔

اسفر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔
 ”زندگی گزارنے کا سامان تو کرنا پڑے گا۔ سب کچھ ویسا ہوتا جیسے انسان کی خواہش ہوتی تو انسان خود کو خدا سمجھنے لگ جاتا۔“ اسفر کے ساتھ ساتھ قاخرہ یہ باتیں خود کو بھی باور کروا رہی تھیں۔

”میری سرکاری ٹیچر کی سیٹ تو ہے ہی۔ وہ

بلکے رنگ کی لب اسٹاک، تھوڑا سا بلش آن اور آنکھوں میں کاجل بھی ڈال لیا۔ پیروں کو کھسوں میں مقید کیا۔ خوشبو کا انتخاب کرتے ہوئے بھی وہ کئی لمحے سوچتی رہی اور بالآخر ہیوگو باس منظور نظر ٹھہری۔ مکمل تیاری کے بعد اس نے خود کو دیکھا تو بھی مطمئن نہ ہوئی۔

دل دھڑک رہا تھا، دعا نے دھڑکنے دیا۔
تجھی صاعقہ کمرے میں آئی۔ بہن سے ملنے کی نیت سے وہ بھی بیٹی کے ساتھ فاخرہ کے گھر جا رہی تھی۔

”ماشاء اللہ میری بیٹی پرستان کی شہزادی سے کم خوبصورت نہیں لگ رہی۔ میں اپنی نظر نہ لگا دوں۔“ صاعقہ نے مسکراتے ہوئے نظر ہٹائی مبادا نظر لگ ہی نہ جائے۔ دعا جھینپ گئی۔
”امی زیادہ اوور تو نہیں لگ رہی۔“ دعا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میری بیٹی اب تو یوں بھی افسر لکنے والی ہے اب تو تمہیں ہر وقت ایسے جج درج کر ہی رہنا چاہیے۔“ صاعقہ قریب آئی اور بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ اور جب دعا گاڑی میں ماں کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اسفر کی طرف جا رہی تھی تب صاعقہ نے اسے بتایا تھا۔

”تمہیز کو تو تم جانتی ہو، فورتح فلور میں رہنے والے پاشا صاحب کا بیٹا۔“ گاڑی چلاتے ہوئے صاعقہ کی نگائیں وٹڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

”جی“ دعا کا انداز سرسری تھا۔ وہ جن خیالوں میں کھوتی تھی وہ دلربا سے تھے۔

”چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ الائیڈ بینک کی مین برانچ میں منیجر ہے، فرمانبردار لڑکا ہے، جب بھی اس سے ملاقات ہوئی ہمیشہ ادب سے ملا ہے۔“ صاعقہ نے ایک جاچتی نظر بیٹی پر ڈالی تھی اور پھر سے وٹڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی تھیں۔ دعا کے لیے یہ شان شاہی تھا وہ اسفر کو سوچے گئی۔

”کل پاشا صاحب نے تمہارے ابو سے کہا

”اسفر مجھے تم سے خاص کام ہے، میں کل تم لوگوں کی طرف آؤں گی۔“ دعا نے سونے سے پہلے اسفر کو پیغام بھیجا تھا اور موبائل میں موجود اسفر کی ایک تصویر زوم کر کے دیکھنے لگی تھی یہ عام سے حلیے میں بنائی گئی اسفر کی تصویر تھی، ان دنوں کی تھی جب وہ سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔

سرخ گول گلے والی ٹی شرٹ میں سر کتاب پر جھکائے، چہرے پر سنجیدگی، بکھرے ہوئے بال۔
اسفر کے بال گھنے تھے، اس قدر گھنے کے کوئی ہیئر اسٹائل جم ہی نہ پاتا تھا اور بال اکثر و بیشتر یونہی پیشانی پر بکھرے پڑے ہوتے۔

موبائل کو بیڈ کی سائڈ پر رکھنے کے بعد دعا نے کمبل تانا، کروٹ بدلی اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔

”اسفر ضرور حیران ہوگا۔ کیا پتا وہ واقف ہی ہو اور کیا پتا ایسے ہی جذبات اس کے دل میں بھی ہوں۔ آخر کی کیا ہے مجھ میں۔“ دل معصوم خوبصورت سے خوبصورت سوچ بنا رہا۔ ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ چھائی رہی اور یونہی دعا نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

صبح تیار ہونے کے لیے وہ لباس منتخب نہ کر پار ہی تھی۔ جو سوٹ پسند آتا وہ اوور لگتا بھلا وہ کبھی تقریب پر تھوڑی جا رہی تھی اور سادہ جوڑوں پر دل مطمئن نہ ہوتا۔ بالآخر گلابی رنگ کا چنٹوں والا فرائک پسند آئی گیا۔ نہ بہت سادہ تھا اور نہ ہی بہت کام دار۔ سوٹ زیب تن کرنے کے بعد وہ اس شش و پنج میں مبتلا ہو گئی کہ بالوں کا جوڑا باندھے یا یونہی کھلے چھوڑے۔ بالآخر کھلے بال چھوڑنے پر دل آمادہ ہوا۔ ہاتھوں میں مصنوعی موتیوں والی بریسلٹ باندھی۔ گلے میں زمررد کے پتھر والا لاکٹ۔ اب کانوں میں کیا سوٹ کرے گا؟ یہ نہیں، یہ بھی نہیں، یہ تو بالکل نہیں۔ کئی چیزیں مسترد ہوئیں تو گول کٹوروں والے جھمکے منتخب ہوئے۔

دانشہ فاخرہ کو دوسرے کمرے میں لے گئی کہ بچوں کو تنہائی میسر آئے۔
 ”تم لوگ ہماری طرف سے جانے کے بعد کسی شادی پر جا رہے ہو۔“ اسفر نے بی وی بند کرنے کے بعد دعا کے سراپے پر نظر ڈالی تھی۔
 ”دعا کی مسکراہٹ مدہم ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔“

”نہیں، کیا اوور ڈیرینگ کی ہوئی ہے؟“ دعا کا دل بچھ سا گیا۔ اسفر نے یہ نہ دیکھا تھا وہ کس قدر خوبصورت لگ رہی ہے۔ بس یہی دیکھا تھا کہ وہ کس قدر تیار ہے۔

”نہیں بہت زیادہ نہیں۔“ اسفر نے دل رکھنے کو کہا تھا۔

دوسرے کمرے میں بیٹھی صاعقہ اور فاخرہ بھی جو گفتگو تھیں۔

”فاخرہ اپنا خیال رکھا کرو، زوار کے جانے کے بعد تم کچھ زیادہ بیمار رہنے لگی ہو۔“
 فاخرہ ہنس دیں۔

”آپا بوڑھی بھی تو ہو گئی ہوں۔“

”جانے دو، مجھ سے چھوٹی ہی ہو، اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے سدرہ کے لیے اپنے دیور کو ہاں کر دی؟“
 صاعقہ رفتہ رفتہ گفتگو مطلوبہ موڑ پر لانا چاہ رہی تھیں۔

”ہاں آیا، اپنے لوگ، سلجھا ہوا لڑکا اور کیا چاہیے۔ پچھلا تجربہ تمہی تلخ تھا۔ بس اکلوتی بیٹی کو دوسرے شہر بھیجنا پڑے گا۔ اس لیے دل تھوڑا اداس ہے۔“

”اور اسفر؟ اس کے لیے کیا سوچا؟“

”اسفر تو لڑکا ہے۔ تھوڑا اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔“ فاخرہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی اور مزید بولی تھیں۔

”کتنی خواہش تھی کہ اسفر بھی زندگی میں اعلیٰ

مقام حاصل کر پائے مگر نصیب تو اپنا اپنا ہوتا ہے۔“

فاخرہ کا لہجہ افسوس میں گھلا ہوا تھا۔ صاعقہ کچھ دیر خاموشی سے بہن کو دیکھتی رہیں۔ خود سے کہنا کچھ

ہے۔ اگر ہم رضا مندی دیں تو وہ تہریز کا رشتہ لے کر آئیں۔“ دعا خیالوں سے چونکی تھی۔ دفعتاً رخ موڑ کر ماں کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں سراپیسگی تھی۔ چند لمحے ماں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ مایوس جھپکی بھی تھی۔ تب دعا نے خود کو سنبھالا تھا اور جھکتے ہوئے ماں کو دھیمی آواز میں بتایا تھا۔

”امی میں اور اسفر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ اسفر سے متعلق مبالغہ کرتے وہ بالکل نہ جھجکی تھی۔

اور صاعقہ کے لبوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ آ گئی۔

بیٹی کے جذبات سے تو وہ سالوں سے واقف تھیں۔ لیکن اب انہیں لگتا تھا کہ اسفر جیسا نا کام لڑکا ان کی بیٹی کے لیے موزوں نہیں لیکن خیر۔۔۔۔۔

جانتی تھیں دعا اس موڑ پر ہے جہاں سمجھنا سمجھانا بے کار ہوتا ہے۔ اسی لیے سر ہلا کر کہنے لگیں۔

”بڑی اچھی بات ہے۔ اسفر تو گھر کا لڑکا ہے، اور یہ سلسلہ کب سے ہے؟“ دعا نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ”صاعقہ چھیڑ رہی تھیں اور دعا مسکراتے شرماتے چہرے پر آئی آوارہ لٹ کر کو کان کے پیچھے اڑنے لگی۔

☆.....☆.....☆

آج جمعہ تھا اور جیسا کہ زوار کا معمول تھا کہ جمعے کے دن دکان شام کو دو تین گھنٹوں کے لیے کھولتے اسی طرح اسفر نے بھی یہ معمول جاری رکھا۔

طبیعت پر کسندی چھائی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ بی وی چلا کر صبح کے ٹائم آنے والا کوئی دینی شوق دیکھنے لگا۔ سدرہ کالج جا چکی تھی۔ فاخرہ کی طبیعت ناساز تھی سو آج اس نے چھٹی کی تھی۔

موبائل کے ان باکس میں دعا کا رات ساڑھے گیارہ بجے آنے والا میج تھا۔

”جانے اس کو کیا کام ہوگا؟“ اسفر کندھے

اچکا کر پروگرام دیکھنے لگا۔

گھنٹے بھر تک صاعقہ اور دعا آگئے۔ صاعقہ

سہلاتی، دعا خالی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگ جاتی۔

”امی اسفرمان ہی نہیں رہا۔“ دعا کے لہجے میں مایوسی چھپی ہوئی۔

”مان جائے گا، کیوں نہیں مانے گا۔“ صاعقہ تسلی دیتیں۔ دعا کی نظروں کا خالی پن جوں کا توں رہتا۔

دعا نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی مگر اسفرکارویہ ویسا ہی رہا کھنور سا۔ اس دن تو دعا دکان پر ہی اسفر سے ملنے چلی آئی۔

عام دنوں میں دعا خود گاڑی ڈرائیو نہیں کرتی تھی۔ زیادہ اچھی ڈرائیور نہ تھی مگر یہ عام دن نہیں چل رہے تھے۔

گا کہوں کا انتظار کرنا اسفر وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پروقت گزرتا ہی نہ تھا۔ سچی ایک گاڑی دکان کے سامنے رکی اور دعا گاڑی سے اتری۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اسفر اچنبھے سے دعا کو دیکھنے لگا۔

”دعا خیریت تو ہے۔“ حسرت تو دعا کے چہرے پر کنداں تھی جسے اسفر نظر انداز کر گیا تھا دعا چند لمحوں یاس و آس کی کیفیت میں اسفر کا چہرہ ہکتی رہی۔

”اسفر میں تم سے بے حساب محبت کرتی ہوں۔“ دعا کاؤنٹر کے سامنے کھڑی تھی اسفر سیٹ پر بیٹھا دعا کو دیکھے گیا۔

”تو؟؟؟“ اسفر کا لہجہ سرد تھا۔

”تو“ دعا نے بے یقینی سے لفظ دہرایا تھا اور رونے لگی تھی۔ اسفر سپاٹ تاثرات سے دعا کو روتا دیکھتا رہا۔

”آؤ ادھر بیٹھو“ اسفر نے اشارہ کیا تو دعا کاؤنٹر کے پار پڑے ڈیسک پر بیٹھ گئی۔

”یوں تو تمہارا اس طرح دکان پر بیٹھنا مناسب نہیں۔ لوگ دیکھیں گئے تو غلط گمان ہی کریں گے۔“ اسفر نے ٹھنڈا لہجہ دیا تھا۔

دعا کہاں اس مقام پر تھی کہ مناسب نامناسب

غیر مناسب تو تھا۔ مگر بہن ہی تھی اب بہن سے کیا میں کیا تو۔

”اسفر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اگر تمہیں مناسب لگے تو۔۔۔۔۔“ پوری بات کہنے کے لیے صاعقہ کو مناسب لفظ نہ ملے۔

فاخرہ بے یقینی سے بہن کو دیکھے گئیں۔

”آیا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“ فاخرہ کا لہجہ کھلنے لگا تھا۔

دوسری طرف اسفر دعا کے یوں شرمانے ہچکچانے سے بیزار ہونے لگا تھا۔

”ہاں دعا، اب بتا بھی تو مجھ سے تمہیں کیا کام تھا۔“ دعا توقف سے بیٹھی رہی۔

”ابھی تم نے مراقبہ کرنا ہے تو میں چیخ کر آتا ہوں۔“ تم اتنی تیار بیٹھی ہو، مجھے اپنا عام حلیہ مزید عام لگ رہا ہے۔“ اسفر ابھی تک رات والے ٹراڈر شرٹ میں تھا۔ اسفر اٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ دعا کی آواز نے اسفر کے پاؤں جکڑ لیے۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ اسفر ٹھٹھک کر رک گیا۔ مڑ کر دعا کو دیکھا اور چند لمحوں یوں دعا کو دیکھتا رہا دعا یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے محبت نہیں جرم کا اعتراف کیا ہو۔ کمرے میں بو جھل سی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ اس خاموشی کو اسفر کی آواز نے توڑا تھا۔

”اچھا مذاق تھا، مگر مجھے ایسے مذاق پسند نہیں میں کبھی تم سے شادی نہیں کروں گا۔“ اسفر کا لہجہ۔ بے لچک اور قطعی تھا۔ دعا نے سر اٹھا کر اسفر کو تحیر سے دیکھا تھا جو کمرے کا دروازہ پار کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

محبت انسان کو برباد کرتی تھی، کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔

دنوں میں دعا کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں جیسے اندر ہی دھنس گئی تھیں۔

”کیا ہوا دعا؟“ صاعقہ محبت سے بیٹی کا سر

ہر پہلو پر سوچا۔ ایک بار نہیں سوچا بار بار سوچا۔ فیصلے پر پہنچنے میں اسے ایک ہفتہ لگ گیا۔

ایک ہفتے بعد جب فاخرہ کو گرمیوں کی چھٹیاں مل چکیں اور وہ پہلی چھٹی فرصت سے گزار رہی تھیں تب اسرماں کے ساتھ آن بیٹھا۔

”امی مجھے راشدہ پھوپھو کی بیٹی خولہ پسند ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر دعا؟؟“ فاخرہ کو لمحہ بھر سمجھ ہی نہ آیا بیٹے سے کیا کہے۔

☆.....☆.....☆

پاکستان کی معاشرت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ لڑکی کی محبت کا قصہ باپ اور بھائیوں کو بتایا جائے۔

دعا کی طبیعت سنبھلتی نہ تھی، کھانے پینے سے رغبت نہ رہی۔ پہروں جاگتی رہتی اور آنسو بہاتی رہتی۔ دنوں میں چہرے کی لالیاں غائب ہو گئیں اور اب تو سرسوں کے پھول کا گمان ہوتا۔ شوہر اور بیٹے تشویش میں مبتلا تھے اور صاعقہ کے پاس گھڑنے کو کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔ حنان تو دعا کو زور زبردستی فزیشن کے پاس بھی لے گیا۔

”انھیں کوئی ذہنی ٹینشن ہے، ٹینشن ختم کریں یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ فزیشن نے تفصیلی معائنے کے بعد کہا تھا۔

”دکس قسم کی ٹینشن؟“ فزیشن نے توجہ دلائی تو حنان کو احساس ہوا بہن بیمار کم اور پریشان زیادہ لگتی ہے۔ دعا نے تو کچھ بتانا گوارا نہ کیا مگر جب حنان نے کرید کرید کر صاعقہ سے پوچھا تو صاعقہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ نہ کچھ بتا دیا۔

ساری بات سننے کے بعد حنان نے طویل سانس بھرا تھا۔ وہ تھوڑا آزاد خیال تھا بجائے اس بات پر تیغ پا ہوتا، اس نے اسفر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

ذاتی طور پر بھی حنان اسفر کو پسند کرتا تھا، سلجھا ہوا لڑکا تھا، تھوڑا کم گو اور جھینپو تھا مگر یہ برائیاں نہیں

تھا۔ شرعی طریقہ کار کے مطابق سوگ کے تین دن گزارے جاتے۔ مگر ان لوگوں نے ایک رات ہی قیام کیا اور اگلے دن واپسی کے لیے روانہ ہونے لگے۔

اسفر نے یہ وقت ذیشان کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ واپسی سے پہلے اس سوچ کے ساتھ کہ پھوپھو سے تعزیت کر لوں ذیشان سے کہا کہ اندر پردہ کرا لے تاکہ وہ راشدہ سے مل سکے۔

ذیشان نے پردے کا اہتمام کرا کے ملاقات کا انتظام کرا لیا۔ دفنایا تو کل ہی جا چکا تھا۔ مگر راشدہ کی آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔

اسفر کچھ دیر پھوپھو کے ساتھ بیٹھا رہا، چاہنے کے باوجود تعزیت یا ہمدردی کے کوئی کلمات نہ کہہ سکا اور جب ساتھ بیٹھی فاخرہ کو اندازہ ہوا ان کا دبو بیٹا کچھ نہ کہے گا تو بولیں ”چلو راشدہ، اللہ زندگی آسان فرمائے۔ اب ہم چلتے ہیں۔“ فاخرہ کے ساتھ سدرہ بھی کھڑی ہوئی۔ راشدہ سے گلے لگنے کے بعد فاخرہ ساتھ بیٹھی خولہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ سفید ملگجھا دو پٹا نکائے خولہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ ”صبر بیٹا“ جب فاخرہ خولہ کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں تب اسفر نے غیر ارادی طور پر خولہ کو دیکھا۔ ان چند لمحوں کی غیر ارادی نظر میں دھیان بھی آن گھسا اور اسفر نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

واپسی کا سارا راستہ اسفر چپ رہا، خولہ کا سراپا سامنے لہراتا۔ بچپن سے لے کر اب تک خولہ سے ہونے والی وہ تمام ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ جو تعداد میں شاید ہاتھوں کی انگلیوں جتنی تھیں اور ان ملاقاتوں میں یاد کرنے والی کوئی بات بھی نہ تھی۔ ارادی طور پر اسفر نے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول تو کی۔ مگر اگلے چند دن وہ ایک الگ نہج پر سوچتا رہا۔

خولہ خوب سیرت تھی، زبان دراز نہ لگتی، سیدھی سادھی، اسفر سے کم پڑھی لکھی تھی۔ اسفر کی عزت کرتی۔ اس کے اوپر حاکم بن کر نہ بیٹھتی۔ اسفر نے

تھیں، ہاں البتہ زندگی کی پروٹ میں پیچھے تھا۔ لیکن خیر جب بہن اتنا پسند کرتی تھی کہ اس کے انکار پر بیمار پڑنے لگی تھی تو مزید کچھ سوچنا عبث تھا۔ حنان شام کے وقت ملنے کے لیے گیا تھا۔ اسراف بھی گھر پر نہ تھا۔ دکان پر جانے کے ساتھ ساتھ اس نے ایم اے کی ٹیوشن کلاسز لینا بھی شروع کر دی تھیں۔ جب تک اسراف آیا، فاخرہ بھانجے سے حال احوال اور جاب سے متعلق سوال پوچھتی رہیں۔ حنان نے جب بتایا کہ وہ اسراف سے ملنے آیا ہے تو فاخرہ خود ہی سمجھ گئی کہ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

”آؤ اسراف بھائی کو کپتانی دو، حنان آج خاص تم سے ملنے آیا ہے۔“ اسراف آیا تو فاخرہ تنہائی میسر کرنے کے خیال سے کمرے سے چلی گئیں۔

کچھ عمروں کا فرق تھا اور کچھ فریٹکنس کی بھی کمی تھی، اسی لیے تو ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد خاموشی کے طویل وقفے آنے لگے۔ الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے حنان نے متعلقہ بات کی تھی۔

”اسراف تم نے دعا کو کیوں انکار کیا؟“ اسراف نے حیران نظروں سے حنان کو دیکھا تھا۔ اسے توقع نہ تھی کہ حنان خود یہ بات اس سے بلا واسطہ کرے گا۔

”دعا اسراف لگنے والی ہے۔ اسے کہیں وقت ضائع کرنے کی بجائے انٹرویو پر توجہ دے۔ اچھا انٹرویو دے گی تو ہی اچھی فیلڈ میں منتخب ہوگی۔“ کچھ ٹکریم کا معاملہ تھا۔ اس لیے اسراف نے قدرے اٹک اٹک کر بات پوری کی تھی۔

”دعا اچھی لڑکی ہے، جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو۔ تم دونوں اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔“

”ہونہہ“ اسراف سر جھٹک کر رہ گیا۔

”کیا یہ بہتر نہیں ہم اس موضوع پر بات نہ کریں، ہر بات کرنے والی کہاں ہوتی ہے۔“ اسراف کا لہجہ ٹھوڑا تلخ سا تھا۔ یوں بھی پے در پے کی

ٹاکا میوں کے بعد وہ تلخ ہو گیا تھا۔ حنان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ اس سے قبل وہ کچھ بولتا اسراف ٹھکڑا ہوا۔

”آپ بیٹھیں میں آپ کے کچھ لاتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں، میں آنتی کے ساتھ چائے پی چکا ہوں، تم بیٹھو“ حنان نے کہا تو اسراف ایک بار پھر بیٹھ گیا۔

”تم مجھے اسنے انکار کی وجہ بتاؤ، ہم وہ وجہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں“ اسراف کے ماتھے کی تیوری حنان کو ناگوار تو گزر رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا۔ اسراف جو اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا رنج ہونے لگا۔

”کیا زور زبردستی ہے، جب میں نہیں چاہتا تو پھر۔۔۔۔۔“

”کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟“ حنان کا لہجہ تا حال پرسکون تھا۔

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ اسراف کے ماتھے کے بل میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

”ہم کیوں ایسے ہی سمجھ لیں۔ بتاؤ میرے بھائی تم کیوں انکار کر رہے ہو، دعا تمہارے انکار سے بیمار پڑنے لگی ہے۔“

”انکار کی ایک وجہ ہو تو بتاؤں“ اسراف جیسے پھنسنے کو تیار تھا۔

”تم ایک وجہ تو بتاؤ۔“ حنان کو اسراف کے انداز غصہ دلانے سے تھے۔ مگر وہ پھر بھی ضبط کیے صلح جو لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”آپ کی بہن خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح کسی پیچیدہ نفسیاتی عارضے کا شکار ہے اپنے سے کم تر لڑکے سے شادی کر کے اس کو اپنا غلام بنا کر پتا نہیں کس قسم کی تسکین چاہتی ہے۔ مگر میں بھی کسی کو اپنے اور حاکم بننے کی اجازت نہ دوں گا۔“ اسراف نے جیسے آگ اگلی تھی۔ ابھی تک اسراف کے انداز کو سہتے حنان کے تو جیسے پیروں کو لگی تھی اور سر کو بچھی تھی۔

”دو ٹکے کے ایزی لوڈ والا اپنی اوقات بھول

کیا اسی لیے جو منہ میں آرہا ہے بولے جا رہا ہے۔“
 بہن کی محبت میں حنان کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا
 تھا۔ اور اس کی جذباتیت تابوت میں آخری کیل
 ہی ثابت ہوئی تھی۔

اسفر چند لمحے تو تحیر سے حنان کو دیکھتا رہا اور
 پھر ہکلاتے ہوئے گویا ہوا۔

”جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اپنی بہن کے لیے
 وزیر اعظم کا بیٹا ڈھونڈیں، دو نکلے کے لوگوں کے
 پاس کیا کرنے آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اسفر کا نہیں
 ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ بھلا کون کہتا ہے
 آگ سے زیادہ کسی چیز میں جھلسانے کی صلاحیت
 نہیں، لوگوں کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ زیادہ
 جھلساتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

وہ لڑکی جو ماں کی دلاری تھی، باپ کے
 آنکھوں کا تارا تھی، جس کے نخرے سہنا بھائی خوش
 قسمتی سمجھتے تھے، محبت کے ہاتھوں زل رہی تھی۔

محبت ہمیشہ خدا کا انعام نہیں ہوتی۔

محبت ہمیشہ آسودگی نہیں دیتی۔

محبت دکھ بھی دیتی ہے

آزردہ بھی کرتی ہے۔

محبت خوبصورت خیال ہے تو ایک ملال بھی

اس میں پنہاں ہے۔

اپنے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ بڑے
 صوفے پر آٹروں بیٹھے بیٹھے جب دعا کا ہر ہر عضو
 چمکنے لگا تو وہ انھی اور قدم قدم چلتی کھڑکی تک آئی۔
 چہرے پر زردی کچھ ایسے کھنڈ چکی تھی کہ لگتا تھا کہ
 چہرہ ازل سے ایسا زرد ہی تھا۔ موم کو پتھر بنانے میں
 تو ایک لمحہ لگتا ہے تو دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو
 پتھر کو موم بنا سکے۔

اتنا بے حس کہ پھلتا ہی نہ تھا باتوں سے

آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا

مخس نقوی نے یہ شعر جیسے اسفر کے لیے ہی کہا

تھا۔

کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی دعا کو لگا جیسے آنکھ

میں کوئی چیز چلی گئی ہے۔ حالانکہ آنکھ میں کچھ نہ گیا
 تھا۔ یہ آنسو تھے جو آنکھوں میں چھین پیدا کر رہے
 تھے۔ آنسو بہے تو آنکھوں کو بھی سکون ملا۔

”اسفر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تم
 سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں“ دعا پھوٹ پھوٹ
 کر رونے لگی۔ تنہائی میں رو کر بھی عجب ہی تسکین
 ہوتی ہے۔

”کیا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ میں تمہارے بغیر
 زندہ رہ بانی ہوں کہ نہیں تو میرا یقین کرو اسفر میں
 مر جاؤں گی“ دعا روتی جاتی اور خود سے کہے
 جاتی۔

”یہ کیسی شرط ہے کہ میں تمہارا منہ جوتے
 سے ناپوں۔ ایسے کرو کہ تم میرا چہرانا پ لو،
 مگر۔۔۔۔۔ مگر مجھ سے عقد کر لو“ سامع اسفر
 نہیں تھا وہ خود تھی۔

روتے روتے بھی دل کا بوجھ ہنکانہ ہوا۔ ہاں
 البتہ کمزوری محسوس ضروری ہوئی۔ سہارا لینے کے
 لیے اس نے کھڑکی کے فریم پر ہاتھ رکھا تو وہ
 کھڑکنے لگا۔ کافی عرصہ پہلے دعا نے فرقان کو فریم
 فکس کروانے کا کہا تھا۔ مگر فرقان گونا گوں
 مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ نکال پایا اور آج کا
 کام کل پر چھوڑتے ہوئے بھول ہی گیا۔

”اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں کہے
 دیتی ہوں، اسی کھڑکی سے کود کر جان دے دوں
 گی۔“ سوچیں تو بے لگام ہوتی ہیں۔ سوچتے ہوئے
 بندہ کہاں یہ سوچتا ہے کہ کبھی یہ سب حقیقت بن گیا
 تو؟

☆.....☆.....☆

فاخرہ نے اپنے تئیں اسفر کو قائل کرنے کی
 پوری کوشش کی۔ مگر اسفر نے جیسے فیصلہ نہ بدلنے کی
 قسم کھائی تھی۔ فاخرہ قائل کر کے تھک گئیں مگر اسفر
 ٹس سے مس نہ ہوا۔ صاعقہ فاخرہ سے کھلم کھلا
 ناراض تھیں کہ بیٹے کو نہ مناسکی۔

”آپا پتا نہیں اسفر ایسا تو نہ تھا پتا نہیں کیسے اتنی
 ضد کر رہا ہے، کہتا ہے مر جاؤں گا مگر دعا سے شادی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

رہی تھیں۔

نہ کروں گا۔“ فاخرہ پشیمان لہجے میں بہن سے فون پر کہہ رہی تھیں۔

کچھ دنوں تک راشدہ کا فون آیا۔
”فاخرہ تھوڑا سانس تولے لو، ایسی بھی کیا ہتھیلی پر سروس جمانا، میری عدت کو ختم ہوئے ابھی مہینہ ہوا ہے۔ مجھے ابھی وقت دو۔ میری آخری بیٹی ہے۔ اس کی شادی سے متعلق میرے کچھ ارمان ہیں۔“ راشدہ کی عام باتوں میں بھی خوشی کی رمت تھی۔

”ہونہہ، سب جھوٹے بہانے ہیں۔“ صاعقہ نے غم و غصے کے ملے جلے جذبات سے فون ہی بند کر دیا۔

”آپا جلدی کہاں ہے یہ نومبر ہے اور ہم نے فروری کی تاریخ رکھی ہے۔ آپ جی بھر کر اپنے ارمان پورے کریں۔“ فاخرہ نے سجاؤ سے سمجھایا تھا۔

سدرہ نے بھی اسفر کو سمجھایا۔ دعا اس کی کزن تھی، دوست تھی سالوں کلاس فیلور ہی تھی۔ مگر اسفر نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔

”چلو ٹھیک ہے“ راشدہ نے خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

روز روز کی کشیدگی سے تنگ آ کر فاخرہ نے یہی فیصلہ کیا خولہ کے لیے ہی اسفر کا رشتہ لے جائیں رشتہ طے ہو جائے گا تو صاعقہ بھی دباؤ نہ ڈالیں گی۔

☆.....☆.....☆

فاخرہ ایک بار پھر گاؤں گئیں۔ راشدہ کو آنے کا مقصد بتایا۔ راشدہ تو نہال ہی ہو گئیں۔

بستر مرگ پر لیٹے انسان کی زندگی طویل کرنے کے لیے علاج معالجے کا سامان تو کیا ہی جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہ بس سرہانے پیٹھ کر دعا میں پڑھے جاؤ اور مریض کے مرنے کا انتظار کیے جاؤ۔ دعا بھی اپنے علاج معالجے کا سامان کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی محبت کے مرض میں مبتلا تھی۔

”فاخرہ یہ تو میرے دل کی آرزو تھی۔ بیٹی والی ہوتے ہوئے خود سے کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ مگر دیکھ لو۔ خدا ہم سے زیادہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ اسفر تو میرے لیے دوسرا زوار ہی ہے۔ رشتے سے انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ راشدہ خوش تھیں۔ فاخرہ چہرے پر پھینکی ہنسی سجائے سوچے جاتیں۔

دکان پر اسفر کا دل لگ گیا تھا۔ کچھ کمائی ہو جاتی۔ جیب میں پیسے آجاتے اور گھر پر بھی فارغ نہ بیٹھنا پڑتا۔ اسی لیے دکان کا معمول اسفر کو ناگوار نہ گزر رہا تھا۔

خدا ہم سے زیادہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ اسفر تو میرے لیے دوسرا زوار ہی ہے۔ رشتے سے انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ راشدہ خوش تھیں۔ فاخرہ چہرے پر پھینکی ہنسی سجائے سوچے جاتیں۔

دکان پر اسفر نے کمپیوٹر رکھ لیا۔ کارڈ ریڈرز اور کچھ اس جیسے دوسرے آلات بھی۔ ایزی لوڈ، موبائل اسرین بیچنے کے ساتھ ساتھ وہ میموری کارڈ بھرنے کا کام بھی کرنے لگا۔ ایزی پیسہ کی سہولت بھی لے لی اور روپے پیسے کی ترسیل کرنے لگا۔ یہ تبدیلیاں لانے سے دکان کی گا بنی بڑھی تھی۔ اوسطاً روزانہ دو سو لوگ دکان پر آتے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو، نے لوڈ کروانا ہوتا، پیسے بھیجنے ہوتے یا کچھ خریدنا ہوتا۔ محض چند لوگ ہی موبائل اسرین کی قیمتیں پوچھ کر چلے جاتے۔

”راشدہ انکار کر دیتی تو ممکن تھا کہ کوئی روزن کھل جاتا لیکن خیر۔۔۔۔۔“

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔

اسفر کا ارادہ تھا کہ شادی سے ایک ہفتہ پہلے دکان پر آنا چھوڑ دے گا۔ یہ ایک عام سادہ ہی تھا۔ لیکن آج گا ہک قدرے کم تھے۔ اسفر کمپیوٹر کی سیٹنگ میں مصروف تھا جب کسی نے سے بکارا تھا۔

”اسفر“ اسفر نے سراٹھا کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دعا کھڑی تھی۔ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔

”آؤ دعا، کیسی ہو؟“ اسفر نے بادل نخواستہ راستہ دیا اور دعا قدم اٹھاتی دکان کے اندر داخل ہوئی تھی اور کاؤنٹر کے پاس پڑے سٹول پر ٹک گئی۔

”گھر آ جاتی، امی اور سدرہ سے ملاقات ہو جاتی، یہاں دکان پر میں مصروف بھی ہوتا ہوں اور غیر مناسب بھی ہے۔“ اسفر نے یوں گفتگو کی ابتداء کی جیسے درمیان میں کبھی کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں ہوئی۔

دعا خالی خالی نظروں سے اسفر کو دیکھے گئی۔
”تم نے شادی کی شاپنگ کر لی، آخر تم میری کزن ہونے کے علاوہ دوست بھی ہو اور ہم اکٹھے پڑھتے بھی رہے ہیں۔“ اسفر نے بھرپور کوشش کی کہ اس کا لہجہ ہشاش بشاش ہو۔ دعا ایک ٹک اسفر کو دیکھے گئی۔

”یوں تو مت دیکھو“ اسفر گڑبڑا گیا۔
”اور کتنا امتحان لو گے اسفر۔“ دعا کی آواز میں کرب نمایاں تھا۔

”امتحان۔۔۔۔۔“ اسفر نے لفظ زیر لب دہرایا تھا اور سر نیچے ہلایا تھا۔

”دعا یہ امتحان نہیں۔۔۔۔۔ حقیقت ہے۔ اتنا بڑا سی ایس ایس امتحان پاس کرنے والی لڑکی ابھی تک کس دنیا میں رہتی ہے۔ تم امیر ہو، خوبصورت ہو، ذہین ہو، ایک سے ایک بہتر رشتہ تمہارا منتظر ہے۔ میں ٹھہرا دو نکلے کا آدمی۔“

”اسفر یوں مت کرو“ دعا رونے لگی۔ اگلے لمحے وہ زوار و قطار رو رہی تھی۔

”اسفر چپ چاپ دعا کو روتے دیکھتا رہا۔

”مستقبل میں خود رونے اور مجھے رلانے سے بہتر ہے ابھی رولو، یہی تو دستور ہے۔ مستقبل سنوارنے کے لیے حال کی تکلیفیں سہی جاتی ہیں۔“ اسفر کا لہجہ ایسا تھا جیسے معمول کی باتیں ہو رہی ہوں۔

دعا روتی رہی۔ اسفر نے چپ کروانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کافی دیر یونہی گزر گئی۔ تب اسفر نے ایک گلاس پانی دعا کی طرف بڑھایا۔ دعا نے نہ تھا۔

”اسفر میں مرجاؤں گی۔ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں“ دعا کے پاس موجود ڈشواؤں سے اس قدر گیلا ہو چکا تھا کہ اس سے مزید آنسو نہیں پونچھے جاسکتے تھے۔

”کچھ نہیں ہوتا، تمہیں آؤ گھر چلتے ہیں۔ یہ اتفاق ہی ہے آج میں بایک نہیں لایا اور پیدل آیا ہوں۔ شاید تمہاری گاڑی میں گھر جانا قسمت میں تھا۔ گھر چکر لگا لیا کرو۔ شادی والا گھر ہے کام ہوتے ہیں۔ سدرہ اکیلی ہلکان ہوتی ہے۔ راستے میں آنسو کریم بھی کھلاؤں گا۔ اب تو میں کمانے لگا ہوں۔“ اسفر اٹھا تھا اور گاڑی کی چابی والی چین جو دعا نے اپنے سامنے کاؤنٹر پر رکھی تھی اٹھا کر دعا کی طرف بڑھائی تھی۔ دعا کے پاس جیسے کہنے اور کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

دروازے کی چوکھٹ پر سب سے آگے آگے کھڑی راشدہ نے سامنے سے آتی بارات کو دیکھا اور شاد ہوتے دل کے ساتھ ایک کواڑ کو تھاما تھا۔

خولہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور آنکھوں کا تارا تھی۔ آج گھر کا آنگن چھوڑ کر جا رہی تھی۔ بلاشبہ دل کا ایک کونہ بیٹی کی جدائی سے اداس تھا۔ مگر اتنے اچھے لڑکے سے منسلک ہونے پر دل شاد بھی تھا۔ اور اسے اطمینان تھا کہ اچھی زندگی اس کی بیٹی کی منتظر ہے۔

ابھی تو عصر کا وقت تھا۔ برقی قمقمے روشن تو

تم۔۔۔“ آنسو میں صاعقہ بات ہی نہ پوری کر پائی اور فاخرہ رقت بھرا دل لیے بہن کو تسلی بھی نہ دے پائی۔ کیا کہتی کہ کل بارات پر چلو۔

”امی آئیے نا، رک کیوں گئیں“ اسفر کی آواز کانوں میں پڑی تو فاخرہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی آگے بڑھنے لگیں۔ دل میں کچھ ایسا قلق تھا کہ دلہا بنا بیٹا بھی برا لگ رہا تھا۔

”زہے نصیب، زہے نصیب،“ مسکراتے چہرے کے ساتھ ذیشان آگے بڑھا اور اسفر سے بغل گیر ہوا۔ بارات کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے لوگوں نے سرخ پھولوں کی پتیوں نچھاور کیں اور بارات چوکھٹ پار کرتی اندر صحن میں داخل ہوئی۔ مختصر سی بارات تھی۔ رشتہ داروں کے علاوہ انتہائی قریبی پڑوسیوں کو بلایا گیا تھا۔ لڑکی والوں کی طرف بھی زیادہ مہمان نہ تھے۔

گھر میں داخل ہو کر اسفر نے ایک نظر چاروں اور دوڑائی۔ کھلا کچا گن، جہاں بچپن میں جب بھی وہ آتا تھا خولہ کے ساتھ ہر کھیل کھیلتا تھا۔ گاؤں آتے ہوئے اس کے پر جوش ہونے کی وجہ بھی خولہ کی کمپنی ہوتی تھی۔ یہ سب سوچیں تو متعلقہ تھیں مگر یہاں ایک غیر متعلقہ سوچ بھی ذہن میں ابھری۔

”دعا کے ساتھ تو جیسے سارا بچپن گزارا ہے، سکول، کالج، بعد کی زندگی۔۔۔“ ساتھ ہی دعا کی خود پر کی گئی چھوٹی بڑی عنایات یاد آنے لگیں تو اسفر گڑبڑا سا گیا۔ کل سے اس کے ذہن میں وقفے وقفے سے دعا کی باتیں آرہی تھیں۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی نہ جھٹک پارہا تھا۔

صحن اتنا بڑا تھا کہ شامیانے لگا کہ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا گیا تھا۔ اپنے سالوں کی قیادت میں اسفر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا مردانہ حصے میں بنائے گئے سٹیج پر آن بیٹھا۔ نکاح خواہ پہلے سے ہی اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ سزا سٹیج پر پہنچا تو نکاح خواہ نے پر جوش انداز میں اسفر سے معانقتہ کیا تھا۔

(جاری ہے)

تھے۔ مگر اندھیرا نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ دلچ نہیں دکھایا رہے تھے۔ سرخ شامیانوں کی بھی ایک الگ چاشنی تھی۔

بارات رکی، سب سے آگے والی گاڑی سرخ گلاب جس کی سجاوٹ تھے سے اسفر اتر ا۔ سیاہ ٹوپیس میں ملبوس، چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی۔ سرخ چہرہ، گلے میں سنہری مالا، بلاشبہ اسفر اس تقریب کا سب سے خوبصورت مرد تھا۔ بیٹے کے بعد فاخرہ گاڑی سے اتری۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں کمی تھی۔ دل بجھا ہوا ہو تو چاہے جتنی کوشش کر لو، مسکراہٹ ادھوری ہی لگتی ہے۔ ”کاش کہ اسفر دعا کے لیے مان جاتا“ گاڑی سے اترتے ہوئے فاخرہ نے سوچا تھا۔ صورتحال ہی کچھ الگ سی تھی۔

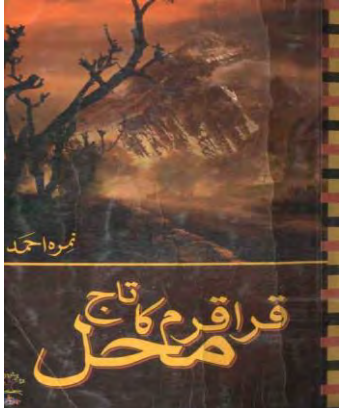
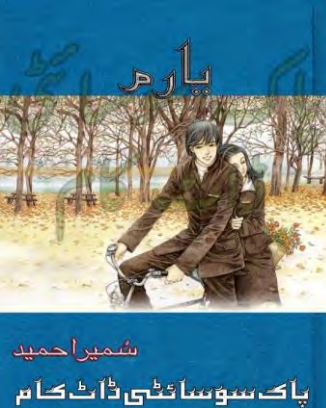
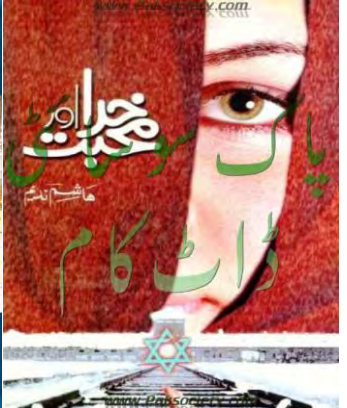
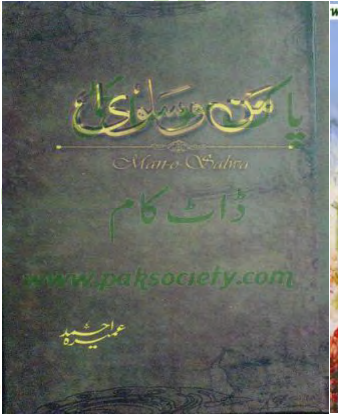
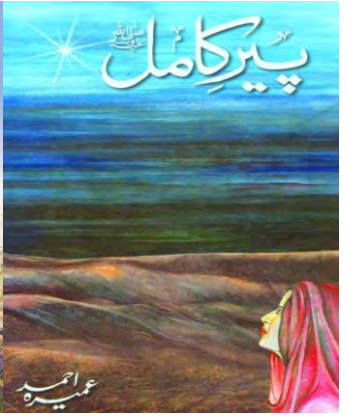
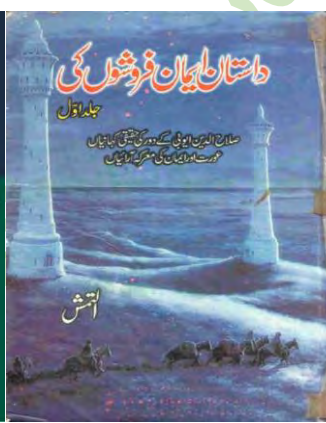
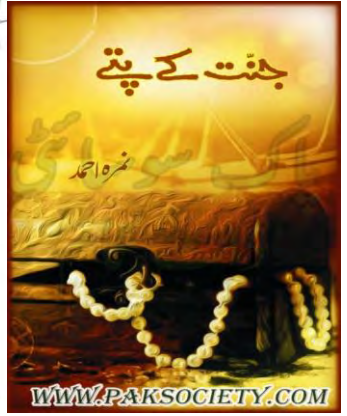
صاعقہ اور اس کی پوری فیملی نے شادی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ ایک ہی تو فاخرہ کی بہن تھی وہ بھی اہل خانہ سمیت شادی میں شریک نہ ہو رہی تھی۔ بہن کو منانے کی نیت سے کل بھی فاخرہ بہن کے قلیٹ پر گئی تھی۔ وہاں جا کر بھی فاخرہ کو احساس ہوا صاعقہ اگر لالعلق ہو رہی ہے۔ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ دعا کی حالت اس قدر بری تھی کہ ترس آتا۔ سیاہ حلقوں والی ہڈیوں کا ڈھانچہ لڑکی، جاں بلب بستر پر کچھ اس طرح لیٹی تھی کہ مردے کا گماں ہوتا۔ ”فاخرہ کیسی بہن ہو تم، تمہیں میری بیٹی پر ترس نہیں آتا۔“ صاعقہ رونے لگیں۔

”آپا میں کیا کر سکتی ہوں، اسفر نانتا ہی نہیں۔ مجھے تو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اس قدر بے حس اور ضدی ہے۔“ خود فاخرہ کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔

”تم کیا کر سکتی ہو؟ تم تو جیسے کچھ نہیں کر سکتیں۔ بیٹے کے سر پر سہرا سجا رہی ہو اور کہتی ہو کیا کر سکتی ہوں۔“ صاعقہ ترش ہوئی تھی۔ فاخرہ لاجواب سی چپ رہ گئی۔

”یہاں کیا ہمارا تماشا دیکھنے آئی ہو، اتنا ترس تو سامنے قلیٹ میں رہنے والی پڑوسن کھا لیتی مگر شاید

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تو شہرہ خاص رنگ رنگ دکایتیں

شہرہ خاصوں میں ان نعت سداں اور کلام نعت انوکھا ہیں

کرراچی سے پہلی حکایت

رائٹ نمبر

ایلا نام بخش

ایک رنگ نمبر نے اُس بد نصیب کے بھاگ جگا دیے تھے

وقت سے وہی کال آئی تو میں کال کاٹ دیتی مگر دوسری طرف بھی کوئی ڈھیٹ تھا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کال ریسیو کی۔

”مجھے کیوں بار بار تنگ کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔“ دوسری طرف فون آنے والے شخص نے اسپیکر آن کر دیا تاکہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست بھی سن سکیں فون پر اس نے اپنا نام فیروز بتایا تھا۔

”بھئی ہم تو صرف آپ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ ہماری کال کاٹ رہی ہیں۔“

”نہیں کرنی مجھے دوستی آپ سے۔ شادی تو کوئی مجھ سے کرنے کو تیار نہیں، بڑے آئے دوستی کرنے والے۔“ میں نے نئی سے جواب دیا۔

”ایک بار دوستی تو کر لو پھر میں ضرور تم سے شادی کروں گا۔ میری جان کیوں اتنی اتناؤ لی ہو رہی ہو شادی کے لیے۔“ اُس نے بڑی مکاری سے کہا۔

میرے موبائل پر اکثر رنگ نمبر آتے تھے۔ کسی نمبر پر میں ہنسی خوشی سے بات کرتی، کسی کو جھڑک دیتی، کسی سے تو باقاعدہ دوستی ہو جاتی، کسی سے تو نوبت ملاقات تک آ جاتی اور یہ ملاقات ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہوتی، کیونکہ مرد حسن پرست ہوتے ہیں اور وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں اور یہ دونوں خوبیاں مجھ میں نہیں تھیں۔ میں کالی کلوئی اور عمر میری 45 سال کی مگر ہوں میں کنواری۔ مجھ سے دو بڑی بہنیں، وہ شادی شدہ اور دو چھوٹی بہنیں وہ بھی شادی شدہ۔ بڑی بہنوں کے تو بچے بھی شادی شدہ تھے۔

میرے بھی شروع میں اونگے بونگے رشتے آئے مگر اماں نے اچھے رشتے کی آس میں جواب دے دیا اب تو رشتے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے بھی دل میں شادی کی خواہش تھی۔

اپنا گھر، شوہر، بچے کسے اچھے نہیں لگتے۔ ایک دن میرے موبائل پر ایک رنگ نمبر آیا۔ میں نے انھیں دو چار باتیں سنا کر موبائل بند کر دیا۔ مگر وقفے

اس سے آپ کو کیا۔ آپ کو جو کہنا ہے وہ کہیے۔“
میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں
آپ سے فراڈ نہیں کر رہا۔ نہ ہی میں نے آپ کو پسند
کیا ہے، نہ ہی محبت۔ یہ شادی میں ہمدردی میں
کر رہا ہوں۔ ویسے میں بھی شادی شدہ اور ایک بچے
کا باپ ہوں۔“ اس کے لہجے سے سچائی چھلک رہی
تھی۔

”مگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہوئی کیسے۔ میں
نے اپنا اشتہار تو نہیں لگایا تھا۔“ میرا لہجہ سلیخ ہو گیا
تھا۔ اس کی یہ بات سن کر۔

میرا دوست فیروز آپ کو موبائل پر تنگ کر رہا
تھا اور اس نے ولیم کھول رکھا تھا۔ سب دوست
سن رہے تھے اور آپ پر ہنس رہے تھے۔ اسی
وقت میں آ کر ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ آخر میں
آپ کی آواز رونے جیسی ہو گئی۔ اس وقت مجھے لگا
کہ جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ میں
نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں آپ سے شادی
کروں گا اور میرا ہر فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ اس لیے
میں نے فیروز سے آپ کا نمبر مانگا اور آپ کو کال

”اتاؤلی ہو رہی ہوگی تمہاری ماں بہنیں
شادی کے لیے۔ دوسری لڑکیوں کی عزت کا ذرا
خیال نہیں۔ تم جیسے مردوں کو میرا دل کہہ رہا ہے کہ
ایسی گالیاں دوں کہ آئندہ کسی لڑکی کو تنگ کرنے
کی جرأت نہ ہو۔ میں ایک کالی کلونی 45 سال کی
کنواری لڑکی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ مجھ سے کوئی
شادی نہیں کرے گا۔ سب مذاق اڑاتے ہیں
میرا۔“ آخر میری آواز بھرا گئی۔ آنسو گلے میں
انک گئے۔ اور میں نے موبائل بند کر دیا اور
زار و قطار رونے لگی۔ اسی وقت میرا موبائل بجنے
لگا۔ اسکرین پر ایک انجان نمبر جگ مگا رہا تھا۔
میں نے چوتھی بیل پر کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے بھاری مردانہ
آواز ابھری۔ ”میں ارٹھی بات کر رہا ہوں پلیز کال
کا شامت۔“ اس نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

”جی کیسے میں سن رہی ہوں۔“ میں نے دوپٹے
کے پلو سے زور سے آنکھیں رگڑیں۔

”آپ روکیوں رہی ہے۔“ بے حد دردمندانہ
انداز سے پوچھا گیا۔

”آپ میری فکر چھوڑیے میں روؤں کہ ہنسوں

Downloaded From
Paksociety.com

امی کو ارتضیٰ کی کم عمری پر اعتراض تھا۔ اس کی خوب صورتی پر اعتراض تھا۔ امی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ آخر اسے ضرورت کیا ہے دوسری شادی کرنے کی، وہ بھی میرے جیسی لڑکی سے جو اب بوڑھی ہو رہی ہے۔ میں نے روپیٹ کر جیسے تیسے اپنے گھر والوں کو راضی کیا۔ پھر جب وہ لوگ دوبارہ آئے تو امی نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ میرے بھائیوں نے جا کر اس کے بارے میں چھان بین کر کے اپنی تسلی کی اور پھر جب وہ تیسری دفعہ آئے تو امی نے ہاں کی پھر بھی کچھ شرائط رکھیں جو سب انہوں نے پوری کیں۔ ایک شرط تو امی نے گھر کی رکھی تھی کہ پہلی بیوی کو سنبھالنا ہو اور اسے کراچی میں گھر لے دے۔ یہ بھی ارتضیٰ نے قبول کر لیا۔ پھر بڑی دھوم دھام سے میرا ارتضیٰ سے نکاح ہوا۔ جب وہ کراچی میں گھر کا انتظام کر لے گا تو پھر رخصتی ہوگی۔ چھ مہینے بعد جب اُس نے گھر کا انتظام کر لیا تو میری رخصتی ہوگئی۔

میں اب ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مجھے ارتضیٰ جیسا جیون ساتھی ملے گا۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ مرد ارتضیٰ جیسے بھی ہوتے ہیں۔ جو کسی لڑکی کا فون پر رونا گڑ گڑانا سن کر صرف ہمدردی میں اتنا بڑا فیصلہ کرے گا۔ کاش اس ملک میں چوتھائی فیصد مرد بھی ارتضیٰ جیسے ہو جائیں تو یہ ملک سدھر جائے۔

میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ کوئی روٹنگ نمبر رائٹ نمبر بن جائے گا۔ روٹنگ نمبر تو اکثر وبال جان بن جاتے ہیں۔ مگر اس رائٹ نمبر نے میری زندگی سنوار دی۔ میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں کہ جس نے میرے نصیب میں ارتضیٰ کا ساتھ لکھا۔ رب کرے وہ ہمیشہ میرے ساتھ مخلص رہے۔

☆☆☆

"ابھی آپ نے مجھے دیکھا نہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ مجھے دیکھنے کے بعد آپ کو اپنا فیصلہ احمقانہ لگے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کہاں ملیں گی آپ مجھ سے۔" اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ تھی۔

میں نے سوچا آخر آزمانے میں کیا حرج ہے۔ اسے جگہ اور وقت بتانے لگی۔

"میں کوئٹہ سے پرسوں آؤں گا تم سے ملنے۔" یہ کہہ کر ارتضیٰ نے فون بند کر دیا۔

جب میری ارتضیٰ سے ملاقات ہوئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بائیس تیس سال کا بے انتہا خوب صورت نوجوان تھا مگر وہ مجھے دیکھ کر چونکا تک نہیں مگر پھر بھی میں بے امید نہیں تھی۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں مگر آپ کو دیکھ کر لگتا تو نہیں۔" میں نے بات کا آغاز کیا۔

"ہاں میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میری شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ اور میری بیٹی نو دن کی ہے۔ ہمارے ہاں کم عمری میں شادی ہو جاتی ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"میں جلد اپنے والدین کو تمہارے ہاں بھیجوں گا۔"

اس کی بات پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہ مجھے دیکھنے کے بعد بھی اپنی بات پر قائم تھا پھر اکثر میں فون پر اُس سے بات کرنے لگی۔

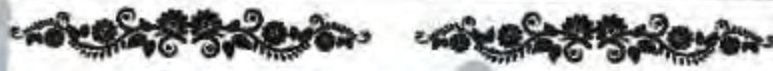
جب بھی وہ کراچی آتا ہماری ملاقات بھی ہو جاتی۔ اُس کا پورا نام ارتضیٰ بکٹی تھا۔ کوئٹہ میں اس کا اپنا کاروبار تھا۔ دولت کی اُسے کوئی کمی نہ تھی۔ وہ اکثر مجھے قیمتی تحائف دیتا۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجا۔ مگر ہمارے گھر والوں نے انہیں صاف

زندگیا سے دوسری حکایت

رونگر

نسیم سیکینہ صدق

آج کے بے حس معاشرے کی زندہ تصویر اپنے حق کے لیے انصاف تلاشی ایک دوشیزہ کی حکایت



یہ کہانی ہے رنگ پورہ کی تیس سالہ کرن ناز کی جو کہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھی۔ اس کے والد ابرار عزیز کا انتقال بھی ہو گیا تھا جب وہ صرف دس برس کی تھی۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔ انھوں نے اپنی ماں کے ساتھ بے چارگی میں زندگی گزارنے کی ٹھان لی لیکن کچھ ہی مہینوں بعد ان پر غموں کا پہاڑ پھر ٹوٹا۔ ہوا یوں کہ ان کی ماں بیمار ہوئی اور اسی بیماری میں اس کی موت بھی ہو گئی۔ اب کرن ناز پر اپنی دو بہنوں سارہ اور عمارہ کی ذمہ داری آ گئی۔ جب کہ ابھی تو وہ خود بھی نا سمجھ تھی۔ بہر حال رشتہ داروں نے سہارا دیا اور کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان گھر میں کھلوادی۔ چند ہی دنوں میں کرن ناز نے دکان سنبھال لی اور خاطر خواہ آمدنی بھی ہونے لگی۔

وقت کی گردشوں نے کرن ناز کو وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کو پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ اور خود بھی گھر پر رہ کر پڑھنے لگی۔ اس طرح وقت گزرتا رہا۔ پانچ سال بعد اس نے پرائیویٹ طور پر ہائی اسکول پاس بھی کر لیا۔ اسی بھاگ دوڑ میں اس نے کب

پاس کر لیا اور اب وہ بھی سولہ سال کی خوب صورت دوشیزہ ہو گئی تھی۔ کرن ناز کو اس کی شادی کی فکر ہوئی تو اس نے سوچا کہ پہلے اپنی شادی کر لے۔ لہذا اس نے نوید انجم سے بات کی تو اس نے شہر جا کر کچھ پیسے جمع کرنے کی بات کہہ کر ٹال دیا۔

بہر حال کرن ناز کو نوید انجم پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے سارہ کا رشتہ ایک مناسب لڑکے سے کر دیا۔

چھوٹی بہن عمارہ آٹھویں میں تھی۔ کرن ناز کی عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اپنی شادی کی فکر نہ تھی۔ اب اسے عمارہ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بہر حال نوید انجم اسے برابر دلا سے دے رہا تھا۔ اور اسی دلا سے میں چار سال اور بیت گئے۔

اس دوران کرن ناز نے عمارہ کے لیے بھی رشتہ دیکھ کر اسے رخصت کر دیا۔ کرن ناز اب اپنی ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکی تھی۔ اب اس نے نوید انجم سے فیصلہ کن لہجے میں بات کی۔ نوید انجم کے پاس بھی اب کوئی بہانہ نہیں تھا۔ لہذا اُس نے بیس دسمبر 2012ء کی تاریخ شادی کے لیے بتائی۔ لیکن 19 دسمبر کو ہی اس نے آ کر یہ دکھڑا سنا یا کہ گھر والے تیار نہیں ہیں۔

اتنا سنا تھا کہ کرن ناز آ پے سے باہر ہو گئی۔ ”میں شادی تم سے کروں گی گھر والوں سے نہیں۔ کرن نے کہا۔“ اگر تم گھر والوں سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو میری عزت کیوں برباد کی۔ دیکھو نوید میں نے اس سے پہلے کئی بار تمہارے کہنے پر ابا رشن کروایا ہے۔ لیکن اب میں ایسی حرکت کبھی نہیں کروں گی۔ اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو ساری دنیا کو تمہارے کر توت بتا دوں گی۔“ اتنا سن کر نوید بھی طیش میں آ گیا اور کہا۔

”تم جیسی بے حیا لڑکی سے کون شادی کرے گا جس کے پاس نہ عزت نہ کوئی کردار ہے۔“ اتنا کہہ کر نوید تو چلا گیا لیکن کرن ناز کے پیروں تلے سے زمین

جوانی کی دلہیز پر قید رکھا اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ خوب صورت تو وہ بھی ہی اب اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تب ہوا جب لوگوں کی ستائشی نگاہوں نے اس کا پچھا کرنا شروع کر دیا۔ محلے کے نوجوان بھی اسے دیکھ کر ذومعنی جملے اچھالنے لگے۔ لیکن وہ سب سے بے خبر صرف اپنی بہنوں کا مستقبل سنوارنے میں لگی رہی۔ لیکن ایک نوجوان کے لیے اس کے دل میں جانے کب نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

وہ نوجوان تھا نوید انجم جو کہ پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ اس نے کرن ناز کے ہائی اسکول کے فارم بھرانے سے لے کر امتحان کی تیاری میں مدد کی تھی۔ اس لیے وہ کبھی کبھی اس سے بات چیت بھی کر لیتی تھی۔ لیکن بات چیت کا سلسلہ جانے کب پیار میں بدل گیا اور ایک دن دونوں نے اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کہہ بھی دی۔ اس کے بعد یہ پیار بڑھتا ہی گیا۔ نوید انجم نے کرن ناز کو شادی کا بھی یقین دلایا اور اس یقین کی بنیاد پر کرن ناز نے ایک دن اپنی عصمت کی پونجی بھی نوید انجم پر نچھاور کر دی۔

ہو ایوں کہ عید کا موقع تھا دونوں فلم دیکھنے گئے تھے۔ اسی فلم کے ایک رومانی منظر کو دیکھ کر نوید انجم کے جذبات بھڑک اٹھے۔ کرن ناز بھی اس وقت خود کو فلم کی ہیروئن کی جگہ تصور کے خیالوں میں گم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اب تو نوید انجم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد کرن ناز کو جب ہوش آیا تو اسے ندامت ہونے لگی لیکن نوید انجم نے شادی کی تسلی دے کر اسے خوش کر دیا۔ ایک بار شرم و حیا کا بند ٹوٹا تو خواہشات کا سیلاب اُٹا آیا۔ دونوں کو جب بھی موقع ملتا تو ایک دوسرے میں کھوجاتے۔ وقت کا دریا اپنی مخصوص رفتار سے بہتا رہا۔ کرن ناز کا اسٹور اب اور بھی ترقی کرتا گیا۔ اسی دوران اس سے چھوٹی بہن سارہ نے بھی ہائی اسکول کا امتحان

نوید کا سرا احساس شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔

کرن ناز جب تھانے پہنچی تو وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔ کرن ناز نے پیچھے ہٹتے ہوئے خود اس کو اٹھایا۔ خوشی کے آنسوؤں کا سیلاب ہر طرف اٹھ آیا۔ تب تک مٹھائی بھی آچکی تھی۔ سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔ دولہا دلہن تیار تھے۔ لہذا تھانیدار دونوں کو لے کر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ جہاں پیش کرنے کے بعد ضلع کچھری کے امام قاری ثناء اللہ نے نوید انجم اور کرن ناز کا نکاح پڑھوایا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنانے کے بعد نکاح نامے پر دستخط کیے۔ کرن ناز نے دس سال کی عمر سے جتنے غم اٹھائے تھے، آج وہ سب بھول گئی تھی۔ اسے نوید انجم کے کندھوں کا سہارا مل گیا تھا۔

تحریک حقوق انسانی کی چیئر پرسن ماریہ تو اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے مقامی اخباروں اور تھانیدار عمران خان کا بھی شکریہ ادا کیا۔

اس واقعے کے کئی پہلو قابل غور ہیں کہ اکثر نوجوان لڑکیاں جذبات کے سیلاب میں بہہ کر اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہیں اور پھر ان کا مقدر ذلت و رسوائی بن جاتی ہے۔ کرن ناز مسلسل پندرہ سال ایک شخص کے جھوٹے وعدوں پر پہلے رہی اور آخر اس نے یہ کہہ کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ وہ ایک ایسی بے حیا لڑکی سے کبھی شادی نہیں کر سکتا۔ جس کا کوئی کردار نہیں حالانکہ اسے ذلت کے راستے پر ڈالنے والا وہ خود تھا۔ اگر کرن ناز اس جواب کے بعد رو دھو کر چپ ہو جاتی یا زیادہ سے زیادہ خودکشی کر لیتی تو نوید کا کیا بگڑتا؟ کرن ناز نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے حقوق کے لیے ہر دروازہ کھٹکھٹایا، جہاں سے اسے اس کا حق ملنے کی امید تھی۔ وہ ایسے رفوگر کی تلاش میں تھی جو اس کی عصمت کا چاک دامن رفو کر دے اور آخر میں جیت آج کی عورت کی ہوئی۔

☆☆☆

کھسک گئی۔

آج اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے والدین کی بھی یاد آ رہی تھی کہ اگر آج وہ ہوتے تو میں کیوں بے سہارا ہوتی۔ بہر حال اس نے ایک فیصلہ کیا اور جا پہنچی سیدھی مقامی تھانے میں۔ تھانے دار عمران خان وہاں موجود تھے۔ کرن ناز نے اپنی آپ بیتی سنائی تو انھوں نے اسے بعد میں آنے کو کہا۔

کرن ناز تھانے کے چکر لگاتی رہی لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے اپنے علاقے کے ایم پی اے کو ساری بات بتائی تو انھوں نے اسے تحریک حقوق انسانی کی چیئر پرسن ماریہ کا نمبر دیا۔ کرن ناز نے وہ نمبر ملایا تو ماریہ نے اس کا پورا نام پتا لیا اور خود ملنے کی بات کی۔

دوسرے دن ماریہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرن ناز کے گھر پہنچ گئیں۔

ساری حقیقت سن لینے کے بعد انھوں نے اسے انصاف دلانے کا یقین دلایا اور دو دن بعد ملنے کا کہا۔

دو دن بعد ماریہ کی موجودگی میں ضلع مجسٹریٹ دفتر کے سامنے مظاہرہ ہوا جس میں حقوق انسانی کی سینکڑوں ممبران نے شرکت کی۔ بعد ازاں گورنر کو مخاطب کر کے تین نکاتی میمورنڈم بھی ماریہ نے دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے دن تھانہ رنگ پورہ کے انچارج کو خصوصی حکم ملا کہ کرن ناز کے معاملہ میں کارروائی کر کے مطلع کریں۔

مجبور ہو کر تھانے دار عمران خان نوید انجم کو تھانے اٹھالائے۔ قانون کے ڈر سے نوید تو مان گیا لیکن یہاں بھی اس نے گھر والوں کی دہائی دی۔ تھانیدار نے گھر والوں کو بھی سمجھایا لیکن وہ کرن ناز کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہیں ہوئے۔ معاملہ بنانا دیکھ کر تھانیدار نے روایتی پولیس والوں کا انداز اپنایا۔ قانون کا پاٹ پڑھایا۔ تھرڈ ڈگری سے ڈرایا اور جیل کی دھمکی دی تو وہ بھی ٹوٹ گئے۔

ہندالہ انونشاب سے تیسری حکایت

دوسرا منگا

رانا نعیم اللہ

آسیبی طاقت کا مظہر ایک حکایت

حکے تھے۔ حالانکہ میں نے اپنی آنکھوں سے چوروں کو کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا۔ میرے شوہر نے لاشی لے کر تمام حویلی چھان ماری مگر چور کہیں نہ ملے۔ میرے شوہر نے آکر مجھے غصے سے کہا۔

”کچھ ہوش میں رہا کرو۔ آدھی رات کو ساری نیند خراب کر دی۔“ اور پھر وہ سو گئے۔

مگر مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے بار بار وہی سین نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرا وہم تو ہونہیں سکتا مگر..... میں کر بھی کیا سکتی تھی لہذا یہ رات میں نے کروٹ بدل بدل کر گزاری۔

☆.....☆

اگلی رات ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور شاید میں کبھی نہ بھلا سکوں۔ وہی تقریباً رات کے دو اڑھائی بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے شوہر کی فلک شکاف چیخ سن کر ہڑبڑا کر اٹھی اور دیکھا کہ میرے شوہر کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں حیران و پریشان تھی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا اور اپنے دوپٹے سے خون صاف کرنے لگی۔

یہ واقعات میری دادی اماں کے ساتھ پیش آئے تو انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ ہم ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ یہاں ہمیں رہائش کے لیے ایک حویلی نما مکان الاٹ ہوا۔ یہ حویلی شہر سے کچھ دور تھی۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ہم نے کمرے کی صفائی وغیرہ کی اور سامان وغیرہ رکھ دیا۔ ہم چونکہ کافی سفر کر کے آئے تھے لہذا ہم جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

رات کے تقریباً دو اڑھائی بجے کے قریب مجھے سخت پیاس لگی۔ میں پانی پینے کے لیے کمرے میں گئی اور پانی پی کر واپس آ رہی تھی کہ میری نظر دو نقاب پوشوں پر پڑی جو کئی کے دروازے سے آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔ میں سمجھی کہ ضرور یہ چور ہوں گے کیونکہ اس وقت حالات بھی اسی طرح کے تھے۔ آئے روز چوری، قتل اور ڈکیتی جیسی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں دوڑ کر شوہر کے پاس گئی اور انہیں جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لاشی لے کر کہا۔

”کہاں ہے چور۔“ لیکن اب چور غائب ہو

Downloaded From Paksociety.com



کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑ گئے۔
میرے شوہر نے بڑی مشکل سے یہ باتیں بتائی
تھیں۔

میں نے کہا کہ کل بھی جو میں نے دیکھے وہ یہی
نقاب پوش ہوں گے ضرور ان کا کسی جن یا روح سے
تعلق ہے اور اب یہ ہمیں اس مکان میں نکلنے نہیں
دیں گے۔“

میرے شوہر نے کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم یہ مکان
چھوڑ دیں گے اور ہم کرائے پر ہی کوئی دوسرا مکان
لے لیں گے۔“

وہ باقی رات ہم نے جاگ کر گزاری اور صبح
ہوتے ہی میرے شوہر نے شہر جا کر مکان لے لیا
اور ہم اس حویلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے آئے
مگر اس حویلی میں بیتے واقعات آج بھی میرے
ذہن میں تازہ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعات
ابھی ابھی رونما ہوئے ہوں۔“ یہ کہہ کر دادی اماں
دور خلاؤں میں دیکھنے لگتی ہیں۔

خدا سب کو ان آفات سے دور رکھے، آمین۔

☆☆☆

میرے شوہر نے بمشکل کہا۔ ”وہ..... نقاب
پوش..... ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“

”میں نے کہا۔“ آپ حوصلہ کریں اور مجھے تمام
بات بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے۔“ انہوں نے اپنے
آپ کو سنبھالا اور کہا۔

”ابھی کچھ دیر قبل دو نقاب پوش آئے اور مجھ
سے کہنے لگے کہ دو دن کے اندر یہ مکان خالی
کر دو..... یہ مکان ہمارا ہے اور ہم یہاں کسی کو
برداشت نہیں کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کون ہیں؟“
وہ غصے میں آگئے اور کہنے لگے۔ ”ہم جو بھی
ہیں ہم یہاں انسان کو برداشت نہیں کر سکتے اور
اگر تم لوگ کل تک نہ گئے تو پھر..... تمہارا انجام
بہت برا ہوگا۔“

یہ کہہ کر ان میں سے ایک نقاب پوش نے میرا
بازو پکڑا۔ اس کے ہاتھ آگ کی طرح گرم تھے اور
پھر میرے منہ پر مکا دے مارا اور کہا۔ ”یہ پہلا مکا
ہے اگر کل تک نہ گئے تو کل دوسرا اور آخری مکا ہو
گا۔“

اور پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ کسی پرندے

پانی کا پھول

فرحت صدیقی

کیا غریب بچوں کا ترقی پر کوئی حق نہیں ہوتا؟

کرکٹ اور بیڈمنٹن شوق سے کھیلتے تھے اور خواتین واک کرتی تھیں۔ سارے دن کے کاموں پر تفصیلی گفتگو کرتی تھیں اور دل ہانکا کر کے گھر چلی جاتی تھیں۔ سب ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب میری والدہ میرے پاس آتی تھیں تو میرے آنے تک بھابی شہناز امی کے پاس رہتی تھیں۔ وہ سارے محلے کی بھابی تھیں۔ ہاں تو میں بات کر رہی تھی آمنہ کی۔

ایک دن صبح جب میں اسکول جا رہی تھی تو آمنہ کی والدہ نے مجھے روک کر پوچھا۔

”باجی آپ کے اسکول کی کتنی فیس ہے۔ آمنہ تین سال کی ہو گئی ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ اسے آپ کے اسکول میں داخل کرواؤں۔“

”صفیہ مجھے ذرا جلدی ہے واپسی پر بات کرتے ہیں۔“ بھابی شہناز ساتھ ہی کھڑی تھیں۔

”باجی آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں بتا دوں گی آپ اسکول جائیں۔“ بھابی نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ ہر انسان کی اپنی زندگی ہوتی

آمنہ بارہ سال کی بچی ہے۔ گورنمنٹ اسکول میں کلاس 6th میں پڑھتی ہے۔ بے حد پیاری بچی ہے پڑھنے میں پرائیم ہو تو میرے پاس آ جاتی ہے۔ آمنہ کے والد مزدوری کرتے ہیں۔ ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بارہ سو کرایہ دیتے ہیں۔ اس کے اندر ہی کھڑکی کے ساتھ ایک چولہا رکھا ہے۔ کمرے میں کونے میں ایک چھوٹا سا ہاتھ روم ہے۔ اندر سے میز بھیاں لگا کر چھت پر چلے جاتے ہیں۔ اس سوراخ کو مٹی کی کٹالی سے بند کر دیتے ہیں۔ آمنہ کی والدہ مشین پر سلائی کر کے ہاتھ کا خرچہ نکال لیتی ہے۔ بے حد شکر گزار گھرانہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دس بارہ سال پہلے جب یہ لوگ یہاں کرائے پر آئے تھے۔ آمنہ تین سال کی تھی اور رابعہ گود میں تھی۔

دروازے کی میزھیوں پر بچے اور آمنہ کی والدہ بیٹھے رہتے تھے۔ کیونکہ ہماری گلی آگے سے بند تھی۔ آمنے سامنے بیس گھرانے تھے۔ انہوں نے مل کر گیٹ لگوا لیا تھا۔ اس کو بند کر دینے سے گلی ایک کھلا صحن بن جاتی تھی۔ جس میں بچے

شامیانے لگا دیے گئے تھے۔ خواتین کے لیے چھت پر جگہ تھی۔ عشاء کے بعد دعا تھی اور پھر کھانا، میں گھبرا گئی تھی۔ کم از کم دو سو خواتین اور چار سو سے زائد مرد حضرات میں نے گیراج میں صرف دو دو ٹیکس دیکھی تھیں۔ ایک پلاؤ کی اور ایک زردے کی۔ میں چھت سے نیچے گیراج میں آئی تو سلیم بھائی۔ (شہناز کے میاں) ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے۔ میں چپ چاپ کھڑی تھی۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ انہوں نے بلند آواز پڑھی۔ کھانا تقسیم ہونے لگا۔ میں چپکے سے گھر آ گئی کہ یا خدا یا۔ کھانا اتنا کم ہے اور لوگ اتنے زیادہ کیا ہوگا۔ میں نے بچوں کو کھانا کھلایا۔ خود بھی کھایا۔ اور وہیں سونے لگی کہ دروازے پر تیل کی آواز گونجی۔

گیٹ پر انعم کھڑی تھی۔

”آئی آپ کھانا کھائے بغیر ہی آئیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ساتھ ہی بڑی سی پرات میرے آگے کر دی۔ جس میں پلاؤ اور زردہ تھا۔

ہے۔ لیکن اپنے بچوں کے لیے اس کی سوچ ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔ اے لیول کی فیس تو ہزاروں میں ہوتی ہے۔ میرا حوصلہ نہ تھا کہ صفیہ کا دل توڑتی۔

وقت کا کام ہے گزرتا۔ وہ گزر جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد میں نے دیکھا کہ صفیہ کے بچے گورنمنٹ اسکول میں جا رہے ہیں۔ جہاں کتابیں اور یونیفارم بھی فری ہوتا ہے۔ ہم سب محلے والے اس کا بے حد خیال کرتے۔ اس کے بہنوئی کو بلڈ کینسر ہو گیا۔ اس کی بہن بھی کپڑے سلائی کرتی تھی۔ سب محلے والوں نے مل کر اس کے مہنگے ترین انجکشن کا اور ضروریات زندگی کا بوجھ اٹھایا۔

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ بھابی شہناز نے گھر سے باہر تھوڑی سی چمکی زمین میں پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ جن کی خوشبو ہمارے گھر تک محسوس ہوتی۔ ان دنوں پیار کی برسات تھی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بھابی شہناز نے درس کے لیے کسی بزرگ کو بلایا تھا۔ پوری گلی میں قنات اور

Downloaded From
Paksociety.com

میز پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ آمنہ چمک کر بولی۔

”آئی! یہ دیکھو پانی کا پھول۔“ میں سوچ کر رہ گئی۔ ”پانی کا پھول“ شاید آمنہ بھی پانی کا پھول تھی۔ آمنہ بھی خواب دیکھتی ہے۔ پھولوں کو محسوس کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی رنگ ہی رنگ ہیں۔ وہ شکر گزاری کے رنگ دیکھتی ہے۔ آمنہ پڑھ کر جا چکی تھی۔ میری سوچ کا دائرہ پانی کے پھول کے گرد ہی گھومتا رہا۔

☆.....☆.....☆

شام کو مجھے ڈاکٹر کی طرف جانا تھا۔ آمنہ کے گھر کے پاس سے گزری۔ تو وہ سو رہی تھی۔ راجہ اور وینا دونوں کھیل رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چمکتا ہوا کوئی کپڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ہمارے اسکول میں ایک دن پہلے اسپورٹس ڈے KGS کو رنگ برنگے غباروں کے ساتھ اڑا دیا گیا تھا۔ وہ شاید اڑتا ہوا آمنہ کی چھت پر گر گیا تھا۔

میرا دل اندر سے دکھ سے بھر گیا۔ کاش آمنہ جیسے بچے بھی بیروں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے ان اسکولوں میں پڑھ سکیں۔ جہاں کائنات کے سارے رنگ موجود ہوتے ہیں۔ A/C کمروں کے علاوہ Activity کے نام پر ہزاروں بچوں کو خوش کیا جاتا ہے۔

لیکن آمنہ!!

وہ تو پانی کا پھول ہے لمحوں میں غائب ہو جائے گا۔

کاش ایسا نہ وہ۔ کاش ویسا نہ ہو۔

یہ بچی پڑھ لکھ کر الیکشن میں کھڑی ہو۔ اور کامیاب ہو کر وزیر اعظم کے عہدے تک پہنچ جائے۔ تو وہ ضرور سچ سچ کے پھولوں سے معاشرے کو مہکا سکتی ہیں۔

”پانی کے پھول، کے بجائے امن، محبت اور سکون کی خوشبو سے، اپنے ملک کو مہکا سکتی ہے۔“

☆.....☆.....☆

ذرا بے کراں.....

تنہا شاموں اور اکیلی راتوں کا درد
کرب میں گزرتا لمحہ
ذہن پر سوار سلگتی یادوں کے پھرے سانپ
جینے کی آرزو میں

پل پل کا مرنا
مردہ جسم اور چھلنی روح میں
اب بھی ترے نام کی تڑپ موجود ہے
شاید کبھی تم پوچھ لو مجھ سے

تنہا شاموں اور اکیلی راتوں کا درد

علی رضا عمرانی۔ سجاوٹ

”الحم آپ سب کھانا کھالیں۔ ہم نے کھالیا ہے۔“

”آئی سب نے کھانا کھالیا ہے۔ اور سارے محلے میں اتنا تقسیم بھی کر دیا ہے۔“ ابھی بھی آدھی دیگ کھانے کی ہے۔

یہ ہوتا ہے خدا پر یقین۔ یہ ہوتا ہے اپنے رب پر ایمان اور یہ ہوتا ہے اس کی رحمت کی نوازش..... اللہ تعالیٰ نے اللہ کے نام پر کھانا کھلانے والوں کی عزت رکھ لی تھی۔ سات سو کے قریب کھانا کھلایا بھی گیا اور تقسیم بھی کیا گیا۔ سبحان اللہ۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی آمنہ کی۔ خود کلاس چھٹی میں پڑھتی ہے۔ اپنے سے چھوٹی دونوں بہنوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی پڑھاتی ہے۔ اکثر سندس کو بازار سے سودا سلف بھی لا دیتی ہے۔ اچانک مہمان آ جاتے ہیں تو وہی بھلے، سمو سے اور جلیبیاں یہاں گھر کے لیے منگواتی ہیں۔ اس کے لیے علیحدہ سے منگوا کر دیتی ہے۔

اردو کی نظم کی تشریح کرنا آتا ہے۔ آمنہ کو بھی تشریح کر رہی تھی۔ کہ پانی کی پلاسٹک کی بوتل میں ٹھنڈا پانی تھا۔ اس کو اٹھا کر میں پی رہی تھی۔

سوال؟



ایڈیٹس اور ایس مسج

ایڈیٹس کے قلم سے نکلی ایک نثر حکایت جو نا جانے کتنوں کو لہو لہان کرے گی

بڑی بڑی گاڑیاں چوڑے تنوں والے پھلے پھلے درخت، لمبی لمبی آوارہ سڑکیں اور سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی زندگی..... سب کچھ میرے سامنے یوں کھلا پڑا تھا جیسے میں کسی آرٹ گیلری میں کھڑا کسی بہت بڑے مصور کی مٹی اسپر پینٹنگ دیکھ رہا ہوں۔ او..... ف، کس قدر خوب صورت احساس تھا۔

آج میرا احساس میرا ہاتھ تھام کر مجھے شہر کی سب سے زیادہ بلند عمارت پر لے گیا جہاں سے میں تقریباً پورا شہر جھانک سکتا تھا۔ شروع میں انتہائی بلندی نے مجھے خوف زدہ کر دیا مگر کچھ ہی دیر میں میں نے اپنے خوف پر قابو پا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو مبہوت رہ گیا، بلند و بالا عمارات



تھمائی۔ لڑکے نے بھی اپنی شرٹ کا اوپر والا ٹین کھول کر
گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک نفاذ نکال کر لڑکی کو دے دیا۔
نوٹوں کی گڈی گریبان میں ڈال کر لڑکی پر تقریباً جھکتے ہوئے
راز کے سے انداز میں کچھ کہا اور پھر پتلون کی سائڈ والی جیب
میں سے دو تین فلم رولز (film roles) نکال کر لڑکی کو دکھائے
دوبارہ جیب میں رکھ کر بائیک اشارٹ کی اور یہ جاؤ وہ جا۔ لڑکی
صدے کی حالت میں گنگ کھڑی رہ گئی خوف زدہ آنکھیں
اب برسنے لگیں۔ ان آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی بجائے
سوالیہ نشان پھسل رہے تھے۔

☆.....☆

جدید سہولیات سے آراستہ شہر کے مہنگے ترین اسپتال کی
ایمرجنسی میں ایک خاتون لائی گئی تھیں جس کے چہرے پر کسی
نے تیزاب ڈال دیا تھا۔ عملے میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگوں میں
بے چینی دوڑ گئی۔ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟
بڑے بڑے سوالیہ نشان اسپتال کے کوریڈور میں اڑنے لگے۔

☆.....☆

اس سین زدہ کمرے میں موجود چار پانچ کتے زبانیں
نکالے ہانپ رہے تھے۔ وڈیرے نے اپنی صاحب حیثیت
تبیحی کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اُس پر کاروباری کا الزام
لگایا تھا اور اس کے پیچھے ان کتوں کو دوڑایا تھا۔ کتوں نے اس
لڑکی کو بری طرح سے تھنچھوڑا تھا۔ کتے..... اب اتنے بھی کتے
نہیں تھے بے گناہ انسانی خون ان سے ہنسن نہیں ہو پایا وہ نیم
غنودگی میں تھے اُن کے چوڑے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں
سوالیہ نشان بن کر فضا میں گھم رہی تھیں۔

☆.....☆

شہر کی یہاں ہی سے دور کسی مضافاتی علاقے میں شام گہری
ہوتی جا رہی تھی۔ گارے سے لیے سخن میں مٹی کے چولہے میں
لوہے کی پھونکی سے آگ پھونکتی ہوئی زرینہ..... اپنی عمر سے
دس سال بڑی دکھائی دیتی ہے۔ کل رات اس کے کیراج میں
کام کرنے والے بددماغ شوہر نے لوہے کی ایسی پھونکی سے مار
مار کر اس کی کمر اور چہرہ زخمی کر دیا تھا۔ بات کیا تھی؟ شاید سائن
میں نمک زیادہ ہو گیا تھا یا کوئی روٹی پکی رہ گئی تھی۔ پتا نہیں کیا
بات تھی؟ مگر اس کے شوہر نے صبح بھی اسے گالیاں دی تھیں۔
اس نے پھر بھی اس کے لیے ناشتا بنایا غسل خانے میں پانی
بھرا اور روز کی طرح دروازے تک چھوڑنے بھی آئی تھی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے نیچے سڑک پر بہت
ساری سفید سفید بٹخیں تیرتی دکھائی دیں۔ میں چونک گیا پھر ذرا
غور کیا تو وہ بٹخیں دراصل سفید ابلے یونیفارمز میں ملبوس شہر کے
اعلیٰ ترین کالج کی طالبات تھیں۔ انہوں نے ایک بڑے سے
بینر پر کچھ لکھا ہوا تھا اور نازک نازک ”تیلیاں“ لہر لہرا کر حقوق
نسوان کے لیے نعرے لگا رہی تھیں۔ انہوں نے رنگ برنگے
بلے کارڈز بھی اٹھار کھے تھے جن پر دو مختلف خواتین کی تصاویر
چپکائی گئی تھیں۔ جہاں تک میں انہیں پہچان پایا یہ وہی خواتین
تھیں جن کے حوالے سے میڈیا آج کل انصاف کی جنگ
لڑنے میں مصروف تھا۔ ساٹھ ستر طالبات اور ان کی میک اپ
زدہ استانیوں پر مشتمل بلے کارڈز لہراتا نعرے اچھالتا یہ قافلہ تو
میرے سامنے سے جلد ہی نزر گیا مگر بڑے بڑے سوالیہ نشان
دیر تک فضا میں تیرتے رہے۔

☆.....☆

چوراہے پر نصب سگنل نے اشارہ دیا تو فٹ پاتھ پر بیٹھی
تین چار رنگ برنگی گھریوں میں جیسے بجلی بھرنی۔ ”امت جنگ“
ایک سپر س ریاست..... آج کا تازہ اخبار..... آج کا تازہ
اخبار..... اخبار پڑھیں یا خبر پڑیں۔“

مرجھائی ہوئی آنکھوں سے ہوئے چہرے والی کمزوری
عبورت سب کو باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اخبار بیچ رہی
تھی مگر خود بے خبر تھی کہ آج کے دن کی سب سے بڑی خبر تو وہ
خود ہے۔ آج کا دن اس کا دن ہے حقوق نسوان کا دن ہے۔

”اے بابو دے ناں اللہ کے نام پر دے دے۔ کوئی رپیہ
دور پیہ دے دے اپنے بچوں کے سر کا صدقہ دے دے۔ اللہ
جوانی.....“

ت رکھے۔ ”زرد چہرے اچھے ہاں چھتھروں میں
پھولا ہوا پیٹ چھپاتی وہ کم عمر بھکارن ہر راہ گیر سے روپے دو
روپے کا سوال کر رہی تھی۔ مجھے تو لگا اس کے پھولے ہوئے
پیٹ میں بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پل رہا ہے۔ میں نے
نورا اپنی نظریں اس سے ہٹالیں۔ اب میری آنکھیں سگنل
کے دوسری طرف ایک بند دکان کے تھڑے پر کھڑی برقع پوش
لڑکی کی خوف میں ڈوبی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس کا ہر انداز
گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی شاید
وہ بہت جلدی میں تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے بالکل پاس آ کر
ایک اسپورٹس بائیک رکی۔ لڑکی کچھ اور گھبرا گئی اور اپنے بیگ
میں سے نیلے نیلے نوٹوں کی ایک گھڑی گڈی نکال کر لڑکے کو

people talk about your figure,
your beauty, your smile,
like.....like a show
piece,.....!.....!.....just feel very bad.
بس میں چاہتا ہوں تمہیں کوئی اور نہ دیکھے۔"

"ooh.....shut up, don't give
me lollypop. سب سمجھتی ہوں میں اب تم مجھے گھر
پہ قید کر کے رکھنا چاہتے ہو۔ its impossible اور تم
اپنی گھٹیا سوچ کے مالک ہو I just couldn't
imagine. میں اب ایک لمحہ تمہارے ساتھ نہیں رہوں
کی۔ divorce me. leave me right
now."

نسوانی آواز پر گویا ہڈیاں طاری ہو چکا تھا۔ یہ بھی تو
عورت ہی تھی! باشعور بڑھی لکھی اپنے حقوق سے آگاہ اور فرائض
سے بے بہرہ..... آج کی یہ نام نہاد عورت..... اس نے غلامی
کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں اس نے دوپٹے سے آزادی حاصل
کر لی ہے اب اس کی دنیا چار دیواری تک محدود نہیں ہے مگر
افسوس اس کے سر پہ اب چھت بھی تو نہیں رہی.....

اب یہ دیناروں میں نہیں بکتی کانٹریکشن سائن کرتی
ہے۔ اب بادشاہوں کے دربار میں تنگی نہیں نچوائی جاتی
پرائیویٹ ہاٹ مجرے از خود پکچرائز کرواتی ہے اور شو بزنس
میں کام کرنے سے منع کرنے پر شوہر کو چھوڑ کر چلی جاتی
ہے۔ اس ہنا پر شوہر کو چھوڑ کر جاتی عورت کی کھٹ کھٹ کرنی
سینڈل کے نیچے بہت سارے سوالیہ نشان کچلے جا رہے
تھے۔ اس طرح کچلے جانے پر جیسے سوالیہ نشانوں کو برا لگا
سارے ازاز کر میرے پاس اوپر شہر کی سب سے اونچی
عمارت پر چڑھ آئے اور میرے سر چہرے سینے کا نہ ہوں
سے ٹکرائے مجھے زخمی کرنے لگے۔ میری سانس پھول گئی
اور میں بھاگنے لگا۔ میں بھاگ کر نیچے چلے جانا چاہتا
تھا انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا چاہتا تھا مگر میرے قدم
جیسے جم سے گئے تھے گہری اداسی میرے پاؤں کی زنجیر بن
گئی تبھی سے مجھے احساس ہو رہا ہے میرے اندر بھی ایک
سوالیہ نشان پیدا ہو رہا ہے بہت بڑا..... اعصاب شکن.....
تکلیف دہ سوالیہ نشان کیا آپ کے بھی.....؟

☆☆☆

آج شام تک اس کا منہ بری طرح سوچ چکا تھا۔ آنکھ کے
پاس بڑا سائیل ابھر آتا تھا۔ بڑوں کی داوی نے کہا تھا۔ "پانی میں
تھمک ڈال کر گرم کر لو ٹکڑ کر دوگی تو آرام آجائے گا۔" اس کے
سپاٹ لہجے میں برسوں کی تھکن اور بوڑھا تجربہ جھلکتا تھا۔
زیریناب چولہے میں آگ پھونک رہی ہے پھونکنی میں
منہ بھر بھر کر پھونک مارنے سے پورے بدن میں لہریں دوڑ
جاتی ہیں مگر وہ برداشت کر رہی ہے اس کو پانی ضرور گرم کرنا ہے
اپنی سوچن کی ٹکڑ کے لیے نہیں بلکہ اپنے گیراج میں کام کرنے
والے شوہر کے لیے..... مگر لیس تیل سے سنے ہاتھ پاؤں
ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح صاف نہیں ہوتے ناں.....
مٹی کے چولہے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سوکھی گیلی
لکڑیوں سے دھواں اٹھ اٹھ کر شام کے دھندلکے میں مدغم
ہونے لگا..... مگر..... وہ دھواں..... اس دھواں کے مرغولوں
سے بھی بڑے بڑے سوالیہ نشان تھکیل پانے لگے۔

☆☆☆

شہر کے ایک ماڈرن علاقے کی جدید طرز پر بنی رہائشی
عمارت کے تیسرے فلور کی کھلی کھڑکی سے آوازیں سنائی دے
رہی تھیں۔ "مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ problem کیا
ہے؟ یہ میرا آج کا فیصلہ نہیں ہے میں تو پہلے سے کام
کر رہی ہوں۔ تمہیں سب پتا تھا You should
have thought before marriage."
"نیٹا.....! وہ بات اور تھی اب تم married ہو
اور تم سے یہی ایکسیکٹ کیا جاتا ہے کہ تم اپنا
maximum time گھر پر spend کرو۔"
"میں کوئی جاہل عورت نہیں ہوں educated
ہوں باشعور ہوں۔ تمہارے پیچھے نہیں چل رہی میں کئی
contacts ہیں میرے اس شہر میں تم مجھے نہیں دبا
سکتے۔ I know my rights very well۔
تمہیں پتا ہے تمہارا problem کیا ہے؟ You
are becoming jealous of my
fame but listen, modelling is my
passion, its my life, I can't leave
it."

"پلیز try to understand تم یوں
اسکرین پہ آتی ہو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ when

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں نے ان دنوں کے لیے سے ہر دم کی نگاہیں بڑھ کر مہمانوں کی خدمت میں
دل سے فریادیں ہیں میں انسانوں کی ہی ہے اور کسی بڑی زندگی کے لئے ہے

اجنبی محبوبہ

جاوید راہی



قتل کی ایک ایسی داستان راہی صاحب خود بھی جس کا حصہ بن گئے

خود بخود مجھ تک پہنچ جاتی ہیں اور زیر نگاہ کہانی نے تو مجھے
خوب رقص کرایا ہے۔
اس کی تفصیل سننے یہ بھی خوب کہانی ہے اس کا آغاز
خوبصورت خوشبودار لیٹر پیڈ پر درج شدہ ایک خط سے ہوتا
ہے جو مجھے ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ بہت سنبھال کر لگافہ
چاک کیا۔ بڑی نفاست سے تہہ کیا ہوا خط کھولا، لکھا تھا۔

جناب جاوید راہی صاحب! میں آپ کی تحریروں کی پرستار ہوں اور طویل
عرسے سے آپ کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ میں آپ
سے ملنا چاہتی ہوں لیکن ایسے ہی ڈرامائی انداز میں
جیسی ڈرامائی چوہن آپ کی کہانیوں میں ہوتی ہے۔
ایک تقریب ہونے والی ہے جس میں آپ کی شمولیت
کا دعوت نامہ اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔ آپ اس
تقریب میں آئیں اور مجھے تلاش کر کے مجھ سے ملیں،
اپنا مختصر حلیہ میں آپ کو بتاتی ہوں۔

میرا رنگ گلگاہی ہے، قد پانچ فٹ سات انچ ہے،
بدن خوبصورت ہے، آنکھیں سیاہ اور روشن ہیں، بس
اس سے زیادہ نہیں بتاؤں گی باقی کام آپ کا۔

چشم براہ
الماس فردوس

کہانیاں لکھنا میرا پیشہ نہیں شوق ہے اور اللہ کا فضل
ہے کہ اس شوق کی تکمیل کے لیے مجھے بہت سے مہربانوں
کا محبت بھرا تعاون حاصل ہے جن میں اخبارات و رسائل
کے مالکان ایڈیٹر اور دیگر حضرات شامل ہیں و لے تو میں
نے انسانی زندگی کے ہر شعبے پر قلم زنی کی ہے لیکن میرا
خصوصی موضوع جیل کی دیواروں کے پیچھے اپنی سلاخوں
میں محصور قیدیوں کی زندگی کی داستانیں ہیں جو نجانے
کیوں اللہ کی اس خوبصورت عطا کو یعنی زندگی کو جذبات کی
بھینٹ چڑھا کر خود کو کھودتے ہیں۔ ہمیشہ ان کے لیے
افسردہ رہتا ہوں اور مقدر و مہر کو شش کرتا ہوں کہ ان کی
تھوڑی سی دلجوئی ہی کر سکوں، اس طرح میرے محسنین
مجھے جیل کہانی والے جاوید راہی کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میری خوش بختی نے
مجھے بہت ہی اچھے دوست عطا کیے ہیں جن میں
اخبارات و رسائل کے مالکان ایڈیٹر، ٹی وی چینلوں،
پولیس افسران، وکلاء، بیرسٹر، منج صاحبان اور جیلر
حضرات شامل ہیں۔ مجھے ان سب کا تعاون حاصل
ہے اور یہ سب جاوید راہی کو ایک دیانت دار اور معتبر
شخصیت سمجھتے ہیں۔ زیادہ تر میں نے جیل میں محصور
قیدیوں کی آپ بیتیاں لکھی ہیں لیکن کبھی کبھی کہانیاں

نام لکھا ہوا تھا اسے پڑھ کر میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے باپ کا نام نادر علی شاہ تھا، اس کی ایک شاندار کوٹھی تھی، وہ ولایتی شراب کا لائسنس یافتہ امپورٹر تھا اور کروڑ پتی بن گیا تھا۔ ایک ماہ پہلے کی بات ہے، میں دفتر میں صبح کے وقت ایک میگزین کے ایڈیٹر کے پاس بیٹھا تھا جو میرا دوست بھی تھا ہم دونوں ایک کہانی کے موضوع پر بحث کر رہے تھے، اچانک ہی نادر علی شاہ دندناتا ہوں میرے دفتر میں داخل ہوا پھر ہمارے سامنے میز پر ایک میگزین پھینکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جرم کہانی لکھنے والا جاوید راہی کون ہے؟“

ایڈیٹر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں مگر بات کیا ہے؟“

نادر علی شاہ نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”اچھا تو آپ ہم جیسے شریف آدمیوں پر کچھ اچھالتے ہیں۔“

کافی دلچسپ خط تھا، ایک کہانی کار اگر حسن پرست نہ ہو تو کہانی کبھی مکمل نہیں ہوتی، اپنے رومانی ذوق کے مطابق سب سے پہلے الماس فردوس کی خیالی تصویر نگاہوں میں اُبھرنے لگی۔ درمیانے قد کی ایک دو شیزہ تصور میں مسکرانے لگی۔ اس کا رنگ گلابی مائل تھا، لباس کے پیچ و خم میں جگہ جگہ سے ڈوہتی اُبھرتی جا رہی تھی، اچھا ہی رنگ روپ لے کر شباب کی پگھڑیاں کھول رہی ہوگی، جو کچھ بھی ہو کسی اجنبی دو شیزہ کے لگاؤٹ بھرے بلاوے پر اس کے گھر جانا دانش مندی نہیں تھی۔ بعض احمق کبھی کبھی مجھے زنانہ نام سے خط لکھتے ہیں، اپنے خط کا جواب حاصل کرنے کے لیے خود کو نازک اندام دو شیزہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یعنی مجھے احمق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میں ایسے خطوط کو رومی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہوں۔ شاید الماس فردوس کے خط کا بھی یہی انجام ہوتا مگر اس خط کے نیچے اس کے باپ کا جو



**Downloaded From
Paksociety.com**

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں بے چینی سے ایڈیٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگا، ان کے چہرے کی رنگت پھلکی پڑ گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ ابھری تو میری جان میں جان آئی کہ ضرور کوئی نکتہ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”یہ جتنے مصنف حضرات ہر ماہ اتنی کہانیاں لکھتے ہیں کہ اپنی ہی لکھی ہوئی کچھلی کہانیوں کی تفصیلات انہیں یاد نہیں رہتیں لیکن میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی کہانیوں کے ایک ایک فقرے کو اپنی یادداشت میں محفوظ رکھتا ہوں، میں آپ کی بات کا جواب دینے سے پہلے انسپکٹر صاحب سے پوچھوں گا کیا انہوں نے جاوید راہی کی یہ کہانی خود پڑھی ہے؟“

”ہاں میں نے خود پڑھی ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔
 ”آپ غلط کہتے ہیں انسپکٹر صاحب، آپ صرف نادری علی شاہ صاحب کے بھڑکانے پر یہاں آ گئے ہیں۔ اگر آپ نے اسے پڑھا بھی ہے تو اس کے آخری پیرا گراف پر توجہ نہیں دی ہے۔ لیجئے میں اسے پڑھ کر سنا تا ہوں۔“ یہ کہہ کر ایڈیٹر صاحب نے میری کچھلی ہوئی کہانی کا آخری صفحہ کھول لیا۔ آخر میں لکھا تھا۔

”پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی میں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو پتا چلا کہ میں اپنی خواب گاہ میں زندہ سلامت ہوں اور شراب کشید کرنے والے کسی مجرم نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا ہے جو کچھ دیکھا خواب تھا جو سنا افسانہ تھا۔“
 میں اپنی ہی کہانی کا یہ پیرا گراف سن کر خود کو کوسنے لگا کہ مجھے اپنی کچھلی کہانیاں کیوں یاد نہیں رہتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

”کیوں انسپکٹر صاحب! اب تو ثابت ہو گیا کہ نادری علی شاہ، فلرٹ کرنے والی صاحبزادی الماس فردوس کا نہ تو حقیقتاً کوئی وجود ہے اور نہ ہی یہ کسی کہانی کے کردار ہیں، یہ محض ایک اُلجھے ہوئے خواب کی باتیں تھیں۔“

نادری علی شاہ نے جھنجھلا کر گھونسا دکھاتے ہوئے کہا ”میں سب سمجھتا ہوں، خواب دیکھنے کی آڑ لے کر مجھے مجرم ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، تم میرا کچھ

”نہیں۔ میں قلم کی روشنائی اچھالتا ہوں اگر روشنائی کا کوئی دھبہ آپ کے دامن تک پہنچا تو اس کی وضاحت فرمائیں۔“

نادری علی شاہ نے میز پر پڑے ہوئے میگزین کو اٹھا کر کہا۔ ”آپ نے مجھ پر اور میری بیٹی پر یہ کہانی لکھی ہے۔“
 ”تجرب ہے، میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے اور آپ کی بیٹی کو آج تک نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔“

”آپ جھوٹ کہتے ہیں آپ نے اس کہانی میں باقاعدہ میرا اور میری بیٹی کا نام لکھا ہے میرا نام نادری علی شاہ ہے، میری بیٹی کا الماس ہے۔ آپ یہ کمزور سا عذر پیش نہ کریں کہ آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ جیسے لکھنے والوں کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہیں۔ آپ جاسوسوں کی طرح دولت مند گھرانوں میں جھانکتے پھرتے ہیں، آپ نے اس کہانی میں لکھا ہے کہ میں شراب کا امپورٹر ہونے کے باوجود غیر قانونی طور سے شراب کشید کرتا ہوں اور میری بیٹی الماس فلرٹ قسم کی لڑکی ہے آپ نے اس پر یہ شرمناک الزام لگایا کہ اس نے کتنے ہی عاشق پال رکھے ہیں۔“

نادری علی شاہ کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔ ”میرا نام انسپکٹر اعجاز دلاور ہے، آپ ثبوت پیش کریں کہ نادری علی شاہ صاحب قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شراب کشید کرتے ہیں، ثبوت ملے ہی میں انہیں گرفتار کر لوں گا، ورنہ آپ پر یہ ہنگ عزت کا دعویٰ کیا جائے گا کیونکہ آپ نے ان کی نیک سیرت صاحبزادی پر بھی کچھ اچھا لایا ہے۔“

”اگر میں نے سچی کہانی لکھی ہوتی تو ضرور ثبوت پیش کر دیتا، میری خیالی کہانی کے کرداروں کے نام محض اتفاقاً نادری علی شاہ اور ان کی صاحبزادی کے ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں، آپ کے یہ نادری علی شاہ لائسنس یافتہ امپورٹر ہیں اور میری کہانی کا کردار غیر قانونی طور پر شراب کشید کرتا ہے دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔“

”کوئی فرق نہیں ہے۔“ نادری علی شاہ نے گرج کر کہا۔ ”آپ ذرا سی ہیرا پھیری سے بات بدل رہے ہیں۔“

نہیں بگاڑ سکتے اور یاد رکھنا اگر تم نے آئندہ کسی کہانی میں میری بیٹی الماس کا نام بھی لیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

میں نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا ”تمہاری الماس ہے کس کھیت کی مولیٰ؟ اگر تمہاری بیٹی بھول سے بھی میری کہانی میں آنا چاہے گی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔“

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا۔ ”مسٹر جاوید، آپ میرے سامنے الماس کا گلا گھونٹ کر اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔“

”آپ کے سامنے نادر علی شاہ صاحب بھی مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔“

”مسٹر نادر علی شاہ اس وقت نشے میں ہیں مگر آپ ہوش و حواس میں ایسا کہہ رہے ہیں، میں آپ سے بعد میں نمٹ لوں گا، چلئے نادر شاہ صاحب۔۔۔“

ایڈیٹر صاحب نے کہا ”جناب ہمارے ہاں پانی کی افراط سے ٹھنڈا پانی پی کر جائیں۔“

گمر وہ گرم ہو کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ایڈیٹر صاحب نے مجھے سنبھایا۔

”جاوید صاحب کسی کو اس طرح مار ڈالنے کی دھمکی نہیں دینا چاہئے، آپ کسی کہانی کے کردار نہیں ہیں حقیقی زندگی میں ایسی دھمکیوں سے بجز مانہ خیالات کو پر لگ جاتے ہیں۔“

میں نے ناگواری سے کہا۔ ”آپ صرف مجھے الزام دے رہے ہیں، کیا آپ نے نہیں سنا وہ غصے میں کیا بکواس کر رہا تھا۔“ بہر حال کافی دیر تک یہ موضوع گرم رہا تھا۔

دوسرے دن نادر علی شاہ کی کال موصول ہوئی۔ ”مسٹر جاوید سے بات کرنی ہے۔“

”جی بول رہا ہوں۔“

”مسٹر جاوید، میں اپنے پچھلے دن کے رویے پر شرمندہ ہوں، دراصل میں نے بہت زیادہ پی لی تھی، بعد میں، میں نے کہانی کا آخری پیرا گراف پڑھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میری بیٹی الماس ہر ماہ آپ کی کہانیاں پڑھتی ہے، اس نے بھی آپ کی حمایت

کی ہے۔“

”آپ نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے صحیح معنوں میں انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے کیونکہ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے اس کا اعتراف کرنا بڑی بات ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آج شام کی چائے آپ میری فیملی کے ساتھ پیئیں، الماس کو بہت خوشی ہوگی۔“

”مجھے بھی یقیناً خوشی ہوگی مگر افسوس کہ میں چند دنوں تک بہت مصروف رہوں گا، آپ کچھ خیال نہ کریں جب بھی فرصت ملے گی میں آپ کو فون پر اطلاع دے کر حاضر ہوں گا۔“

میں نے نادر علی شاہ کا موبائل نمبر اپنے پاس محفوظ کر لیا، یہ سب ایک ماہ پہلے کی باتیں تھی اور اب یہ الماس فردوس کا خط آیا تھا جو نادر علی شاہ کی بیٹی تھی، میں خط کو دوبارہ پڑھنے لگا۔ اس نے بڑی بے باکی سے لکھا تھا۔

”آپ کی کہانیاں پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرنے لگی ہوں جیسے ان کہانیوں کے رومانی ماحول میں آپ مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں، آپ اسے میری خوش فہمی سمجھ لیں مگر ہر جوان لڑکی کی طرح مجھے بھی سہانے خواب دیکھنے کا حق ہے۔“

اس کی بے باک تحریر بتا رہی تھی کہ واقعی وہ فلرٹ کرنے والی لڑکی ہے، تحریر کی نصف ملاقات میں اس حد آگے بڑھ گئی تھی اگر کوئی خوش آمدید کہنے والی ہو تو اور اس نے اپنا جغرافیہ بھی بتا دیا ہو تو اپنا دل بھی اس کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے، میں نے وہاں اس لیے بھی جانا مناسب سمجھا تھا کہ میں اس کے باپ کی طرف سے موصول ہونے والی کال میں اس سے کبھی کسی دن آنے کا وعدہ کر چکا تھا، چنانچہ میں نے دعوت والے دن شام کو نادر علی شاہ کا نمبر ملا یا دوسری طرف نادر علی شاہ ہی تھا اور جب اس نے میرا نام سنا تو خوشی سے چپک کر کہا۔

”ہیلو مسٹر جاوید، کیسے خوشی کے موقع پر آپ نے یاد کیا ہے، آج تو آپ کو ضرور آنا ہوگا، یہاں ڈنر پارٹی ہے، آج رات بھر جشن منایا جائے گا، آپ نہیں آئیں گے تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے میری غلطی کو اب تک یاد رکھا ہے۔“

”نہیں نادر شاہ صاحب، مجھے اب آپ سے کوئی

صاحب سے پوچھا۔

”کیوں وہاں اندھیرے کا کیا کام، آپ مجھے

خواتنخواہ ڈرارہے ہیں۔“

”بھئی کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں، آج کی

رات جہاں بھی جشن منایا جاتا ہے وہاں ٹھیک بارہ

بجے کو تقریباً بارہ سیکنڈ کے لیے بالکل اندھیرا کر دیا

جاتا ہے۔“

میں ایڈیٹر صاحب کو دیکھنے لگا۔ واقعی ایسا ہی ہوتا

ہے لیکن ایک آن دیکھی الماس فردوس کے پیچھے میں

نصف شب کے اندھیرے کو بھول گیا تھا، اب آزمائش

کا وقت آ گیا تھا، بچپن سے مجھ میں اندھیرے کا خوف

سایا ہوا تھا مگر اندھیرے میں کہیں الماس کے پیار کی

روشنی دکھائی دے رہی تھی چنانچہ میں نے ایڈیٹر

صاحب سے کہا۔

”ارے چھوڑیئے جناب، اب میں ایسا بچہ بھی

نہیں ہوں، اجازت دیجئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

میں وہاں سے چل بڑا، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے

میں نادر علی شاہ کی کونھی پہنچ گیا تھا، وہاں بڑی چہل پہل

نظر آ رہی تھی، کونھی کے برآمدے میں نادر علی شاہ نے

میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی دیر سے آنے

کی شکایت کی میں نے شکایت کا جواب دینے کے بعد

اس سے پوچھا۔

”سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ ایک

مسلمان ہوتے ہوئے آپ یہ نیو ایر نائٹ اس قدر

دھوم دھام سے منارے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟“

”بھئی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی بیگم کے مرنے

کے بعد ایک انگریز عورت سے شادی کی تھی، وہ بھی

مرچکی ہے، میری پہلی بیوی سے ایک بیٹی ہے جس کا

نام یا قوت سحر ہے، دوسری انگریز بیوی سے ایک بیٹا

ہے اور ایک بیٹی ہے بیٹے کا نام بہادر علی شاہ اور بیٹی کا

نام تم اپنی کہانی میں استعمال کر چکے ہو، میں ابھی تمہیں

ان سب سے ملاتا ہوں۔“

”آپ کسی کا تعارف مجھ سے نہ کرائیں، میں خود

ہی ان کو پہچاننے کی کوشش کروں گا۔“

یہ بات میں نے اس لیے کہہ دی کہ مجھے الماس

شکایت نہیں ہے، میں ڈنر کے وقت پہنچ جاؤں گا۔“

”اوہ ٹھیکس اے لائٹ، میں یہ خوشخبری ابھی

اپنے بچوں کو سناتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا اور

میں سوچنے لگا کہ کیا نادر علی شاہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ

ان کی بیٹی الماس فردوس مجھے دعوت نامہ بھیج چکی ہے

۔ شاید یہی بات تھی کہ بیٹی نے باب کے علم میں

لائے بغیر مجھے مدعو کیا تھا۔ میں نے بھی گفتگو کے

دوران اس دعوت نامے کا ذکر نہیں کیا کہ اس کی تحریر

میں جوانی چٹخارے لے رہی تھی، پھر اس نے شرط

رکھی تھی کہ میں وہاں پہنچ کر کسی سے اس کا نام نہ

پوچھوں، خود ہی اسے ایک جاسوس کی طرح تلاش

کروں، لہذا میں اسے تلاش کرنے کے لیے رات

کے آٹھ بجے گھر سے نکلنا چاہتا تھا مگر بھلا ہوا ایڈیٹر

صاحب کا عین وقت پران کی کال آ گئی۔

”کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔“

”نہیں بھئی، تھوڑا لیٹ کر دو ایک بڑی گرم

خبر ہے، اس کو آج کے ایڈیشن میں شامل کرنا ہے۔ میرا

ایک ماتحت چھٹی پر ہے اس لیے تمہیں اس کی جگہ کام

کرنا ہے جلد آ جاؤ۔“

میرا گھر ایڈیٹر صاحب کے آفس سے زیادہ دور

نہیں تھا، میں نے وہاں پہنچ کر تمام کام نمٹایا اس میں

تقریباً دو گھنٹے صرف ہوئے، جب دس بجے میں وہاں

سے چلنے لگا تو ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

”ڈنر پر اس وقت۔۔۔۔۔“

”ہاں بھئی نیو ایر فل نائٹ تقریب ہے۔“

”مگر آپ اس میں کیسے شریک ہو رہے ہیں وہاں تو

اندھیرا ہوتا ہے اور آپ کو اندھیرے میں پڑا ڈر لگتا ہے۔“

واقعی میری ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ اچانک

گھب اندھیرا ہو جائے تو مارے خوف کے میری جان

نکلنے لگتی ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں، لڑنے مرنے کے

معاملات میں پیش پیش رہتا ہوں، جو ڈو کرانے کے فن

سے واقف ہوں، کوئی دشمن مقابلے پر آ کر میرے نام

پر شکست نہیں لکھ سکتا مگر اندھیرے میں اس لیے گھبرا

جاتا ہوں بلکہ حواس باختہ ہو جاتا ہوں کہ پتا نہیں موت

کس طرف سے آرہی ہے۔ بہر حال میں نے ایڈیٹر

فردوس کی شرط پوری کرنا تھی، نادر علی شاہ نے بچتے ہوئے کہا۔

”یہاں ابھی تم کسی کو پہچان نہیں سکو گے، کوٹھی کے اندر سب فینسی ڈریس میں ہیں۔ وہ سب مختلف روپ بدلے ہوئے ہیں، کیا تم ایسی پارٹی میں پہلی بار شریک ہو رہے ہو؟“

”میں پہچان لوں گا، میرا خیال ہے کہ آپ اپنی انگریز بیوی کی یاد تازہ کرنے کے لیے جشن منا رہے ہیں۔“

”ہاں یہی سمجھ لو، دراصل الماس کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی، میں اس کی دلجوئی کے لیے انگریزوں کے تہوار بھی منالیتا ہوں، بہر حال تم اندر چلو، بارہ بجتے والے ہیں۔“

”کس کے؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔
 ”آنے والے وقت کو کون جانتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کس کے بارہ بجتے والے ہیں۔“ اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی، مجھے وہ تاریکی یاد آگئی جو ٹھیک بارہ بجے مسلط ہونے والی تھی، میں فوراً ہی کوٹھی کے اندر روشنی میں چلا آیا۔

وہاں عجوبے نظر آ رہے تھے، کسی نے خرگوش کا ماسک چہرے پر چڑھا رکھا تھا، کوئی گھوڑا بنا ہوا تھا، کوئی شہزادی کے روپ میں تھی اور کوئی شیطان بن کر اپنے سر پر دو سینگ اُگائے پیچھے سے اپنی دم ہلا رہا تھا۔ کسی نے ماسک چڑھا رکھا تھا اور کوئی نقاب پہنے ہوئے تھی، میں ہر ایک کو توجہ سے دیکھنے لگا کیونکہ مجھے الماس کی تلاش تھی۔ اچانک ہی بارہ کا گھنٹہ بج گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام روشنیوں نے دم توڑ دیا اور چاروں طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ میں ایک دم سے لڑکھڑا کر قریبی دیوار سے جا لگا۔ ہر سو ایسا گھور اندھیرا تھا جیسے جیتے جی مجھے قبر میں اتار کر مٹی برابر کر دی گئی ہو اور اب انتظار تھا کہ منکر نکیر آتے ہوں گے، کچھ اس طرح کے اندیشے مجھے خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ خوف زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، بڑے سے کمرے میں مردوں اور عورتوں کے گیت گانے کی ٹی جلی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ڈیجیٹل واچ روشن ہو گئی تھی جس پر سرخ رنگ میں

سیکنڈ گزر رہے تھے اور ساتھ ہی ہر سیکنڈ کے ساتھ آواز بھی آرہی تھی، پچھلا سال ہر سیکنڈ کے ساتھ پیچھے ہٹ رہا تھا، وہ گارہے تھے کہ پرانے سال کی آخری رات دم توڑ رہی ہے اور نیا سال طلوع ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے قریب کہیں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی، وہ سسکی تھی یا پرانے سال کی آخری ہچکی تھی، یہ بات گیت کے شور میں واضح نہ ہو سکی، گھڑی بھی بولتی جا رہی تھی، پھر اچانک ہی کوئی مجھ پر آگرا، میں نے فوراً ہی اسے بازوؤں سے سنبھال لیا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نوجوان دوشیزہ ہے۔

اندھیرے کا خوف دور ہو گیا یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ تاریکی میں ایسے خوبصورت حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی سرنگیت میں نئے سال کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے، میں نے دوشیزہ کی پذیرائی کرتے ہوئے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔
 ”ہیلو۔۔۔ کیا الماس بھینکتی ہوئی میرے پاس آگئی ہے؟“

وہ میرے بازوؤں میں مجھ سے لگی کھڑی تھی اس طرح میں اس کے خط کے مطابق اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا قدر درمیانہ ہے اور صحت بھی اچھی ہے، میں نے کہا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم ہی الماس فردوس ہو اور اگر تم ہی الماس ہو تو پھر شرط ہار کر خاموش نہ رہو۔“

اسی وقت گھڑی کی ٹک ٹک بڑے خوبصورت انداز میں ختم ہوئی اور روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پہلے چند ساعت کے لیے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے بازوؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی تاکہ کوئی ہمیں آغوش میں نہ دیکھ لے، مگر گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ ڈھیلی ہو کر فرش پر گر پڑی۔ میرے بارہ بج گئے تھے۔ میں نے روشنی میں دیکھا کہ میرے قدموں کے پاس ایک حسین دوشیزہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے، اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے تھے، پچھلے سال کی آخری ساعت میں اس کے بدن کی جان نکل چکی تھی اور اب نئے سال کی روشنی میں محض ایک لاش بن کر

جو عورتیں گانا گارہی تھیں اب چیخ کر دور بھاگنے لگیں، مرد اس لاش کے قریب آنے لگے، ایک شخص نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”ٹھہریے! آپ میں سے کوئی بھی الماس کے قریب نہ جائے میں یہاں کا فیملی ڈاکٹر ہوں، مجھے دیکھنے دیجئے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر قریب آ کر الماس پر جھک گیا۔ اب تمام لوگ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی پریشانی سے ایک ایک کا منہ مکنے لگا۔ اب سبھی کے چہروں سے نقاب اتر گئی تھی، میں جس حسینہ کی لو لگائے وہاں تک گیا تھا وہ موت سے نو لگا کر میرے بازوؤں میں آئی تھی، واہ ایسے بھی وعدہ نبھایا جاتا ہے۔ اتنے میں نادر علی شاہ مہمانوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آنے لگا۔

”کہاں ہے میری بچی، کیا ہو گیا میری الماس کو؟“

وہ بیٹی کی لاش کے سامنے آ کر ٹھنک گیا، چند ساعتوں تک وہ یوں ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگا جیسے اس کی موت کا یقین نہ آ رہا تھا پھر چیخ مار کر فرش پر جھک گیا، شاید وہ بیٹی سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے کہا۔

”زک جائیے نادر صاحب! یہ قتل کا کیس ہے آپ اسے ہاتھ نہ لگائیں، کسی نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا ہے۔“

یہ سنتے ہی تمام لوگ ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھنے لگے، ایک نوجوان نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے روشنی ہوتے ہی اس شخص کو دیکھا کہ یہ الماس کو فرش پر ڈال رہا تھا۔“

”یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔“ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔ ”الماس اس سے لگی ہوئی تھی، روشنی ہوتے ہی اس نے فوراً اسے فرش پر گرادیا۔“

دو عورتیں بھی چشم دید گواہ بن گئیں، نادر علی شاہ نے اچانک ہی لاش کے پاس سے اٹھ کر میری گردن

”بد معاش، کہنے آخر تم نے اپنی دھمکی پوری کر دی، میری معصوم بچی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک معمولی سا جھٹکا دے کر اپنی گردن چھڑائی اور بولا۔

”ہوش میں آئیے نادر علی شاہ صاحب، آپ بغیر سوچے سمجھے مجھ پر الزام لگا رہے ہیں، اسے میں نے نہیں کسی اور نے ہلاک کیا ہے، دانش مندی یہ ہے کہ آپ فوراً اپنے مہمانوں کی کنتی کریں اور اس ہال کے تمام دروازے بند کرادیں، اگر قاتل کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا ہے تو وہ یقیناً ہمارے درمیان موجود ہوگا۔“

کچھ لوگوں نے میری تائید کی اور فوراً ہی دروازے بند ہونے لگے ایک نوجوان نے نادر علی شاہ سے کہا۔

”ڈیڈی، آپ مہمانوں کی کنتی کریں میں انسپکٹر دلاور کو فون کرتا ہوں۔“ ڈیڈی کہنے والا اسکا بیٹا بہادر علی شاہ ہو سکتا تھا، میں نے اسے مخاطب کیا۔

”ٹھہریے، بہادر علی شاہ صاحب، آپ اس علاقے کے تھانے کے انچارج کو فون کریں، انسپکٹر دلاور کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ بہادر علی شاہ نے غصے سے کہا۔

”میں صحیح مشورہ دے رہا ہوں، اس وقت میری پوزیشن کمزور ہے، اگر تمہارا رشوت خور انسپکٹر آئے گا تو پھر میں بھی یہاں سے پولیس کے کسی دیانت دار افسر کو فون کر دوں گا، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ قانون کے کسی ذمہ دار افسر کے آنے تک آپس میں جھگڑانا نہ بڑھاؤ۔“

ڈاکٹر صاحب نے میری تائید کی تھی ”ٹھیک ہے بہادر، اصولاً اس شخص کی بات مان لینی چاہیے، تم اس علاقے کے تھانے دار کو فون کرو۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”مگر یہ ہے کون، اب سے پہلے میں نے اسے یہاں کی کسی پارٹی میں نہیں دیکھا۔“ نادر علی شاہ نے نفرت اور غصے سے کہا۔ ”ایسے

آگے بڑھی تھی کہ اندھیرا ہو گیا۔ الماس اور یاقوت آپس میں سوتیلی بہنیں تھیں ٹھیک ایسے وقت جبکہ متوقع تارکی پھیلنے والی تھی وہ الماس کی طرف کیوں جا رہی تھی؟“ اس مہمان عورت نے کہا۔

”خاتون! میں آپ کا شکر گزار ہوں یہاں جس ہستی کی کمی ہے آپ نے اس کے متعلق چشم دید بات بتائی ہے، یہ بات قابل غور ہے کہ ٹھیک تارکی پھیلنے وقت مس یاقوت اپنی سوتیلی بہن الماس کی طرف کیوں بڑھ رہی تھیں۔“

اس دوران بہادر شاہ جو موہا بل لے کر ہال سے باہر چلا گیا تھا واپس آ گیا اور میری بات سن کر بولا، کیا تم اپنا الزام یاقوت کے سر تھوپنا چاہتے ہو، پولیس والے اس بات کا یقین نہیں کریں گے کہ یاقوت جیسی نازک لڑکی نیو ایئر ٹائٹ کے آغاز کے دوران الماس جیسی صحتمند لڑکی کا گلا گھونٹ سکتی ہے۔“

ڈاکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”یہ صاحب اپنی کہانیوں میں نازک لڑکیوں سے قتل کرواتے ہوں گے، اب یاقوت کو بھی اپنی کہانی کا کردار بنانا چاہتے ہیں۔“

نادر علی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ٹھہرو، ٹھہرو کسی بھی بات کو طنز میں یا مذاق میں نہ آؤ۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں، اس کے لیے میں نے مسٹر جاوید پر الزام لگایا ہے کیونکہ یہ میرے سامنے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دے چکے ہیں، اب ایک خاتون کی چشم دید گواہی سے پتا چلتا ہے کہ یاقوت بھی اندھیرے میں الماس کے قریب ہی موجود تھی، میں یاقوت کا دشمن نہیں ہوں وہ بھی میرا خون ہے، وہ بھی میری لاڈلی بیٹی ہے مگر میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کروں گا کہ وہ تارکی میں اپنی سوتیلی بہن کے قریب کیر گئی تھی؟“

پھر نادر علی شاہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بہادر علی! تم الماس کے گئے بھائی ہو لیکن تم اپنی بہن کے بارے میں یہ بات غلط کہہ رہے ہو کہ وہ صحتمند تھی، یہ تو موت کے بعد بھی بظاہر صحتمند نظر آرہی ہے لیکن یہ اختلاج قلب کی مریضہ تھی، کیوں ڈاکٹر

لوگوں کو اونچی سوسائٹی میں پوچھا نہیں جاتا، یہ بن بلائے مہمان کی طرح چلے آتے ہیں۔“

”شیم۔۔۔ شیم۔۔۔“ سب لوگ مجھے شرم دلانے لگے، میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”نادر علی شاہ آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے شرم آنی چاہئے، آج دوپہر کو آپ نے مجھے کال کر کے مدعو کیا تھا اور آپ نہیں جانتے آپ سے پہلے الماس نے بھی مجھے اس پارٹی میں آنے کے لیے ایک خط بھیجا تھا۔“

نادر علی شاہ نے مجھے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا ”اب میری مظلوم اور مقبول بیٹی کو بدنام کر رہے ہو کہ وہ تمہیں خط بھی لکھا کرتی تھی۔“

”کہاں ہے وہ خط؟“ ڈاکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تو میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا، اس کی آنکھوں میں جیسے بجلی بھری تھی مگر میں اپنی قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے سنبھل کر بولا۔

”وہ خط میرے پاس محفوظ ہے، میں اپنے قانونی مشیر کے ذریعے اس تحریر کو عدالت تک پہنچاؤں گا۔“

”تم خود کو بہت بڑا قانون دان سمجھتے ہو۔“

”یہ شخص جرموں کی کہانیاں لکھتا ہے۔“ نادر علی شاہ نے سب کو بتایا کہ میرا کام کیا ہے، جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

”نادر صاحب، آپ وقت ضائع کر رہے ہیں آپ کو سب سے پہلے مہمانوں کی گنتی کرنی چاہئے۔“

”میں باتوں کے دوران ہر ایک کو دیکھتا جا رہا ہوں اور پہچانتا جا رہا ہوں کہ میرے تمام معزز مہمان یہاں موجود ہیں۔“

”کیا ایک بھی کم نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف یاقوت موجود نہیں ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی خواب گاہ میں ہوگی، وہ مریضہ ہے، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

ایک مہمان عورت نے مداخلت کی ”لیکن میں نے یاقوت کو یہاں کچھ دیر پہلے دیکھا تھا، اندھیرا ہونے سے چند سیکنڈ پہلے وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی الماس کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ چند قدم

”بے شک میں بھی الماس سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن میں اس کا سگا بھائی ہوں، اس کے لیے مر سکتا ہوں، اسے مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”برخوردار گئے رشتوں میں زیادہ دشمن نکل آتے ہیں، جب فیصلے کی گھڑی آئے گی تو قانون گسے بھائی کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔“

میں بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ سن کر ذرا اطمینان ہو رہا تھا کہ الماس کی موت کے وقت صرف میں ہی نہیں بلکہ یاقوت، ڈاکٹر قدرت علی اور بہادر علی بھی آس پاس موجود تھے، میں تنہا معتبور نہیں تھا، اب اپنے طور پر بھی یہ معلوم کر سکتا تھا کہ میری مردہ محبوبہ کا قاتل کون ہے، میں نے طویل خاموشی کے بعد سب سے پہلے عارف صاحب کو مخاطب کیا۔

”عارف صاحب، اس سلسلے میں یہ سوچنا ہوگا کہ الماس کے قتل سے جس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، نادر علی صاحب کو ڈر پتی ہیں اب الماس کے حصے کی جائیداد بھی یاقوت اور بہادر علی کے درمیان تقسیم ہو جائے گی، ان دونوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا، الماس کی موت سے ڈاکٹر صاحب کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ ابھی میں نہیں کہہ سکتا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ لیکن آپ کی ساری محبت اور ہمدردیاں صرف اپنی بھانجی کے ساتھ ہیں۔ یاقوت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے آپ کا ہاتھ بھی الماس کی گردن تک پہنچے ہوں گے، یہ ہال زیادہ بڑا نہیں ہے جس وقت اندھیرا ہوا اس وقت آپ بھی الماس سے زیادہ دور نہیں تھے۔“

”اچھی بات ہے، تمہاری الزام تراشی پر مجھے غصہ نہیں آئے گا، مفروضہ قاتلوں کی فہرست میں مجھے بھی شامل کر لو۔“ ماموں عارف نے بڑی فراخ دلی سے مسکرا کر کہا۔

اتنے میں انسپکٹر دلاور وہاں پہنچ گیا اس کے ساتھ اٹلی جنس کا ایک نامور آفیسر مسعود پرویز بھی تھا جسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں اس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے فوراً ایک اجنبی انداز

صاحب کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔

”اس مرض نے میری بیٹی کے دل کو بہت کمزور بنا دیا تھا، یہ بات ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ وہ ایک بار خواب دیکھ کر ڈر گئی تھی اور دہشت زدہ ہو کر اس نے اپنی سانس روک لی تھی، بڑی مشکل سے اس کی سانسوں کو بحال کیا گیا تھا۔“

”ڈیڈی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ بہادر علی شاہ نے تلخ کلامی کی۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الماس اندر سے بہت کمزور تھی، اس کا گلا گھونٹنے کے لیے بہت زیادہ قوت کی ضرورت نہیں تھی۔ مرد ہو یا عورت کوئی بھی اسے گلا دبوچنے کی دہشت سے مار سکتا تھا اور وہ اس طرح ماری گئی ہے۔“

”بھائی صاحب، آپ میری بھانجی پر الزام لگا رہے ہیں۔“ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے نادر علی شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ یاقوت سحر کا ماموں تھا، اس کی صحت قابل رشک تھی، اچھا خاصا باڈی بلڈر نظر آ رہا تھا، اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایسی زندگی نمایاں تھی جیسے وہ اپنی بھانجی کو الزام سے بچانے کے لیے اپنے بہنوئی کا بھی گلا گھونٹ دے گا۔ نادر علی نے سحر کے ماموں سے کہا۔

”عارف تم اس کے ماموں ہو، مگر میں اس کا باپ ہوں، تم جانتے ہو کہ میں الماس اور یاقوت کو دو آنکھوں کی طرح عزیز رکھتا آیا ہوں، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایک خاتون کی چشم دید گواہی کو نظر انداز نہیں کروں گا، میں مسٹر جاوید اور یاقوت دونوں کا محاسبہ کروں گا۔“

”تو پھر ڈاکٹر قدرت علی اور بہادر علی کا بھی محاسبہ کرنا چاہیے میں نے ان دونوں کو بھی الماس کے قریب دیکھا ہے، کیا میری چشم دید گواہی قابل قبول نہیں ہوگی؟“

”ضرور ہوگی، سانچ کو آج کیا، میں اس وقت سے اب تک الماس کے قریب ہوں۔“

www.paksociety.com

”مجھے نادر علی صاحب نے اشتعال دلایا تھا انہوں نے کہا کہ آئندہ میں نے اپنی کسی کہانی میں الماس کا نام استعمال کیا تو وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔“

”کمال ہے، یہاں تو دھمکیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، پہلے نادر علی صاحب نے جاوید کو شوٹ کرنے کی دھمکی تھی پھر جاوید نے الماس کا گلا گھونٹ کر مار دینے کی دھمکی تھی، پھر دلاور صاحب نے جاوید سے نمٹنے کی دھمکی تھی، آپ تینوں حضرات کے تحریری بیان میں ان دھمکیوں کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔“

انسپکٹر دلاور نے چونک کر پوچھا۔ ”مسعود صاحب، کیا آپ میرا بھی بیان لیں گے، میں تو قانون کا محافظ ہوں اگر کوئی مجرمانہ انداز میں میرے سامنے کسی کو مارنے کی دھمکی دے تو میں اس حرکت سے باز رکھنے کی دھمکی دے سکتا ہوں۔“

”جئے آپ اسی انداز میں اپنا بیان لکھ دیں اور یہ بھی لکھیں کہ آپ یہاں کیوں آئے تھے، آپ کے جسم پروردی نہیں ہے، آپ اس علاقے کے تھانے دار نہیں ہیں، آپ کو اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا پھر بھی آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟“

”دعوت نامہ تو تھا میرا، بس کسی مصروفیت کی بنا پر نہ پہنچ سکا لیکن اب جبکہ یہ اطلاع ملی تو میں آپ کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔“

”لیکن بات وہی ہے کہ مسٹر بہادر علی نے متعلقہ تھانے دار کو کیوں نہیں بلایا۔ پھر آپ کو نوٹ کیا گیا آپ میرے پاس پہنچ گئے لیکن بس یہی ایک بات میرے دوست جاوید کے لیے بہتر ہوگی کیونکہ جاوید میرا بہت اچھا دوست ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ بے گناہ ہے۔ میں بھرپور کوشش کر کے اس کی بے گناہی ثابت کر کے رہوں گا۔“ پھر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

”جاوید مجھے اُمید ہے کہ تم نے یہاں کچھ ابتدائی کارروائی ضرور کی ہوگی۔“ جواب میں، میں نے اپنی کارروائی کے بارے میں بتایا، یہ بھی بتایا کہ قاتلوں کی کیا فہرست ہے اور ان میں یا قوت سحر کا نام بھی ہے جو اس وقت اپنے بیڈروم میں ہے۔

اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہے وہ جاوید راہی ذرا میں بھی دیکھوں۔“

اس کے اس انداز نے مجھے بھی سمجھا دیا کہ وہ فی الحال اجنبی بن کر رہنا چاہتا ہے۔ میں نے بہادر علی سے کہا۔

”تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، تمہیں قانون کے مطابق علاقے کے تھانے دار کو نوٹ کر کے بلانا چاہیے تھا۔“ بہادر علی مسکرا کر انسپکٹر دلاور کو دیکھنے لگا۔ دلاور نے مسعود سے کہا۔

”یہ ہیں وہ حضرت جاوید راہی صاحب پھر اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔“ میں انٹیلی جنس کا افسر ہی لے آیا اب یہ کیس سیدھا انٹیلی جنس ڈیل کرے گی اور کسی کو اعتراض نہیں رہے گا۔“

”اعتراض تو نہیں رہے گا لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ لوگ مل کر میرے خلاف محاذ بنا رہے ہیں، آپ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آپ بعد میں مجھ سے نمٹ لیں۔“

اس دوران مسعود لاش پر جھکا ہوا تھا لیکن وہ چاروں طرف کی باتیں بھی سنتا جا رہا تھا چنانچہ اس نے سر اٹھا کر دلاور سے پوچھا۔

”دلاور صاحب، کیا آپ کو مسٹر جاوید نے دھمکی دی تھی؟“

”اس سے پہلے انہوں نے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی اور یہ اس پر عمل کر چکے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے، میں اس سے پہلے الماس سے کبھی نہیں ملا، میرے پاس الماس کا ایک خط موجود ہے جس میں اس نے میری تحریری صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے اور اس نے مجھے اپنی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ یہاں ہم پہلی بار ملنے والے تھے۔ مگر اس سے پہلے کوئی قاتل ہمارے درمیان آ گیا۔“

”ٹھیک ہے، آپ وہ خط اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ میں بعد میں وہ آپ سے طلب کروں گا، ابھی آپ یہ بتائیں کہ آپ نے الماس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی کیوں دی تھی؟“

”ہوسکتا ہے کہ یہ خط جاوید صاحب نے خود ہی لکھا ہو۔“
”یا پھر کسی لڑکی سے لکھوایا ہو۔“ عارف نے کہا۔

”اچھا چلیے ذرا ان سے بھی مل لیتے ہیں۔“ مسعود نے کہا اور اس کے بیڈروم کی طرف چل پڑا۔
”میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ابھی پتا چل جاتا ہے، آپ لوگ ایک ایک کر کے میرے پاس آئیں اور اس خط کو پڑھیں، ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی اس تحریر کو پہچانتا ہو۔“
سب سے پہلے بہادر علی شاہ نے اس خط کو پڑھا اور ناگواری کے سے انداز میں اسے واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو یاقوت کی تحریر لگتی ہے۔“
میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ماموں نے غصہ سے کہا۔

”نہیں آپ یہیں رکھیے، اگر آپ کی ضرورت محسوس کی گئی تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔“ ڈاکٹر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا تھا، پھر میں نے اس سے پوچھا۔
”کیا مرض ہے یاقوت کا؟“

”تم جھوٹ بولتے ہو، کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یاقوت نے الماس کے نام سے خط لکھ کر جاوید کو یہاں پھنسانے کے لیے بلایا ہے، لاؤ میں اس تحریر کو پہچان لوں گا۔“
اس نے خط اپنے ہاتھ میں لے لیا اسے کھول کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں اس کا مرض بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“
”میں بتاتا ہوں۔“ یاقوت کے ماموں نے کہا ”اصل میں اس کو بے خوابی کا مرض ہے، پہلے اسے خوب آور گولیاں کھلائی جاتی رہیں مگر اس کی صحت گرنے لگی، پھر بھائی صاحب کو پتا چلا کہ یہ ڈاکٹر صاحب جدید طریقہ علاج سے ہر مرض کا علاج کر سکتے ہیں لہذا ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اب یہ تنویری عمل سے اس کا علاج کرتے ہیں۔ یہ اس عمل سے یاقوت کو باآسانی سلا دیتے ہیں اور اٹھنے کے لیے جو وقت مقرر کرتے ہیں اس وقت وہ بیدار ہو جاتی ہے۔“
”میں نے مرعوب انداز میں ڈاکٹر کو دیکھا لیکن وہ اس وقت بُری طرح پھرا ہوا تھا اور میری کوئی بات سننے کے لیے رضامند نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسعود آ گیا اور اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔“

”یہ تحریر تو یاقوت سے ملتی جلتی مگر میری بھانجی ایسی بے غیرت نہیں ہے، وہ ایسا محبت نامہ کبھی نہیں لکھ سکتی۔“

”جاوید ذرا مجھے وہ خط تو دکھاؤ۔“
میں نے اپنی جیب سے وہ خط نکال کر اسے دے دیا، اس نے وہ خط لے کر دیکھا پھر کہا۔ ”آپ سب حضرات یہ بات جانتے ہیں کہ الماس ایک انگریز ماں کی بیٹی تھی، وہ بے شک اردو بول سکتی تھی لیکن اردو پڑھنا یا لکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، جب اس خط کا ذکر آیا تو جاوید کی غلط فہمی دور کیوں نہیں کر دی گئی کہ الماس نہ تو اردو پڑھ سکتی تھی اور نہ ہی لکھ سکتی تھی، پھر اس نے تو یہ خط نہیں لکھا۔“

”مگر آپ کی بھانجی یاقوت میرے دوست سے دلچسپی رکھتی ہے، ابھی خواب گاہ میں جاوید کا نام سن کر بستر سے اٹھ گئی، یہاں آ کر اسے دیکھنا چاہتی تھی، میں نے اسے وہیں روک دیا اور کہا کہ جاوید آپ کے پاس آ جاتا ہے، اب ہم اس کو یہ خط دکھائیں گے اگر یہ اس کی تحریر ہے تو اسے اعتراف کر لینا چاہیے۔“
”کہاں ہیں جاوید صاحب۔۔۔؟“

مسعود نے میرا تعارف کرایا اور وہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ اتنے میں مسعود نے وہ خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا جناب، جاوید صاحب اب تو آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی۔“ بہادر علی نے کہا۔

”مس یاقوت، آپ جاوید سے بعد میں باتیں کر لیجئے گا یہ بتائیے کہ یہ خط آپ نے لکھا ہے۔“ اس نے مسعود کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اسے کھول کر پڑھنے

ہیں، اندھیرا ہونے سے چند منٹ پہلے آپ کو الماس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔
 ”دیکھنے والے درست کہتے ہیں، لیکن اندھیرا ہوتے ہی میں اپنی خواہگاہ میں واپس آگئی تھی، سب لوگ مل کر بے سُری آواز میں گارہے تھے کہ جی اُلجھنے لگا، میں وہاں نہ ٹھہر سکی، ویسے میں اس کی سوتیلی بہن ہوں، مجھ پر کتنے ہی الزامات تراشے جاسکتے ہیں۔ آپ پر شبہ کرنے والے احمق ہیں، اس خط سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ کو دھوکے سے یہاں بلا کر پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”ہاں یہ خط مجھے بہت سہارا دے رہا ہے۔“
 ہم خواہگاہ میں پہنچ گئے تھے، وہ میز کے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، پھر کاغذ قلم نکال کر بولی۔
 ”اب آپ اس کیس کی باتیں نہ کریں مجھے اُلجھن ہوتی ہے چلئے خط لکھو ایسے۔“

میں خط کھول کر کہا ”اس خط میں مجھے جناب جاوید صاحب کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اگر آپ سچ میں خط لکھتیں تو مجھے کس طرح مخاطب کریں؟“
 وہ سر جھکا کر مسکراتی ہوئی بولی ”میں آپ کو اپنے انداز میں مخاطب کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ میرے لکھنے کے دوران آپ یہ خط نہ پڑھیں ورنہ میں نہیں لکھ سکوں گی۔“

”اچھی بات ہے میں نہیں پڑھوں گا، آپ لکھنا شروع کریں۔“
 وہ قلم اٹھا کر کاغذ پر جھک گئی پھر کچھ لکھنے کے بعد کہا۔ ”میں مخاطب کر چکی ہوں، آپ آگے لکھوائے۔“
 میں خط کا مضمون پڑھنے لگا اور وہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنے لگی، میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، جب خط مکمل ہو گیا تو وہ کاغذ قلم چھوڑ کر اٹھ گئی، اس نے کن اکھیوں سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی، میں اسکا لکھا ہوا خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”میرے اور صرف میرے جاوید! آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں یوں تو آپ چند منٹ پہلے میرے سامنے آئے ہیں مگر کہانیوں کی

لگی، پڑھنے کے دوران اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی بھی جھلک رہی تھی کیونکہ وہ رومانی انداز میں خط لکھا گیا تھا اس نے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے انداز میں میری جانب دیکھا اور پھر مسعود سے کہا۔
 ”یہ تحریر ہو بہو میری ہے مگر میں نے یہ خط نہیں لکھا۔“

”آپ اسے دوبارہ پڑھیں، اس پر ذرا سا غور کریں اگر پھر بھی انکار ہو تو ابھی میرے سامنے ایسا ہی ایک خط لکھیں میں دونوں خطوط اپنے محلکے کے تحریر شناس کے پاس بھیجوں گا۔“
 ”میں اسے دس بار بھی پڑھ کر یہی کہوں گی کہ یہ میں نے نہیں لکھا ہے بے شک لکھائی کی کامیابی سے نقل کی گئی ہے، میں ابھی اپنے بیڈروم سے ایک کاغذ پر کچھ بھی لکھ کر لاتی ہوں۔“

”ٹھہرو یا قوت میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔
 ”مسعود صاحب یہ خط میرے نام آیا ہے اور یہ میرے ہی ہاتھ میں رہے گا اگر س یا قوت کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے ڈکٹیٹ کر سکتا ہوں۔“
 ”مجھے خوشی ہوگی۔“ یا قوت نے کہا ”آئیے میرے ساتھ۔“

میں اس کے ساتھ خواب گاہ کی طرف جانے لگا، اسکے ساتھ چلتے ہوئے میں نے اسے توجہ سے دیکھا تھا، خط کے مطابق وہ بھی درمیانے قد کی تھی اور صورت بھی پیاری سی تھی، وہ میری کہانیوں کی تعریف کر رہی تھی اور میں ایک شاعر کی طرح داد وصول کر رہا تھا، میں نے اس موضوع سے ہٹ کر سوال کیا۔

”الماس کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“
 ”آپ پولیس والے نہیں ہیں؟ ایسی باتوں میں وقت ضائع نہ کریں، میں آپ سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں بھی بہت سی باتیں کروں گا مگر اس وقت میرے سامنے پھاکی کا پھندہ ہے، مجھے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے، آپ بھی مشکوک

ہوں، اس کے بعد اسے سونے کے لیے کہتا ہوں اور یہ بڑے آرام سے سو جاتی ہے۔“

”پھر بیدار ہونے کے لیے کیا عمل کرتے ہیں؟“

”پہلے یوں ہوتا تھا کہ یا قوت کو سنانے کے وقت میں اس کے جاگنے کا وقت مقرر کر دیتا تھا لیکن پھر ایک مصلحت کے تحت میں نے فون کی گھنٹی مقرر کر دی ہے اور اب میں اسے حکم دیتا ہوں کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے اٹھ سکتی ہے، یہ ایک باقاعدہ عمل ہے جسے میں کر کے دکھاتا ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا پھر اس نے یا قوت پر وہ عمل کیا اور یا قوت اس کے عمل کے زیر اثر سو گئی پھر فون اس کے کان کے پاس رکھا گیا تو مسعود نے پوچھا۔

”لیکن ایک بات بتائیے کیا یہ جاگنے کے بعد دوبارہ سو جاتی ہے۔“

”نہیں یا تو یہ صبح تک جاگتی رہتی ہے یا پھر مجھ سے فون پر رابطہ کرتی ہے اور میں اسے فون پر سو جانے کا حکم دیتا ہوں اور یہ سو جاتی ہے چلئے اب کوئی بھی اس نمبر پر فون کر دو۔“

بہادر علی نے اپنے موبائل فون سے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور فون کی گھنٹی بجنے لگی، یا قوت پہلے تو نیند میں کسمپائی پھر نیم خوابیدہ انداز میں آنکھیں کھول کر فون اٹھا کر کان سے لگا لیا اور بولی۔

”ہیلو، کون۔۔۔؟“

ماموں نے فون بہادر سے لے لیا اور بولے۔

”میں تمہارا ماموں بول رہا ہوں۔“

”جی ماموں کہیے، اور ہاں میں سو گئی تھی۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے میں یہاں کہاں سے آگئی؟“ اتنی دیر میں ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”دیکھ لیا آپ لوگوں نے، یہ تھا یہ عمل۔“

”بہر حال ایک قتل ہوا ہے اور آپ جو لوگ اس میں شے کے طور پر شامل کیے ہیں ان سے میں درخواست کروں گا کہ یہ شہر چھوڑ کر نہ جائیں۔ میری ابتدائی تفتیش مکمل ہو گئی ہے اور اب میں سب سے اجازت چاہوں گا۔“ پھر اس نے میری طرف رخ کر

صورت میں آپ ہمیشہ میرے ہاتھوں میں ہیں اور میری نگاہوں کے سامنے رہے، میں ایسے ماحول کی پروردہ ہوں جہاں لڑکیاں اپنے والدین کے سامنے بھی کھل کر اپنی پسند کا اظہار کرتی ہیں، اسی لیے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ خط لکھ رہی ہوں اور میرا خیال ہے کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔

میں دوسرا خط تفتیش کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں

فقط آپ کی یا قوت، سحر“

خط پڑھتے وقت میرا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا، وہ منہ موڑے کھڑی تھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ شرما کر دوہری ہو گئی۔ حالات کے تحت میں نے زیادہ بے تکلف ہونا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر میں نے کہا۔

”پھر کب ملاقات ہوگی؟“

”جب جاہو چلے آنا، میرے کمرے کا دروازہ پائیں باغ میں گھلتا ہے، وہ ہمیشہ تمہارے انتظار میں رہے گا۔“

”اب ہمیں چلنا چاہیے، مسعود انتظار کر رہا ہوگا۔“

اس کی آنکھیں بھگ رہی تھیں اور لگتا تھا جیسے اس کا دل مجھ سے جدا ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا، مجھے اس کی بے حسی کی وجہ سمجھ نہ آئی کہ الماس سے اس کا رشتہ سو تھلا تھا تاہم دونوں ایک باپ کی اولادیں تھیں، یا قوت کا فرض تھا کہ اس کی موت پر افسوس کرتی لیکن وہ دوسری محبت کے گمن گار بنی تھی، وہ الماس سے ایسی لائق تھی جیسے الماس کسی کہانی میں قتل ہوئی ہو اور کہانی پڑھنے کے بعد اسے بھلا دیا گیا ہو۔ بڑے ہال میں مسعود بیٹھا ہوا سب کے بیانات قلمبند کر رہا تھا۔ فوٹو گرافر اور فنر پرنٹ ایکسپرٹ اپنا کام کر رہے تھے۔ میں نے الماس کی طرف سے لکھا گیا خط اور تازہ تحریر مسعود کے حوالے کر دی۔ پھر مجھے اور یا قوت کو بھی اپنا بیان قلمبند کروانا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قدرت کا بیان قابل ذکر تھا، اس نے مسعود کو جو جواب لکھوائے تھے وہ اس طرح تھے۔

”اچھا ڈاکٹر! جیسا کہ یا قوت کو بے خوابی کا مرض ہے آپ اسے کس طرح سلا دیتے ہیں۔“

”میں تنویعی عمل کے ذریعے اسے ٹرانس میں لاتا

کروں میں آرام کر رہے تھے، بس ایک سایہ دلے پاؤں یا قوت کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سائے نے یا قوت کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہلکی سی دستک دی اور اندر سے یا قوت نے دروازہ کھول دیا۔ پھر اس نے عارف کو پہچان کر کہا۔

”جی ماموں آجائے، ماموں۔“ عارف نے اندر داخل ہو کر دروازہ پھر بند کر دیا۔ یا قوت نے کہا۔

”ماموں آپ جلدی کیجئے نا، اب کیا پروگرام ہے آپ کا؟ اس بڈھے کو کب جہنم واصل کر رہے ہیں جس نے میری ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔“

جواب میں ماموں سر ہلانے لگے تھے ”وہ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی الماس نے، اب بس وہ بڈھا راستے سے ہٹ جائے پھر بہادر علی کو بھی دیکھ لوں گی کہ وہ کتنا بہادر ہے؟“ وہ بولے جا رہی تھی پھر وہ ایک دم مڑی اور ماموں کی طرف دیکھ کر بولی۔

”آپ بھی تو کچھ بولیں نا۔“

”بولو گی اب تم حوالات میں، مس یا قوت میں تمہیں تمہاری بہن الماس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔“ اچانک مسعود کی آواز ابھری۔

”مم۔۔۔ ماموں۔۔۔“ یا قوت کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

پھر اس نے اعتراف جرم کر لیا تھا، ساتھ ہی اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ الماس کے بعد اس کا اور اس کے ماموں عارف کا ارادہ نادر علی اور بہادر علی کے قتل کا تھا۔ ماموں عارف کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ صرف مسعود کی حاضر دماغی کی وجہ سے یہ کیس آرام سے حل ہو گیا تھا۔ یا قوت اور اس کا ماموں اس قتل میں ملوث تھے۔ وہ لوگ الماس، بہادر علی اور نادر علی کو راستے سے ہٹا کر دولت پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ بیماری بھی صرف ایک ڈرامہ تھی تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہو سکے۔

بہر حال مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور میں اپنی مردہ محبوبہ اور حالیہ محبوبہ عرف قاتلہ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

☆☆☆

کے کہا۔

”چلئے جاوید صاحب۔“ اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

دوسرے دن میں نے مسعود سے ملاقات کی تھی، میں نے اسے یا قوت کے بارے میں تمام باتیں بھی بتائی تھیں اور اس نے کہا تھا۔

”تمہیں اس پر بھرپور نگاہ رکھنی ہے، وہ بہت چالاک ہے۔“

”لیکن مسعود یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خط اس سے لکھوایا گیا ہو اس نے ٹرانس میں یہ الفاظ لکھے ہوں اور وہ بالکل بے قصور ہو۔“

”تمہارا اشارہ ڈاکٹر کی طرف ہے۔“

”بالکل۔“

اتنی دیر میں اطلاع ملی کہ نادر علی مسعود سے ملنا چاہتا ہے مسعود نے اسے بلوایا۔

”جناب مجھے اپنی بیٹی کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے، لیکن میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں، اب مجھے کافی حد تک شک اپنے بیٹے بہادر علی اور عارف پر بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہادر علی نے اسے مارا ہے تاکہ سارا شک عارف اور یا قوت پر جائے۔ یا قوت کو سزا ہو جائے اور وہ ساری جائیداد کا مالک بن جائے یا پھر عارف جو یا قوت کا ماموں ہے ساری دولت یا قوت کے ذریعے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرصے کے لیے یا قوت کو حراست میں لینا چاہتا ہوں۔“

”کیوں، آخر کیوں؟“

”سب کچھ سامنے آجائے گا، مجھے اس کا ایک انٹرویو کرنے دیں۔“

نادر علی سوچ میں ڈوب گیا، مسعود نے پھر کہا۔

”اچھا چلیں ایک کام کیے لیتے ہیں، میں کچھ دیر کے لیے اس کے پاس اس کے ماموں کی حیثیت سے جاؤں گا بانی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“

”کیا مطلب؟“ نادر شاہ نے کہا اور مسعود اسے کچھ سمجھانے لگا۔

رات کا آخری پہر تھا سب لوگ اپنے اپنے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جمادینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 18

سلمان نے سردار کی آواز سن کر کہا۔
"کنعان تیار ہو جاؤ اور حملہ کرو" یہ سنتے ہی جنات کو جو گروپ سلمان اس کی ماں زلیخا اور کنعان کو گرفتار کرنے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس پر تینوں نے حملہ کر دیا اور یہ دیکھ کر سردار کی حیرت اور غصے کی انتہا رہی کہ اس کے بھیجے ہوئے لشکر کے سارے سپاہی ایک ایک کر کے زمین چاٹ رہے تھے اور سلمان اس کا ساہمی اور اس کی ماں ایسے حملے کر رہے تھے کہ ان کو کوئی ایک سپاہی بھی چھو تک نہیں رہا تھا۔ ان تینوں کے پاس حملہ کرنے کے جو ہتھیار تھے ایسے ہتھیار اس سے قبل کبھی سردار اور اس کی جناتی فوج نے دیکھے تک نہیں تھے.... سردار کے سب سپاہی جن کی تعداد کوئی پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی جب صفحہ ہستی سے مٹ گئے تو سردار نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے باقی سپاہی خود بخود خوف سے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اس نے مذید کسی اور کڑی کو حملہ کرنے کا حکم دیا تو اس کا حکم نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے ایسے میں اس کے قریب کھڑے ہوئے اس کی مجلس کے مشیر کیلاش نے اس کے کان میں کہا۔

"سردار مذید جنگ جاری رکھنا ہمارے حق میں ٹھیک نہیں ہوگا آپ سلمان سے بات چیت کرنے کو کہیں اور اسے مجبور کریں کہ وہ قبیلے کے قوانین کا احترام کرنے" سردار نے یہ بات سن کر کیلاش کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا اس نے سارے ہجوم میں روحانی مجلس کے عظیم بزرگ کو تلاش کرنا شروع کیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ عظیم بزرگ موجود نہیں تھے ان کی جگہ ان کا ایک چیلہ البتہ جنگ کو شکست میں بدلتے دیکھنے میں محو تھا.... سردار نے اپنے قریب کے ایک محافظ سے اسے بلا کے لانے کو کہا.... کچھ ہی دیر میں وہ محافظ روحانی مجلس کے چیلے کو بلا کر لے آیا.... سردار اس کے ساتھ اپنے خیمے میں چلا گیا۔

"کیا بات ہے ایستوب عظیم روحانی باپ اس وقت ہمارے درمیان میں کیوں موجود نہیں ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے ہمیں اس وقت ان کی تنہی ضرورت ہے؟" سردار کی بھاری آواز جس میں غصہ بھی موجود تھا خیمے میں ایک گونج کی طرح سنائی دی۔

"وہ آئے تھے سردار مگر ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے غائب ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھ سے کہا

www.paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

تھا کہ سردار سے کہنا اس وقت سلمان کی روحانی طاقت کو ہم کسی بھی قیمت پر شکست نہیں دے سکیں گے۔ اسے آسمانی دیوتاؤں کی مدد حاصل ہے اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ سلمان کو اپنے باپ کو آزاد کرا کے لے جانے کا موقع فراہم کر دیا جائے۔“ یعقوب کی بات ابھی ٹھیک سے پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ سردار گر جا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری روحانی مجلس کے کاہن ہزاروں سال کی تپسیا کے بعد بھی ایک کل کے لونڈے کا مقابلہ کرنے سے لاجوار ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین نہیں آتا یعقوب یہ کیسے ہوا۔ بتاؤ ہمیں کیا راز ہے یہ؟“ سردار شمش کی رگوں میں لہوا گر ہوتا تو اس وقت اس کی ساری رگوں سے پھوٹ کے باہر نکل آتا۔ اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

یعقوب جیسے تھر تھر کا پنے لگا اور اس کی زبان گنگ ہوئی اس سے جو کہا تھا عظیم روحانی کاہن نے وہ بھی اس کے دماغ سے جیسے پل بھر کو صاف ہو گیا۔ اسے سردار کے غیض و طیش کے سامنے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”سردار یہ میں نہیں جانتا پر جو کہا قسم رب عظیم کی سب وہ ہی کہا جو مجھ سے عظیم روحانی کاہن نے کہلویا ہے۔“

”ہم ابھی کاہن سے ملنا چاہیں گے ابھی اور اسی وقت“ سردار کو جیسے یعقوب کی بات پر یقین نہیں آیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا۔“ یعقوب ڈرتے ڈرتے بولا۔“ آپ لازمی ان سے ملنا چاہیں گے۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوگا سردار۔“

”کیا ٹھیک نہیں ہوگا!“ سردار پوری طاقت سے گر جا۔“ کاہن سے ملنا غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا ہم اس قبیلے کے سردار ہیں اور ہمارے لیے کچھ بھی غلط نہیں ہے۔“

”جی سردار میں یہ جانتا ہوں۔ میں تو بس....“ یعقوب نے سردار کے غصے سے سرخ ہوتی انگارہ آنکھوں کی طرف دیکھا اور اس کی آواز جیسے حلق میں ہی اٹک کے رہ گئی.... سردار نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دیوچ لی اور درستی سے بولا۔

”ہمیں ابھی اور اسی وقت عظیم کاہن کے پاس لے کر چلو ہم اسی سے معلوم کریں گے یہ تماشا کیا ہوا ہے۔ ایک کل کے جن نے ہماری ماہر سپاہ کے پچاس جنات کو کیسے دوسرے جہان میں بھیج دیا۔ ایسا تو جنات کی پوری تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔“ سردار اسے دروازے کی طرف گھسنے ہی والا تھا۔ گردن چھوڑ چکا تھا۔

”سینے تو سردار میں آپ کو بتانے پر مجبور ہوں ورنہ چپ رہتا۔ عظیم روحانی کاہن نے کہا تھا کہ اگر سردار نے ان سے ملنے کی کوشش کی تو سلمان اس پورے قبیلے کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے گا۔ اس لیے سردار کو چاہیے وہ اپنی جنگجو سپاہ کو لڑنے سے منع کر دے اور سلمان کو اپنے باپ ابراہیم کو آزاد کرا کے لے جانے دے۔ یہی وقت کا فیصلہ ہے۔ سردار کو وقت کا فیصلہ اور مصلحت کو سمجھنا ہوگا نہیں تو وہ ہو جائے گا جو کسی نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“

یعقوب کی بات پوری ہوئی تو سردار کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف لرزتا دکھائی دیا۔ پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے سردار کو یعقوب کی بات پر یقین آ گیا ہے اس نے کچھ دیر تک سوچا اور پھر یعقوب کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔

”آؤ ہمارے ساتھ آؤ“ یعقوب سردار شمش کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور.... جو منظر اس نے جنگ کے میدان میں دیکھا وہ اس کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔ سلمان، اس کی ماں زلیخا اور اس کے دوست کنعان نے کشتوں کے پٹے لگا دیے تھے اور اس کی بہادر سپاہ کے جنات ایسے گاجرمولیوں کی طرح

کٹ کٹ کر گر رہے تھے کہ سردار کی آنکھوں کو یقین نہیں آیا کہ یہ اس کی وہ ہی نوح ہے جو کسی بھی مقابلے میں کبھی شکست نہیں کھاتی تھی اسے عظیم کاہن کی باتیں کھلے سچ کی طرح معلوم ہونے لگیں سلمان اس وقت کوئی عام جن نہیں تھا اس کے ساتھ آسمانوں کے دیوتا کی طاقت بھی اسی لیے اس کا اور اس کے دونوں ساتھیوں کا بال بھی بیکانہیں ہو رہا تھا اور وہ اس کے سپاہیوں کو مسلسل کاٹے ڈال رہے تھے اگر چند گھنٹے یہ جنگ اور جاری رہی تو یقیناً اس کا پورا قبیلہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ خوف اور بے یقینی نے اس کی آنکھیں پتھر ادیں اور اس کی آواز اس کے وجود میں کہیں گم ہو کے رہ گئی۔ ایسا ہی حال یعقوب کا بھی تھا مگر اسے چونکہ عظیم روحانی کاہن کی باتوں پر ایمان تھا اس لیے وہ اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے جو سردار کو ہوش و خرد سے بیگانہ آنکھیں پھاڑے جنگ کے شکست خوردہ منظر کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ سردار کو یہ تک بھول گیا ہے اسے ان حالات میں اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے ہمت کر کے سردار کو جھنجھوڑا اور بولا۔

”سردار جنگ کا نفاذہ بجانے کا حکم دیجے جس کے بجتے ہی جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اپنے باقی ساتھیوں کو مرنے سے بجائیے جلدی کچے سردار نہیں تو غضب ہو جائے گا۔“

سردار یعقوب کے جھنجھوڑنے پر ہوش میں آ گیا اور پوری طاقت سے چیخا۔

”نفاذہ بجائو ہم جنگ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں“ کئی بار سردار نے یہ بات کہی تو جنگ کا نفاذہ زور زور سے بجنے لگا اور لڑتے ہوئے سب سپاہی ایک دم چونک کر اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر گئے۔ سب کی نظریں سردار کی طرف اٹھیں۔ سلمان، زلیخا اور کنعان بھی اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے اور اسی وقت انہیں جیسے ہوش آیا کہ وہ اب تک کیسی ہولناک جنگ لڑتے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں سے کتنے لا تعداد جنات اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔ کچھ دیر تک ایسے سکوت رہا جیسے اس ماحول میں کوئی سور پھونکا جا چکا ہو اور ساری اقلیم کسی خدا کی حکم سے ساکت و جامد ہو چکی ہو۔ سردار کی آواز پھر گونجی۔

”سلمان کی بہادری کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اسے نبی خدا کی اعانت حاصل ہے اور ہماری سپاہ آج اور اس وقت اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے اس لیے ہم اس کے باپ ابراہیم کو باعزت رہا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔“

سننے ہی ایک طرف سلمان اور زلیخا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا وہیں کنعان سمیت یہاں موجود تمام جنات کی حیرانی دیدنی تھی کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سردار تو آخری جن کی موت تک لڑنے کی بات کیا کرتا تھا پھر اس نے آج اتنی جلدی شکست کیسے مان لی۔

یہ سردار کو کیا ہوا ہے۔ تاہم انہیں یہ بھی حیرانی تھی کہ اس میں ضرور کوئی ایسا راز ہے جو صرف سردار جانتا ہے بھلا ان تین جنات نے جن میں ایک عورت ہے جو سلمان کی ماں ہے یہ سب کیسے کیا۔ وہ سردار کی اتنی بہادر سپاہ کو یوں گاجرمولی کی طرح کیسے کاٹے ڈال رہے تھے۔ سلمان اتنا بہادر اور جری کیسے ہو سکتا تھا اور کوئی بھی عورت کسی مرد جن سے زیادہ جیدار کیسے ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہوا تھا کیا دنیا میں اب بھی معجزے ہوتے ہیں۔ انھوں نے تو یہ سنا تھا کہ معجزے خدا کے نبیوں کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ کسی کی عقل میں نہیں سا رہا تھا اور وہ اسے معجزے سے کم ماننے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔

سردار شکست مان چکا تھا اور اس نے سلمان کے باپ کو قید سے رہا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جب ابراہیم کو قید سے نکال کر وہاں سب کے سامنے لایا گیا تو اس وقت بھی میدان میں ایسا سکوت طاری تھا کہ جیسے سب ہی بولنا بھول گئے ہوں۔

سلمان جو ساری صورت حال کو بھانپ چکا تھا اسے ویسے بھی مدید لڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے

قبیلے کو سنانے کا کوئی لالچ تھا نہ شوق اس کا مقصد خدا کی مدد سے پورا ہو چکا تھا اور وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ اس نے ابدتہ اسی سکوت کی کیفیت میں اپنی ماں اور کنعان سے روحانی رابطہ کرنے کی ایک کوشش ضرور کی تھی اور اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا روحانی رابطہ ان دونوں سے ہو گیا تھا۔ سلمان نے ان دونوں سے ایک ہی جملے میں بس اتنا کہا۔

”ہوشیار اور چوکے رہنا کہیں ہماری غفلت میں سردار کوئی چال نہ چل جائے“ پھر اسے نے دیکھا کہ اس کی ماں اور اس کا دوست کنعان پہلے سے زیادہ چوکس کھڑے ہو چکے تھے۔ ابراہیم نے سارے منظر کو اپنی بے پناہ حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا اور اس کی جان سے پیاری بیوی اس کے سامنے موجود ہیں لیکن ساتھ ہی سردار اور اس کے حواری بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے اور سب کے چہروں سے ہزاروں سوال جھانک رہے تھے۔ ابراہیم سردار کے سامنے جھکنے کا سوچ ہی رہا تھا جیسا کہ قبیلے کی روایت تھی کہ یکا یک اس کی بیوی زینحان اس کی طرف بڑھی اور اس کے سینے سے لگ گئی زینحان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب کبھی آپ کو نہیں دیکھ سکوں گی مگر ہمارے بیٹے نے وہ کر دکھایا جس کا میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔“ زینحان کی بات سن کر بھی ابراہیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ماں کو باپ کے سینے سے لگے دیکھ کر سلمان اور بھی محتاط اور ہوشیار ہو گیا کہ اب وہ تین سے دو ہو چکے تھے ان کی ماں ان کے ساتھ نہیں رہی تھی وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر کہیں سے کہیں نکل چکی تھی۔ اسی وقت سردار کی آواز پھر گونجی۔

”زینحان تم اپنے شوہر کو لے جا سکتی ہو۔ ہم نے اسے آزاد کیا۔“ ابراہیم کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا وہ سردار سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ سلمان ان کے قریب آیا اور بولا۔

”بابا اب یہاں سے چلے جانا ہو گا ہم اور یہاں نہیں رک سکتے چلیں جلدی کریں“

”مگر بیٹے مجھے بتاؤ تو یہ سب کیا ہے؟“ ابراہیم کی حالت ابھی تک ایسی تھی کہ وہ تحیر کے یانیوں میں ڈول رہا تھا۔ آخر ایسا کیسے ہوا سردار نے اسے کیوں اور کس لیے رہا کر دیا وہ بھی بتا کسی پوچھ چٹھہ کے۔ پھر اس کی نظر میدان کے دوسرے حصے پر پڑی اور وہاں جو اس نے اپنے جیسے جنات کی لاشوں کے انبار دیکھے تو اس کی جیسے آواز گنگ ہوئی اور اس نے کچھ دیر تک جیسے اپنے ہوش و حواس کھو دیے۔ اسے یقین نہیں آیا کہ سردار کی ناقابل تخیل فوج کو کسی نے ایسی بے چارگی سے شکست سے دوچار کر دیا تھا اور اس شکست کا اس کی رہائی سے کیا تعلق ہے۔ تاہم اسے سلمان نے سمجھایا کہ میں آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گا اس وقت یہاں سے چلیں اور وہ باپ کو تقریباً کھیسٹا ہوا وہاں سے لیے چلا گیا ابھی وہ اس جنگ کے میدان سے باہر نہیں نکلے تھے کہ سردار کی آواز پھر گونجی۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو اب تم میں سے کسی کو بھی قبیلے میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس لیے تمہیں یہ قبیلہ چھوڑ کر جانا ہو گا۔“ سلمان نے سردار کی بات سن کر ایک مسخرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا اور اسے لگا ایک شکست خوردہ سردار آخری بار خود کو یہ یقین دلارہا ہے وہ قبیلے کا سب سے طاقتور جن ہے اور اسے اب بھی حکم دینے کا حق حاصل ہے ورنہ اس شکست کے بعد سردار کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اس حکم کی کیا حیثیت ہے یہ تو سلمان کا اچھا اور نیک دل ہی تھا جو اس نے بگل بجنے کے بعد خود ہی جنگ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا ورنہ وہ اور اس کے سامنے چاہتے تو آج سردار کی سرداری کو ہمیشہ کے لیے مٹا سکتے تھے۔

مگر سلمان کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بنا اور لڑے جب سردار نے اس کے باپ کو رہا کرنے کا فیصلہ سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ اسے اب اور جنگ و قتال کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس نے

سردار کی اس احمقانہ بات کا جواب دینے کے بجائے اسے بھی اپنے حق میں سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کے مقابلے میں اس کے باپ کو قبیلے سے دور لے جانا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کا باپ ایسا قدیمی خیالات کا جن تھا جو بنا قبیلے کے رہنا کالے پانیوں کی سزا سے کم نہیں جانتا تھا۔ سلمان کا عشق کہتا تھا کہ اسے اب یہاں رہنا نہیں ہے اسے ہر حال میں اپنی صنوبر کے پاس پہنچنا ہوگا اور اسے ہر مصیبت سے بچانا ہوگا۔ صنوبر کا خیال آتے ہی وہ ایک دم ہی اپنے آس پاس سے بیگانہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ پتا نہیں اس کے اس طرح وہاں سے چلے آنے کے بعد صنوبر پر کیا گزری ہو۔ اس نے اس کے یوں چلے جانے کو کہیں بزدلی اور بے وفائی سے تو تعبیر نہیں کیا ہوگا۔ ابھی وہ اپنے زہر عشق کی ندید الجھنوں میں پتا نہیں کہاں سے کہاں نکلنے والا ہی تھا کہ کنعان اس کے قریب آیا اور بولا۔

”اب کیا سوچا ہے۔ ہم کہاں جائیں گے سردار نے ہمیں دیس نکالا دے دیا ہے۔ قبیلے سے نکل جانے کا حکم بنا دیا ہے۔“

”سردار کی کیا مجال ہے جو وہ مجھے یہاں سے نکال سکے۔ یہ ایک شکست خوردہ جن کا آخری حکم تھا جو اس نے اپنی ہی تسلی کے لیے دیا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی سردار سے یا جنات نے اسے اپنا سردار ماننے سے انکار کر دیا ہے اس سے زیادہ اس کے اس حکم کی کوئی حیثیت نہیں ہے مگر میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا اس لیے ہم یہاں سے چلے جائیں گے“ سلمان نے جوش اور جذبات کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا۔

”وہ ہی تو پوچھ رہا ہوں ہم جائیں گے کہاں؟“ کنعان نے پوچھا۔

”تم بھی عجیب ہو کنعان اس وقت جب کہ تمہیں اس بات کے حصار سے باہر ہی نہیں نکلنا چاہیے تھا کہ ہم نے بابا کو رہا کر لیا تھا اور اب ہم سردار کی طاقت کو شکست دے کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جبکہ تمہیں تو اس مقصد کی کامیابی پر تھوڑا سا بھی یقین نہیں تھا پھر اتنی جلدی اس اتنی اہم اور دہیز بات کو بھول کر تمہیں یہاں سے جانے کی پڑی ہوئی ہے“ سلمان کی بات سن کر کنعان نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو....“ سلمان نے اشتیاق سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”قسم سے مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ خوفناک جنگ میں نے ان ہاتھوں سے لڑی ہے اور یہ میں ہی تھا جس نے سردار کے اگلت سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا“

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو!“ سلمان اس کی بات سن ایک عجیب سے خمصے میں الجھ گیا۔

”کھل کے یہ کہہ ہم نے جنگ ضرور لڑی مگر ہمیں کہیں کسی بھی مرحلے پر یہ احساس تک نہیں ہوا کہ یہ ہم ہیں جو سردار کی بہادر سپاہ کو گا جرمولی کی طرح کاٹ کر پھینک رہے ہیں“

”کنعان کی بات سن کر سلمان کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے تمہیں ہوش ہی نہیں ہے کہ تم ایک ایسی خوفناک جنگ لڑ رہے تھے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ ہمارے تو صرف ہاتھ تھے، وجود تھا لیکن طاقت کوئی اور ہی تھی جو اس وقت ہمارے وجود میں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ ہم نہیں ہمارے بہروپ میں کوئی عجیبی طاقت تھی جس نے تمہارے ساتھ یہ جنگ لڑی اور فتح حاصل کی اور اب جو تم سے بات کر رہا ہوں تو یہ میں ہوں تمہارا دوست کنعان۔ تم اگر مجھ سے اب بھی یہ کہو کہ ہم سردار کی فوج کے زرخے سے تمہارے بابا کو آزاد کر سکتے ہیں تو میرا جواب اب بھی یہی ہوگا کہ یہ ناممکن ہے“ سلمان کنعان کی بات کو پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ سردار کے خلاف جنگ میں کنعان کے روپ میں کوئی اور غیر مرئی طاقت تھی جس نے اس کا ساتھ دیا تھا اور اب وہ طاقت اپنا کام

کر کے جا چکی ہے اور یہ احساس بھی کنعان کے پاس موجود نہیں ہے کہ اس نے کیسے اور کس طرح سردار کے سپاہیوں کو ایک ایک کر نیکست و نابود کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا اور دل ہی دل میں اپنے رب ذوالجلال کا شکر بجالایا جس نے ایسے کڑے وقت میں اس کی ایسی مدد کی جیسی وہ اپنے نیک بندوں کی کیا کرتا ہے غیر معمولی اور ناقابل یقین.....

”لیکن تم خود کو بار بار ہم کہہ کر کیوں مخاطب کر رہے ہو؟“ سلمان کی یہ بات سن کر کنعان کے منہ سے ایک ہنسی میں لپٹی ہوئی آواز نکلی اور وہ اسی انداز میں بولا۔

”تو کیا تمہارا خیال ہے تمہاری ماں کو میری جیسی کیفیت کا سامنا نہیں ہوا ہے۔ یقین نہیں آتا تو جاؤ اور ان سے پوچھ لو وہ بھی میری طرح اس احساس سے بے خبر ہو چکی ہیں کہ انہوں نے اتنی بہادری سے سردار کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کیسے کیا ہے“ کنعان کی بات سن کر سلمان کو یقین آ گیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ یقیناً اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا اور ان کے قریب جا کے بولا۔

”اگر آپ لوگ تھک رہے ہیں تو یہاں قریب جو غار ہے ہم اس میں کچھ دیر ٹھہر سکتے ہیں اس طرح بابا آرام بھی کر لیں گے“ زلیخا نے ابراہیم کی طرف دیکھا اور بولی۔

”نہیں بیٹا ہمیں سردار کے قبیلے کی سرحدوں سے دور نکل کر ہی ستانے اور آرام کرنے کا سوچنا چاہیے۔ کچھ پتا نہیں کہ وہ اپنی ٹھکست کا بدلہ لینے کے لیے کس طرح کی منصوبہ بندیاں کر رہا ہو“ زلیخا کی بات سن کر ابراہیم کے چہرے پر حیرت اور ناخوشگوار حسرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔

”تم تو اس طرح کہہ رہی ہو زلیخا جیسے وہ قبیلہ کسی ہمارا تھا ہی نہیں اور بس سردار کا ہی تھا۔“ ابراہیم نے اسی لہجے میں کہا۔

”اب آپ کو اچھا لگے یا برا لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس قبیلے سے اب ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں سردار کیا کہہ رہا تھا اس نے ہمیں قبیلہ بدر گردینے کا حکم دیا تھا تو اب ہم اس قبیلے میں کیسے رہ سکتے ہیں“ زلیخا کی بات سن کر ابراہیم کی سمجھ میں اب بھی پوری بات نہیں آ سکی کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔

”مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم تین جنوں نے مل کر سردار کی ایسی غضب ناک فوج کو ٹھکست کیسے دی اور یہ کیسے ہوا کہ سردار جو کل تک مجھے سزا دینے اور میری موت کے در پہ ہو رہا تھا اس نے مجھے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔“ ابراہیم اب بھی بے یقینی کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

”یہ سب تو میں آپ کو کسی محفوظ جگہ تک پہنچ کر بتاؤں گا یہ کیسے ہوا۔ لیکن آپ جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ سردار نے آپ کو رہا کر کے آپ پر کوئی احسان کیا ہے تو ایسا نہیں ہے ایک ہارے ہوئے سردار کو اپنی مکمل ٹھکست سامنے نظر آرہی تھی اس نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ آپ کو باعزت رہا کر دے نہیں تو اس کا اپنا اور اس کے قبیلے کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔“

سلمان کی بات سن کر اس کے باپ نے اسے حیرت اور ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کے بیٹے کا انسانوں میں رہتے رہتے دماغ کچھ خراب ہو چکا ہے۔ لیکن اب وہ بولا کچھ نہیں چپ رہا۔ وہ کبھی چلتے اور کبھی اڑنے لگتے ایسے ہی سارا سفر طے کیا۔ مگر اب بھی وہ اپنے گھروں سے دور تھے۔ پتا نہیں یہ فاصلہ کس قدر طویل تھا۔ کنعان سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر پہنچ کر اپنے ماں باپ کو کیسے راضی کرے گا۔ کیا کہے گا ان سے کہ سردار نے انہیں بھی سلمان کے ماں باپ کے ساتھ قبیلہ بدر گردینے دیا ہے۔ پتا نہیں وہ مانیں گے یا نہیں..... نہ مانے تو؟“ یہ سوال ایک لمحے کو اس کے حلق میں تیر ہو گیا۔ پھر اس نے خود کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ اپنے والدین کو ضرور بالضرور راضی کر لے گا۔ وہ اس کی بات کبھی ٹال ہی نہیں سکتے۔

”کیا اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“ سلمان نے قریب پہنچ کر کہا تو اس نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ”کیا سلمان سوچوں کے لیے دماغ کو اور احساس کے لیے دل کو سمجھ لیتا ہے!“

”کیا سوچنے لگے؟“ سلمان نے کہا۔ ”ہاں یہی سوچ رہا تھا کہ میرے ماں باپ کیسے راضی ہوں گے میں ان سے کیا کہوں گا کہ سردار نے انہیں کیوں قبیلے سے جانے کا کہا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو اس وقت تو انہیں یہ بات سمجھانا ممکن نہیں ہوگا تمہیں بس انہیں یہ کہنا ہوگا کہ ان کے سارے سوالوں کے جواب بعد میں دے دو گے اس وقت تو یہاں سے چلیں۔ اگر انہوں نے دیر کی تو کہیں سردار کے آدمی انہیں گرفتار کرنے نہ پہنچ جائیں۔ ہو سکتا ہے اس خوف سے وہ کوئی زیادہ حجت نہ کریں اور تمہاری بات مان جائیں“ سلمان کی بات سن کر کنعان کو کچھ حوصلہ ملا اور اسے یہ یقین آنے لگا کہ اس کے ماں باپ اس کی بات مان کر ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو جائیں گے۔

☆☆☆

جنگ ہارنے اور ابراہیم کور ہا کر نے کے بعد سردار وہاں رکا نہیں اور یعقوب کو لے کر سیدھا عظیم روحانی کاہن کی مجلسی عمارت میں پہنچا جو باقی گھروں کی طرح ایک عمارت میں ہی قائم تھی۔ عظیم کاہن کو معلوم تھا کہ سردار زخمی ناگ کی طرح جنگ میں ہونے والی شکست کے بارے میں جاننے کو سخت بے چین ہوگا اور سب سے پہلے اسی سے یہ پوچھنے پہنچے گا کہ وہ جنگ تین جنوں سے کیسے ہار سکتے ہیں۔ کاہن کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ وہ اس سے اس کی روحانی علمیت اور ایک چھوٹی عمر کے جن کے سامنے ہونے والی شکست کے بارے میں بھی بہت سے سوالات کرے گا۔ یہی ہوا جس وقت شام اس کی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو وہ اپنی عبادت کے آخری لمحوں میں تھا لیکن یہ بات اسے اب بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ سلمان کو ایسی جیسی مدد کیوں کرنی اس کی اصل وجہ کیا ہے؟؟

سردار کی گرجتی ہوئی آواز اسے سنائی دی تو وہ کاہن سمجھ گیا کہ سردار اس سے ملنے آ پہنچا ہے.... کاہن اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے سردار کے سامنے پہنچا۔ اس نے سردار کی طرف دیکھا۔ غصے سے تھمتاتے ہوئے چہرے پر شعلہ بار آنکھیں ایسے جل رہی تھیں کہ کاہن کو ایک لمحے کو اپنا وجود سردار کے غصے اور طیش کے سامنے بے بسی سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ جانتا تھا سردار کسی بھی بات سے ناراض ہونے کی صورت میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا کا حکم دے سکتا تھا اس لیے اس نے سردار کے غصے کو قابو میں رکھنے کے بارے میں گہری سوچ بچار کی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اسے سردار سے کیا کہنا ہے.....

☆☆☆

تین دن ہو چکے تھے۔ شرجیل کو گھر سے گئے ہوئے۔ اور ان تین دنوں میں شرجیل کے باپ سرفراز نے کون سی ایسی جگہ پارشتے دار اور اس کے دوستوں کے گھر تھے جہاں اس کے بارے میں پتا نہیں کروالیا تھا اس کی فیکٹری کے کتنے ہی لوگ تھے جو اس کام پر مامور تھے اور دن رات شرجیل کی ڈھنڈ یا پچی ہوئی تھی لیکن وہ کہیں ہوتا تو ملتا۔

ملک سے باہر بھی ہر رشتے دار اور امریکانی جگہوں پر اس کے بارے میں پتا کرو کر دیکھ لیا تھا مگر کہیں سے امید کی کوئی کرن جگہ گاتی ہوئی نہیں نظر آئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا شرجیل کے ملنے کی امیدیں ماند پڑتی جا رہی تھیں اور یہ ایک اندیشہ جو سب ہی ذہنوں اور دلوں میں سرسرا رہا تھا کہ کہیں اسی دشمن نے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو جس نے پہلے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اندیشہ تھا مگر اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی سب ہی اس حقیقت سے آنکھیں چرانا چاہتے تھے۔

لیتہ دور پرے کے رشتے داروں اور ملنے والوں میں ایسی باتیں دے لفظوں میں کہی جانے لگی تھیں۔
 فیکٹری کے مزدوروں اور ہر ٹکے کے ورکرز بھی اپنی اپنی کجھ سے کوزیاں ملارے تھے۔ لیکن اصل بات نہ کوئی
 جانتا تھا اور نہ ہی اس کے بارے رائے دینے کے قابل تھا۔ صنوبر کی سوچیں شل ہو چکی تھیں۔ درد جیسے دل
 میں آ کے ایسے پیٹھ گیا تھا کہ اب اس کو کہیں اور کبھی نہیں جانا۔ اس کی بھوک پیاس اور ہنسنے بولنے کی ساری
 صلاحیتیں جیسے مرچکی تھیں اور وہ خود بھی آدمی مرچکی تھی۔ اسے شرجیل نے دوسری بار ایسا دکھ دیا تھا کہ وہ اسے
 بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا۔ کچھلی بار بھی جب وہ ملک سے باہر گیا تھا تب اس کے ماں باپ نے اس پر کہیں اور
 شادی کے لیے دباؤ ڈالا ہوا تھا اور وہ سوچ بچار کرنے اور فیصلہ کرنے کی خاطر یہاں سے دور یوں کہنا زیادہ
 بہتر ہوگا کہ صنوبر سے دور بھیج دیا گیا تھا تا کہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور صنوبر سے ملنے کی جو تڑپ اس کے
 دل میں موجود تھی وہ اس کے فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کو نقصان نہ پہنچا سکے....

محبت سچی ہو تو اسے کہیں بھی بھیج دو۔ کسی بھی ماحول میں قید کر دو۔ وہ مر تو سکتی ہے مگر بے وفائی نہیں کر سکتی
 اور ایسا ہی ہوا تھا شرجیل کوئی تین مہینے بعد واپس آیا اور وہ ثابت قدم تھا اس نے اپنی محبت کا دامن چھوڑنے
 سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بتا دیا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر صنوبر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ واپس
 آنے کے بعد جب وہ صنوبر سے ملا تو صنوبر کو اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر کیوں
 چلا گیا تھا اور اگر ایسا کر ہی چکا تھا تو وہاں رہ کر اسے فون کر سکتا تھا۔ لیکن شرجیل نے کچھ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ
 وہ خود کو بھی آزمانا چاہتا تھا اور جانتا تھا کہ صنوبر سے رابطہ کرنے کی صورت میں اس کی صرف آواز سن کر بھی
 اسے پھر سے جینے اور اس کی محبت کو فخر سے اپنانے کی طاقت مل جائے گی اور وہ اپنے آپ سے بھی سارے
 سہارے چھین کر ہی خود کو آزمانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے صنوبر کو کوئی اطلاع نہیں دی اور اسے پوری طرح
 بے خبر رکھا۔

شرجیل کو لگا کہ وہ امتحان میں پورا اترتا تھا۔ مگر اصل حقیقت تو یہ تھی کہ امتحان تو صنوبر نے دیا تھا جو کچھ نہیں
 جانتی تھی کہ اس کا شرجیل کہاں ہے اور کس لیے وہ اس سے دور ہے اس کے باوجود وہ نہ صرف شرجیل کا
 انتظار کرتی رہی اس کی محبت کو دل سے لگا کر جیتی رہی اصل امتحان ہوتا ہی وہ ہے جس میں آپ کو نہ سوال پتا
 ہوں اور نہ جواب پھر بھی آپ ثابت قدم رہیں۔

صنوبر کتنی ہی دیر تک شرجیل سے ناراض رہی لیکن پھر مان ہی گئی۔ عورت کا دماغ بھلے ہی مرد سے چھوٹا
 ہوتا ہو مگر اس کا دل ہمیشہ مرد سے زیادہ بڑا ہوتا ہے اور ایسا کتنی ہی بار کتنے ہی واقعات میں ثابت ہو چکا
 ہے۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ شرجیل نے اس سے وعدہ کیا تھا اب وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا اور جب بھی کہیں بھی
 چند گھنٹوں کے لیے بھی جائے گا تو اسے ضرور باخبر رکھے گا لیکن اس بار بھی ایسا نہیں ہوا اور وہ اسے چھوڑ کر چلا
 گیا نہ جاتے ہوئے بتایا اور جانے کے بعد کوئی فون کیا نہ کسی اور ذریعے سے کوئی خبر بھیجی۔ آخر ایسا کیوں
 ہوا؟ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ مجھ سے بھی ناراض تھا لیکن مجھ سے کیوں ناراض ہوگا میں نے تو ایسا کچھ
 نہیں کیا۔ ایسے ہی سوالوں میں پر وقت ہر پل وہ گھری رہتی خود ہی سوال کرتی خود ہی جواب دیتی مگر دل کو
 سکون پھر بھی نہیں ملتا تھا کہ اصل حقیقت سے تو وہ بالکل بے خبر تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شرجیل تو دنیا سے کب کا جا چکا ہے۔ اب اس کا صرف وجود باقی ہے جس میں
 سلمان رہتا ہے اور سلمان کو کیا پتا کہ شرجیل نے اس سے کون کون سے وعدے کیے تھے جو اسے نبھانے تھے
 اسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ خود بھی صنوبر سے عشق کرتا ہے اور عشق بھی ایسا کہ صنوبر کی خاطر وہ کتنے ہی
 بہروپ بھر چکا تھا اس کے ماں باپ کی جانیں خطرے میں پڑ گئیں اس کا قبیلہ چھوٹ گیا اور وہ خود در بدر ہو گیا

پھر بھی اسے صنوبر کی محبت نہیں ملی اسے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سے نہیں کسی اور سے محبت کرتی ہے اور وہ کسی اور شرجیل ہے تو اسے بہت دکھ ہوا تھا اتنا کہ اس نے خود کو اس جہان قالی سے کہیں دور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچ لیا کہ جس زندگی میں صنوبر کی محبت نہیں ہے اس زندگی کو بھینے کا قائدہ کیا ہے اس لیے وہ اپنی جان جان آفریں کے حوالے کرنے ہی والا تھا کہ اسے ایک پر نور چہرے والے بزرگ دکھائی دیے جو اسے دور کہیں آسمانوں پر جنت اور دوزخ کے پاس لے گئے اور انھوں نے اس پر یہ راز کھولا کہ جنت اور دوزخ کے علاوہ بھی ایسی ایک جگہ ہے جہاں اس جیسے ٹوٹے دلوں کو رکھا جائے گا۔ جہاں ان کے دل جوڑ دیے جائیں گے۔ اور انھیں وہ سب ملے گا جو انھیں دنیا میں نہیں مل سکا تھا۔

لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے زندگی کا سفر پورا کیا ہو۔ اپنے پورے سانس لیے ہوں اور خود کو بھی اس محبت کے دائرے سے باہر کھینچ لانے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ محبت کو نفرت اور انتقام سے نہ بدلا ہو اور پوری طرح ثابت قدمی سے جیا ہو بن پڑے تو اپنے محبوب کے لیے ہر وقت ہر مصیبت میں اس کی مدد کی ہو ان سب شرائط پر جو بھی محبت کا روگی پورا اترے گا اسے ہی اس عظیم اور ناقابل بیان مقام پر لائے جائے گا اور یہ مقام ایسا مقام ہے۔ جو اس کے سارے دکھوں کا مداوا ہے اس کے لیے سکھ اور شانتی کی وہ منزل ہے جس کے بارے میں اگر کسی کو بھی پہلے سے بتا دیا جائے تو سب ہی یہاں آنے کی آرزو کریں اور کسی کی بھی محبت بھی نفرت سے نہ بدلے کوئی کسی کو دھوکے باز کہے اور نہ دھوکا دے مگر جس نے محبت بنائی ہے وہ نہیں چاہتا کہ محبت کو اتنی سستی شے بنا دیا جائے۔ محبت تو دنیا کی سب سے مہنگی دولت ہے اور یہ ہر کسی کو ملتی بھی نہیں ہے.....

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اسی لیے پر نور چہرے والے باریش بزرگ نے سلمان کو بھی وہ جگہ پوری طرح نہیں دکھائی اور سلمان کی آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جو کچھ بھی اس نے دیکھا تھا وہ سب ایک خواب تھا لیکن ایسا سچا خواب جس کے خواب ہونے پر جاننے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آیا اور وہ مسلسل ان نورانی چہرے والے بزرگ کو تلاش کرتا رہا اور پھر وہ اسے ایک جگہ مل گئے اور انھوں نے اسے جینے کا سلیقہ بتایا انھوں نے اسے بتایا کہ وہ عشق کی ناکامی پر دل نہ ہارے اور خود کو ان سب امتحانات سے گزارنے کے لیے تیار رکھے جن سے گزر کر اس کی محبت سرخرو ہو جائے گی اور اسے وہ مل جائے گا جو کسی کسی نفس کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ تب سے سلمان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شرجیل اور صنوبر کو ایک کرنے میں ان کی ممکن مدد کرے گا اور کبھی اپنے اس منصب سے روگردانی نہیں کرے گا۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی شرجیل کو موت کے منہ میں جانے سے نہیں بچا سکا محبت کے سودھمنوں نے چھپ کر اور ایسا کاری وار کیا تھا کہ شرجیل اس سے جانبر نہیں ہو سکا اور اسے فوری اور جذباتی فیصلے کے تحت خود کو شرجیل کے جسم میں حلول کرنا پڑا۔ اب شرجیل مر کے بھی زندہ تھا اور سلمان تحلیل ہو چکا تھا۔

کون ہوگا دنیا میں کو ایسے امتحان سے گزر سکتا ہو کہ جسے دل سے چاہو اسے کسی اور کے حوالے کر دو بھی خوشی اور اپنی مرضی سے۔

سلمان نے صرف ایسا کیا بلکہ وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ اب ہمیشہ کے لیے اپنی ہستی کو مٹا ڈالے گا اور آخری سانس تک صنوبر کا شرجیل بن کر ہی زندگی گزار دے گا۔ اسے کیا معلوم تھا فیصلہ کرتے ہی اس پر ایسی افتاد پڑے گی اور اسے بتایا جائے گا کہ اس کے پیدا کرنے والے ماں باپ کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

سرداران کی جان کا دشمن بن جائے گا اور یہ سب اسی کی وجہ سے ہوگا کہ اس کا قبیلے میں موجود نہ ہونا اور مسلسل جھوٹ بولتے چلے جانا اس کے ماں باپ کی زندگیوں کے لیے اتنا بڑا خطرہ بن جائے گا کہ انھیں اس راستے میں اپنی جانوں کا نذرانہ بھی دینا پڑ سکتا ہے۔ یہ سب سننے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا اور اسے اپنے والد کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کی خاطر اپنے قبیلے میں واپس آنا پڑا تا کہ وہ اپنے باپ کو سردار کی قید اور پھر موت کی سزا سے بچا سکے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو اسے یقین تھا اگر اس کے بابا کو کچھ ہوا تو اس کے غم میں اس کی ماں بھی زندہ نہیں رہ سکے گی اور وہ اپنی ماں اپنے باپ کو اس جرم کی سزا میں مرنے نہیں دینا چاہتا تھا جو انھوں نے کیا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے شوق عشق کی سزا میں مصلوب ہونے والے تھے تو کیوں انھیں یہ سزا ملے۔ بس ایسا ہی کچھ سوچ کر اسے شرجیل کو وہاں سے بھگا لانا پڑا اور اس سب میں جو قصور اس سے سرزد ہوا وہ یہی تھا کہ اس نے صنوبر کو نہیں بتایا تھا۔

وہ کہاں جانتا تھا کہ شرجیل پہلے بھی ایسا کر چکا تھا۔ جانتا بھی تھا تو اسے یاد نہیں رہا کہ وہ اب سلمان نہیں صنوبر کا شرجیل ہے۔ ماں باپ کے سر پر موت منڈلائی تو اسے بس اتنا ہی یاد رہا کہ وہ ان کا بیٹا سلمان ہے اور اسے انھیں بچانا ہی ہوگا۔ ہر بننے کا یہ فرض ہوتا ہے اور اسے بھی یہ فرض پورا کرنا تھا۔ کرنا چاہیے ایسے ہی خیالات نے اس کی رگ رگ میں آگ بھردی اور وہ اپنے ماں باپ کو بچانے چلا آیا۔

مگر اب وہ کب سے غار کے ایک کونے میں بیٹھا مسلسل صنوبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اس کی اس حرکت کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسے شرجیل کے ماں باپ کی اتنی فکر نہیں تھی اسے فکر تھی تو بس صنوبر کی تھی جو اس کا عشق ہے اور شرجیل کی محبت ہے۔ پتا نہیں اس کے بعد کیا ہونے والا ہے وہ سوچ کے گھوڑے دوڑاتا رہا لیکن کوئی ایسی بات وہ غلطی سے بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں صنوبر نے کہیں اسے بھلا تو نہیں دیا۔ کہیں وہ اتنی ناراض تو نہیں ہو گئی کہ اب اس کی شکل تک دیکھنا نہ چاہتی ہو۔ وہ سوچتا رہا اور کڑھتا رہا مگر اس کے دل کو کسی بھی بات سے سکون نہیں مل رہا تھا۔

اس کے قریب ہی خاموش بیٹھا ہوا کنعان جس نے اس کی خاطر اپنی جان تک کی پروا نہیں کی تھی اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اس کے ماں باپ اس کے کہنے سے اس کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں جانے پر راضی ہوں گے بھی یا نہیں... اگر وہ نہ مانے تو کیا ہوگا۔ سردار اسے یہاں رہنے نہیں دے گا اور سلمان کے یہاں سے جاتے ہی اسے اور اس کے ماں باپ کو ایسی کڑی اور عبرت ناک سزا دے گا کہ جنات کے قبیلے میں بھی بھول سے بھی کوئی سردار کے خلاف سر نہیں اٹھا سکے گا۔

سردار کے ظلم کے بارے میں سوچ کر وہ کانپ سا جاتا اب اس کے سامنے کوئی راستا باقی نہیں رہا تھا اسے ہر حال میں اپنے ماں باپ کو ساتھ لے جانا ہوگا ایسا نہ ہوا تو اس کے ماں باپ بے موت مارے جانے کے خطرے میں رہیں گے اور وہ انھیں چھوڑ کے جان نہیں جاسکے گا۔

سلمان نے کس مشکل سے اپنے ماں باپ کی جان بچائی ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جو جانیں اس نے بچائی ہیں انہی جانوں کو وہ پھر سے سردار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ جانتا تھا سلمان کی غیر موجودگی میں ان کی حیثیت کسی معمولی کیزوں مکڑوں سے زیادہ نہیں تھی۔

”اگر میرے ماں باپ جانے پر راضی نہ ہوئے تو؟“ کنعان نے جیسے اس کی اداسی اور سکوت کو اپنے سوال سے متزلزل کر دیا تھا۔

”انھیں جانا ہی ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور راستا نہیں ہے ہمارے پاس۔ سردار کو جب بھی موقع ملے گا وہ وار ضرور کرے گا اور اس کے وار سے بچنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ انھیں جانا ہی ہوگا۔“

”فرض کرو وہ نہ مانے تو کیا تم.....!“ پوری بات کنعان کر نہیں سکا کیوں اس کی بات ابھی مکمل

www.paksociety.com
نہیں ہوئی تھی اور سلمان نے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے ایسے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو "یہ ناممکن ہے کہ میں یہاں تمہاری حفاظت کی خاطر رک جاؤں مجھے تو ہر حال میں جانا ہوگا"

"تم جو کہنا چاہتے ہو اور جو سوچ رہے ہو وہ ناممکن ہے کنعان۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے میری اور میرے والد کی جان بچانے میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کی مگر اس کا بدلہ اب مجھ سے یوں تو نہ لو کہ میں جیتے جی مر جاؤں۔ اور میری زندگی دکھتا ہوا پھوڑا بن جائے۔" سلمان کی اداسی اور اندیشوں میں ڈوبی آواز سے کنعان نے اندازہ لگا لیا کہ اسے ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے تھی۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں ایسا کیا ہے جس کی خاطر تم نے خود کو فراموش کر دیا ہے اور اسی مقصد کی خاطر جی رہے ہو؟"

"ابھی نہیں.... وقت آنے پر میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ مگر ابھی میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔" سلمان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"تم پریشان کیوں ہوتے ہو ہم تمہارے اماں اور ابا کو منالیں گے انہیں ہمارے ساتھ جانا ہی ہوگا۔" سلمان نے اسے دلاسا دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے سلمان مگر ایک اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی!" کنعان نے سوچتے ہوئے کہا۔
"کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم تمہارے ماموں کے قبیلے میں جا کے رہنے لگتے۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ہم انسانوں میں ہی جا کر رہیں" کنعان کے لہجے میں جو کچھ تھا وہ سلمان سمجھ چکا تھا۔

"اتنی بڑی لڑائی لڑنے کے بعد کسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہاں کا سردار بھی ہمارے سردار کا ماتحت ہے۔"

اول تو وہ سردار شمش کے باغیوں کو کبھی پناہ نہیں دے گا اور اگر میرے ماموں مان بھی گئے اپنی بہن کی وجہ سے تو یہ اپنے ساتھ ساتھ ان کی جان کو بھی خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔"

سلمان نے قدرے تفصیل سے اسے بات سمجھائی تو کنعان کو ماننا ہی پڑا کہ سلمان سچ کہتا ہے ہمارے پاس انسانوں کی دنیا میں جا کے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔

ابراہیم کو اس کی بیوی زلیخا نے بہت حد تک مطمئن تو کر دیا تھا مگر ابراہیم اندر سے اب بھی اداس تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے پہلی بار ہی سلمان کی ضد کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے ہوتے اور اسے پڑھنے کے لیے انسانوں کی دنیا میں نہ بھیجا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔

اسے رہ رہ کر ملال ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر گئے وقت کو واپس لانے کی اس میں قدرت تھی اور نہ ہی ایسا ممکن تھا اب تو جو بھی ہو چکا تھا اسے جھیلنا ہی ہوگا اس نے سوچا۔ اسے اپنے قبیلے سے چلے جانے کا اتنا دکھ تھا کہ اس دکھ اس کے سامنے دنیا کا ہر دکھ چھوٹا تھا۔ وہ خوشی خوشی سزا پانے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ اسے بیٹے کے راز کو چھپانے کی سزا دی جا رہی تھی اور اسے بیٹے کی زندگی کی خاطر یہ سزا منظور تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے اسے اپنے قبیلے سے الگ ہونا پڑے گا۔

ابراہیم ان جنات میں سے تھا جو سمجھتے تھے کہ جس آدمی کا کوئی قبیلہ نہیں ہوتا وہ سمجھو جن ہی نہیں ہے ایسے جن کو صرف شیطان کے قبیلے میں ہی پناہ ملتی ہے اور تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا اور وہ خود کو شیطان کا چیلہ نہیں کہلو سکتا تھا اس زندگی سے تو وہ موت کہیں زیادہ اچھی تھی جو سردار اسے سلمان کا راز چھپانے کی پاداش میں دینے والا تھا۔

زلیخا نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گئی کہ اس کی ہر طرح کی تسلی اور دلاسا اس کے ابراہیم کو مطمئن نہیں کر سکا قبیلے سے جدائی تو جیسے ابراہیم کے لیے زندگی سے دور چلے جانے کے مترادف تھا۔ وہ دبے لفظوں

237

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں یہ کہہ چکا تھا کہ۔ تم لوگوں نے مجھے کیوں بچایا مر جانے دیتے۔ اس کی بات سن کر ایک لمحے کو زلیخا کو غصہ سا آ گیا تھا مگر وہ جانتی تھی اس وقت وہ قبیلے سے دور چلے جانے کے سوگ میں مبتلا ہے اس وقت اسے کوئی معقول بات بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں آئے گی مگر وقت گزر جانے کے بعد وہ سب کچھ سمجھ جائے گا۔ زلیخا اس خیال کی مالک تھی کہ اپنی اولاد سے بڑھ کر نہ تو کوئی اصول ہوتا ہے جسے توڑا نہ جاسکتا ہو اور نہ ہی کسی قبیلے کی کوئی شناخت اور پہچان ایسی ہو سکتی ہے اولاد پر جسے ترجیح دی جاسکتی ہو۔ ایک عورت تو مرد کی خاطر اپنا قبیلہ اپنے لوگ اپنا گھر بار پہلے ہی چھوڑ چکی ہوتی ہے تو اس کے لیے محبت اور رشتوں سے زیادہ اہم کیا ہو سکتا ہے یہی فرق ہوتا ہے عورت اور مرد کی سوچوں میں جو اس وقت زلیخا اور ابراہیم کی سوچوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

”کہو کاہن یہ کیسے ہوا کہ وہ کل کا وہ جن تمہارے جیسے ہزاروں سال سے عبادات غنظاں رہنے والے کاہنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ سب کے سامنے سے وہ اپنے باپ کو ایسے چھڑا کر لے گیا جیسے یہ کوئی معمولی بات تھی اور اس نے چنسی بجاتے ہی اسے سر کر لیا۔“ سردار رکا اور پھر بھڑکا۔

”جانتے ہو کتنی ذلت ہوئی ہے ہماری اور ہمارے قبیلے کی۔ کیسے اب ہم دنیا کے سامنے منہ لے کر اور سینہ تان کر چلیں گے۔ اگر تمہاری عبادات، گہری تپائیں اتنی ہی کمزور اور معمولی ہیں تو ہم یہ کیوں نہ اس روحانی مجلس کو ہی ختم کر دیں ویسے بھی ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں نظر آتا۔ بولو کاہن چپ کیوں ہو۔ ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب چاہیے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت سردار کی گرجتی ہوئی آواز نے آس پاس جیسے کسی زلزلے کو جنم دے دیا تھا اور ہر طرف خوف کی چادری تن گئی جنات کو معلوم تھا کہ سردار روحانی مجلس کے کاہن اعظم کے پاس گیا ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ آج وہ ہو جائے جو جنات کی دنیا میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ روحانی مجلس کے کاہن اعظم کی گردن ازاد ہو جائے اور قبیلہ ہمیشہ کے لیے رائڈ ہو جائے۔ روحانی مجلس نہ رہی تو سمجھو پھر کسی بھی شیطانی بلا کو اور ناگہانی آفت کو روکا نہیں جاسکے گا اور کچھ پتا نہیں کہ قبیلے والے کون کون سی مصیبتوں اور بلاؤں کا شکار ہو جائیں۔ ہر طرف یہی ایک سوچ غالب تھی اور سب دل سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ کچھ بھی ہو سردار روحانی مجلس کو ختم کرنے حکم نہ سنائے۔ کاہن حیب تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جو سردار کو مطمئن کر دینے کے لیے کارگر ہو سکتی ہے۔

”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں“ کاہن کی منجی آواز سنائی دی۔

”کہو... اور جلدی کہو... کاہن“ سردار کو اس وقت کاہن کو کاہن اعظم کہنا بھی گراں گزر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ کاہن اس اعزاز اور خطاب کو رکھنے کا حق کھو چکا ہے۔ اس نے انگارہ برساتی ہوئی آنکھوں سے کاہن کی طرف دیکھا۔ جو سردار کو مطمئن کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا۔

”سردار آپ کا غصہ بجا ہے لیکن یہ صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ کتنی بڑی قیامت تھی جو قبیلے پر ٹوٹنے والی تھی۔ اور اسے تالا ہے ہم نے اس روحانی مجلس نے۔ یہ روحانی مجلس کی روحانی صلاحیت اور قدرت تھی جس نے یہ کھوج لگایا اور وہ بھی بروقت... کہ سلمان کتنی بڑی اور سفاک تو توں کی مدد لے کر آیا تھا۔ وہ چاہتا تو آپ کو اور پورے قبیلے کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ یہ روحانی مجلس کا ہی کمال تھا جو وقت کے رہتے ہوئے اس طوفان کو بھانپنے میں کامیاب ہوئی ورنہ میرے منہ میں خاک اس وقت نہ آپ یہاں موجود ہوتے اور نہ ہی قبیلے کا کوئی ایک بھی ذی نفس زند ہوتا۔

یہ ہمارا ہی بروقت دیا گیا مشورہ تھا کہ اس وقت پسائی اختیار کر کے ابراہیم کو جانے دیا جائے۔ اس

وقت قبیلے کی زندگی کو بچایا جائے باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ تو کیا آپ کو لگتا ہے ہم نے غلط کیا اگر ہم نے غلط کیا ہے تو ہم ہر سزا کے لیے تیار ہیں۔“

کاہن چپ ہوا تو سردار کو ایسا لگا کہ واقعی کاہن سچ کہتا ہے ورنہ جس تیزی سے اس کی زیرک اور سیکھی ہوئی بہادر سپاہ کا صفایا کر رہا تھا۔ سلمان اگر یہ جنگ اور کچھ گھنٹے جاری رہتی تو سلمان اس کے سب بہادر جوانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر نابود کر دیتا۔

”ٹھیک کہتے ہیں آپ کاہن اعظم“ سردار کی آواز اور لہجے میں پھر سے کاہن کا احترام اور وہ ہی نرمی لوٹ آئی تھی جس کا تقاضا روحانی مجلس سے بات کرتے ہوئے سب ہی سرداروں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔

”آپ ہی کی وجہ سے اور بصیرت نے آج قبیلے کو مٹنے سے بچایا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو ہم کبھی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے اور غصے اور ضد میں شاید سب لوگوں کی جان گنوا بیٹھتے لیکن.....“ سردار دوزانو ہو کر کاہن کے قدموں میں جھک گیا۔

”مجھے یہ جانے بغیر کبھی چین نہیں ملے گا کہ ایک کل کا لونڈا آپ جیسے عظیم کاہن کے علم اور روحانی طاقت سے آگے کیسے نکل گیا۔ اسے کہاں سے ملی ایسی طاقت کہ اس اکیلے نے ہمارے سینکڑوں ہزاروں جوانوں کو موت کا ذائقہ چکھا دیا۔ کہو کاہن یہ کیا راز ہے؟“ سردار جیسے زمین پر جھکتا چلا گیا اس کے دل میں شکست نے ایسی آگ لگا رکھی تھی کہ وہ اس آگ میں اندر ہی اندر جل کر بھسم ہوتا جا رہا تھا۔

”اٹھو سردار... ایسے گرجاؤ گے تو آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ دشمنوں نے تمہیں زمین سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور سلمان کی جیت کو وہ اس کی طاقت نہیں تمہاری کمزوری سمجھ رہے ہیں انہوں نے آپس میں مسکوٹ کر کے تم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہیں اپنے لوگوں کو اپنے قبیلے کو ان دشمنوں سے بچانا ہوگا۔“ کاہن کی آنکھوں میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایسے کسی منظر کو جو ابھی زمین کی چھاتی پر اترا بھی نہیں تھا اپنی آنکھوں سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے عین سامنے ہو۔

”کیا کہتے ہو کاہن اعظم... تو کیا سلمان نے اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی ہے۔ وہ ہمیں نیست نابود کر دینا چاہتا ہے۔ کیا آسمانوں کا خدا صرف سلمان کی مدد کر رہا ہے یا کوئی ایسی شیطانی طاقت ہے جو سلمان کے قابو میں آچکی ہے اور وہ اس کی مدد سے ہمارا وجود مٹانے کے درپے ہے۔“ سردار کو شکست کے وہ سارے مناظر اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

”نہیں سردار ایسا نہیں ہے“ کاہن نے جلدی سے کہا۔

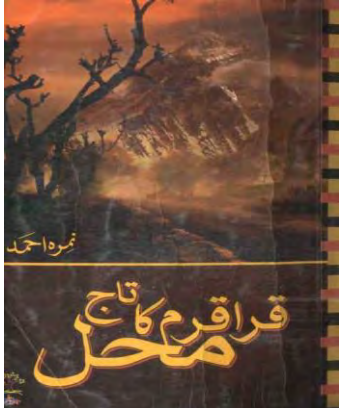
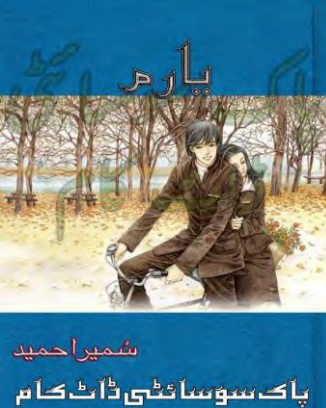
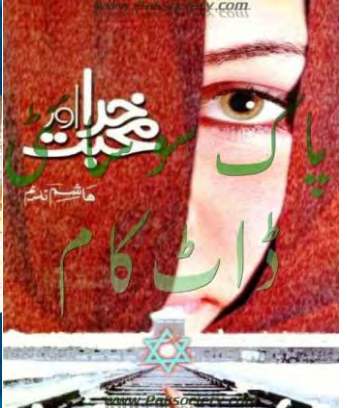
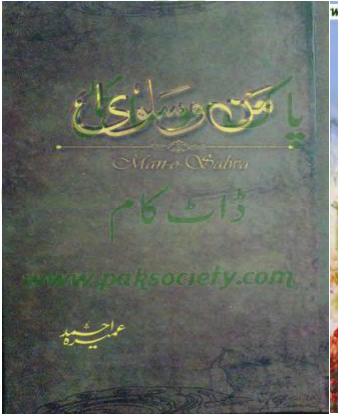
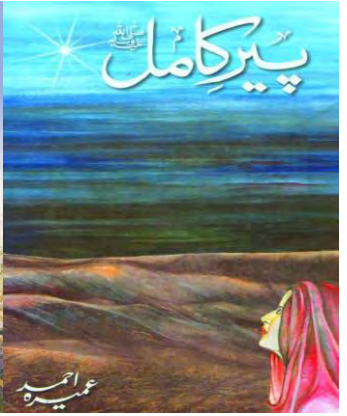
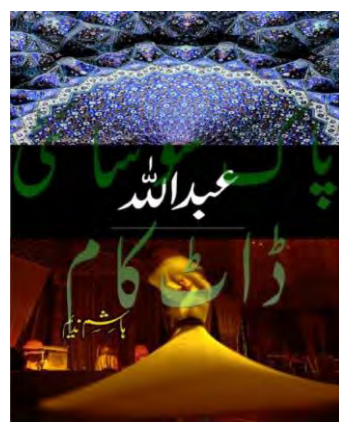
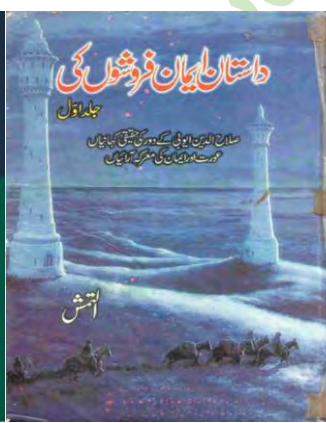
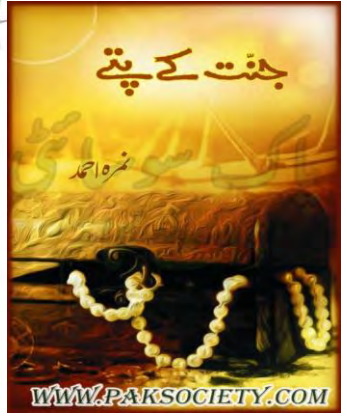
”تو پھر کیسا ہے۔ مجھے یہ بات پوری طرح پاگل بنا کے چھوڑے گی کہ ایک اتنے کم عمر جن چھو کرے نے میری ایسی غضب کی تربیت یافتہ سپاہ کو مٹی چنادی“ سردار کھڑا ہو چکا تھا اور خوف اور بے بسی اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لے چکی تھی۔

”نہیں سردار آپ غلط سمجھ رہے ہیں سلمان آپ کا اور قبیلے کا دشمن نہیں ہے۔ اسے تو بس اپنے باپ ابراہیم کو آپ کی قید سے آزاد کرانا تھا۔ اس کا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا اس لیے کسی آسمانی طاقت نے اس کی ایسی لازوال مدد کی ہے کہ ہماری عقل دنگ رہ گئی ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ سردار کاہن کی باتیں سن کے متحیر رہ گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سردار۔ سلمان کو اگر اپنے والد کو بنا کسی کو ہلاک کیے لے جانے کی اجازت دے دی جاتی تو اس نے ایک چڑیا کے بچے کو بھی نہیں مارنا تھا۔ اس کا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں تھا۔ اس پر جنگ مسلط کی گئی تھی اور اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی مجبوری تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ کو اس سے نہیں اصل خطرہ اپنے دشمنوں سے ہے جن تک آپ کی شکست کی خبر پہنچ چکی ہے اور اب وہ آپ سے اپنے ماضی کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تھکتوں کا بدلہ لیتا چاہتے ہیں۔“ کاہن نے کمال جرأت سے اپنی بات کہی حالانکہ وہ جانتا تھا اس وقت سردار کو سلمان پر غصہ ہے اور وہ اس بات پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔

”اگر ایسا تھا تو وہ ہم سے کہہ سکتا تھا۔ اس نے ہمارے سینکڑوں، ہزاروں جنگجوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو کیا یہ دشمنی نہیں تھی؟“ سردار گر جا۔

”آپ کو اس وقت میری بات سمجھ نہیں آئے گی لیکن میں اور میرا علم کہتا ہے اس وقت آپ سلمان کو بھول جائیں اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی ان دشمن طاقتوں کے بارے میں سوچیں جو آپ کی ذرا سی بھی غفلت سے قبیلے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سلمان کے بارے میں ہم بعد میں فیصلہ کریں گے کہ وہ غلط تھا یا صحیح۔“ کاہن کی بات سردار کو پسند تو نہیں آئی مگر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے دل میں سلمان کے لیے جو نفرت جمع ہو چکی تھی اسے نکالنا اب کسی کاہن کے بس کی بات نہیں تھی وہ اسی وقت شانت ہو سکتا تھا جب سلمان کو اس کی جرأت کی سزا دینے میں کامیاب ہو جائے۔ اس لیے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس وقت وہ وہاں سے چلا گیا تا کہ قبیلے اور فوج کو جو نقصان پہنچ چکا تھا اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔

راستے میں وہ یہ بھی سوچتا رہا اگر کاہن کو سلمان کے ارادوں کا پتا تھا کہ وہ جنگ کرنا نہیں چاہتا بس اپنے باپ کو آزاد کرانا چاہتا ہے تو اس نے ہمیں اس بات سے باخبر کیوں نہیں کیا۔ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے وہ اپنے غار میں پہنچا اور اس نے جنگجوؤں کے سپاہ سالار کو طلب کیا۔

☆ ☆ ☆

وقت کی اس انوکھی روش کو سمجھنے کی صلاحیت تو کسی میں نہیں تھی لیکن فارس کو یہ ضرور پتا چلا چکا تھا کہ شرجیل اپنی جان کے خوف سے دم دبا کر یہاں سے بھاگ چکا ہے اور اب اس کے لیے صنوبر تک پہنچنا اسے حاصل کرنا پہلے سے زیادہ آسان بن چکا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو اس نے بیٹے کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ کوئی انوکھی اور ناقابل یقین چیز مانگ رہا ہو۔

”تمہیں کیا لگتا ہے وہ لڑکی جو شرجیل سے محبت کرتی ہے تمہارا پر پوزل ایکسپٹ کر لے گی؟“ اتنے براہ راست سوال کی توقع فارس کو نہیں تھی اس لیے ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔

”یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ آپ کوشش کریں تو یہ ہو بھی سکتا ہے“ وہ لڑکھرائی ہوئی زبان سے بولا۔

”چلو ٹھیک ہے میں آصف کریم سے ذاتی طور پر مل کر دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھنا بیٹے آصف کریم ہمارے کسی احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اثر رسوخ سے دبایا جاسکتا ہے۔ وہ ایک آزاد اور اپنی مرضی کا مالک بزنس مین ہے۔ وہ ہماری بات سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

البتہ سرفراز کا بیٹا یہاں موجود ہوتا تو ہم اس پر اپنا اثر رسوخ ڈال کر اسے تمہارے راستے سے ہٹا سکتے تھے لیکن وہ تو خود ہی نہیں چلا گیا ہے۔“ بولتے بولتے اچانک رحمن کو کوئی خیال آیا اور وہ بولا۔ ”تم کیا جانتے ہو سرفراز کا بیٹا اس طرح کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کہاں اور کیوں چلا گیا؟“ سوال پھر غیر متوقع تھا اس لیے ایک بار پھر فارس گھبرا گیا۔

”میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ اس پر کسی نے جان لیوا حملہ کیا تھا ہو سکتا ہے۔ ان ہی لوگوں نے اسے پھر دمکی دی ہو اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کہیں چھپ گیا ہو۔“

”لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے لیکن ایک بات سمجھ لو۔ میں بعد میں یہ نہ سنوں کہ اس پر حملہ تم نے کرایا تھا۔ جو سچ ہے وہ مجھے ابھی بتا دو نہیں تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سوں گا۔“ باپ نے تیز لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو فارس اس بار پہلے سے بھی زیادہ بری طرح گھبرا گیا۔

”نہیں.... تو میں کیوں.... اس پر حملہ کراؤں گا.... آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں“ فارس کی گھبراہٹ

نے رخصت کو اور شک میں ڈال دیا

”اگر یہ تم نے نہیں کیا تو پھر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟“

”نہیں نہیں میں گھبرا تو نہیں رہا ڈیڈ یہ تو بس روٹین ہے میرا۔ آپ سے ڈر لگتا ہے اس لیے کبھی کبھی ایسا

ہو جاتا ہے“ فارس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم سچ بول رہے ہو“ بے خیالی میں رخصت کے منہ سے نکل گیا اور فارس کو

پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اس نے شاید اپنے باپ سے جھوٹ بول کر اچھا نہیں کیا۔ مگر اب تو وہ بول چکا تھا۔

اور اب اس کو اپنے جھوٹ کو نبھانا تھا۔

باپ بیٹے کی یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ فارس باپ کے کمرے سے نکل کر ٹیرس کی طرف بڑھنے لگا وہ سوچ رہا

تھا کہ کس سے اصل بات کا پتا کروں کیا سچ ہے۔ کہیں صابو نے تو کوئی دھمکی نہیں دی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

صابو نے زیادہ پیسے کے لالچ میں اسے غائب کر دیا ہو۔

اس طرح کی باتیں سوچتا ہوا وہ ٹیرس کی طرف جاتے جاتے بالکونی میں آ گیا۔ اس کے پاس سے صابو کا

نمبر کہیں مس ہو گیا تھا اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ شاہجہاں کو ہی صابو کے بارے

میں معلوم تھا اور شاہجہاں صابو سے سخت ناراض ہو چکا تھا۔ تو اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کافی دیر تک وہ ٹہل

ٹہل کر سوچتا رہا اور پھر گاڑی نکال کر بنا کسی ارادے کے سلمان کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے کے باہر پہنچ کر

اس نے سلمان کو فون کیا یہ اس کی قسمت ہی تھی کہ اس کا فون سلمان نے ریسیو کر لیا۔

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“ سلمان نے جیسے اکتاہٹ سے کہا۔

”تمہارے گھر کے باہر ہوں۔ کیا تم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ فارس کے لہجے میں اپنائیت اور تہذیبی

رچاؤ گرچہ مصنوعی تھا لیکن اس وقت وہ کام کر گیا اور کچھ ہی دیر بعد سلمان سفید ٹی شرٹ اور بلیو ٹراؤزر میں

اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اتنا اچانک کیسے؟“ سلمان نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس یونہی تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔ سوچا تمہیں کال کروں گا تو کہیں تم منع نہ

کر دو۔“ فارس کے لہجے کی عاجزی پر سلمان حیران ہونے لگا۔

”یہ شیرہ کیوں بہ رہا ہے تمہارے لہجے میں جو بات تم پوچھنے آئے ہو وہ میں تمہیں ویسے بھی بتا نہیں سکوں

گا، یا یوں کہہ لو کہ پہلے ہی بتا چکا ہوں“ سلمان نے رکھائی سے کہا۔

”لگتا ہے تم اب تک ناراض ہو۔ چلو کلب چلتے ہیں وہاں چل کر بیٹھیں گے“ فارس نے یہ کہہ کر گاڑی

اشارت کی اور وہ دونوں دس منٹ کے بعد اپنے پوس علاقے کے کلب میں داخل ہو رہے تھے۔

”تم کون سی بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے؟“ فارس نے کرسی کو سیدھا کر کے اس پر بیٹھتے ہوئے

کہا۔

”وہی کہ صنوبر والی بات۔ وہ تم سے کبھی شادی کرنے کے لیے نہیں مانے گی یہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا

ہوں“ سلمان کے لہجے میں خشکی اور روکھا پن اب بھی برقرار تھا۔

”ارے یار تم تو بہت ہی معصوم ہو اب تک اسی بات کو لے کر ناراض ہو۔ وہ تو میں کب کی بھول چکا

ہوں اور تم شاید بھول چکے ہو میں تم سے کئی بار اس بات کے لیے معافی بھی مانگ چکا ہوں۔“ فارس نے پھر

سے شیریں اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کیا لو گے؟“

”کچھ خاص نہیں کوئی بھی جوس آرڈر کر دیوں بھی میرا کچھ بھی دل نہیں چاہ رہا۔ تم اس طرح گھر کے باہر آ کے کھڑے نہ ہو جاتے تو میں بھی تمہارے ساتھ اس وقت گھر سے باہر نہ آتا“ سلمان نے ایسے کہا جیسے وہ بہت زیادہ بیزار ہو۔

”تمہاری اس مہربانی کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ رکا اور پھر بولا ”لیکن بات کیا ہے تم اتنے بیزار تو کبھی نہیں ہوتے ہمیشہ بہت چل کرتے ہو۔ زندگی کو انجوائے کرنا تو میں نے خود تم سے ہی سیکھا ہے“ فارس کی اس بات کو سن کر سلمان کو یقین نہیں آیا کہ یہ شخص اس قدر گھر کے بھی بات کر سکتا ہے جو ہمیشہ گھمنڈ اور تکبر کے نشے میں خود کو جانے کیا سمجھتا رہا ہے۔ سلمان کو یاد تھا کہ اس کے گروپ میں شامل ہونے کی اسے کتنی چاہ تھی اسی لیے اس نے اپنے گھر اس رات وہ تقریب رکھی تھی جس کا غبار اب تک بھی اس کی زندگی میں اتر رہا تھا۔

”اصل میں گھر میں شرجیل کے یوں اچانک غائب ہونے سے کافی عجیب سی فضاء بنی ہوئی ہے، سب ہی پریشان ہیں۔ صنوبر تو جیسے جینا ہی بھول گئی ہے۔ مجھے اس کا شرجیل کے لیے اس طرح بے سدھ ہونا ذرا بھی پسند نہیں ہے مگر ماما کو اس کے دکھ کا ضرورت سے زیادہ ہی احساس ہے وہ ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگی رہتی ہیں۔“

سلمان کی بات سن کر فارس کے کان کھڑے ہو گئے وہ اسی بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ صنوبر کی کیا حالت ہے اور وہ شرجیل کے یوں اچانک چلے جانے کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔

”کیا لگتا ہے تمہیں شرجیل یوں اچانک کہاں گیا ہوگا۔ اس کے قادر نے اسے سب ہی امکانی جگہوں پر تلاش کر لیا ہے مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ پتا نہیں وہ اس طرح کہاں غائب ہو گیا۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اسی وقت دولہ کے جوٹس کھینچنے آئے ہوئے تھے ان کے قریب ر کے اور پوچھنے لگے۔

”سلمان کیا ربا شرجیل کا کچھ پتا چلا“ دونوں نے باری باری ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ”نہیں ابھی تک تو نہیں۔ لیکن تم نوگ۔ یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ سلمان نے جواب تو دے دیا مگر ساتھ ہی ایک سوال بھی کر دیا۔ اسے شاید ان کا شرجیل کے بارے میں پوچھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

”برامت مانویار۔ آج کل جہاں بھی جاؤ اس کے یوں اچانک غائب ہونے کی باتیں ہو رہی ہیں تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔“ ان میں سے بیک ٹراؤزر پہنے ہوئے لڑکے نے کہا جس کا نام عباد تھا۔ اس کے بعد وہ ر کے نہیں تھے سلمان کا مؤذم بد خراب ہو چکا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ ان کے جانے کے بعد فارس نے کہا۔ سلمان نے گھورتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پوچھو؟“

”میرے پیئرس شاید آج کل میں تمہارے گھر آنے والے ہیں۔ باقاعدہ رشتا مانگنے۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔ دیکھو یا رشتا ملے نہ ملے مگر میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتا۔ ہمیں تو ہمیشہ دوست رہنا چاہیے۔ کیوں کیا کہتے ہو؟“ سلمان اس کی بات سن کر ایک دم ہی ہنس پڑا جو فارس کے لئے توقع کے قطعی خلاف تھا۔

”تم ویسے ہی ہو کافی ڈھیٹ! جانتے ہو کہ ہمارے ہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔ پھر بھی تم شرجیل کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔“

”ایسا نہیں ہے دوست۔ یہ تو ایک بہت رکی اور باقاعدہ ہونے والا معاملہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ تمہارے والدین اور صنوبر کو دونوں کو انکار اور اقرار کا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے“ فارس بہت قارل ہوتے ہوئے بولا۔ ”پہلے تو اتنے قارل نہیں تھے۔ بلکہ دھونس دھمکی

سے کام لے رہے تھے اب کیا ہوا؟“ سلمان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔
 ”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو جتنا میں صنوبر کو جانتا ہوں۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس وقت بھی نہیں جب میرے پیرئٹس راضی ہو جائیں۔“ سلمان نے سفائی سے اپنی رائے دی۔ ”ویسے بھی مجھے تو شک ہے کہ شرجیل کے غائب ہونے میں تمہارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

یاد رکھنا اگر اس بات میں ذرا سی بھی صداقت ہوئی تو صنوبر تمہیں کبھی معاف نہیں کرنے والی۔“ سلمان نے ایسے کہا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

”میں قسم کھاتا ہوں۔ بخدا اس معاملے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ تم کہو تو میں قرآن اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے شرجیل کو غائب نہیں کیا۔ بلکہ میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ یہ سب کیوں اور کب ہو۔“

دونوں اسی طرح کی باتیں کچھ دیر تک کرتے رہے پھر جیسے فارس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ صنوبر اب بھی شرجیل کا عم منار ہی ہے اور اس کے ماں باپ کو اس کے گھر سے سوائے انکار کے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات اس نے اپنے باپ کو بھی بتا دی کہ وہ اس طرح سے بات کریں جیسے وہ یہ بات کرنے نہیں بلکہ یوں آپسی تعلقات کو بڑھاوا دینے کی خاطر آئے ہیں۔ رحمن نے ایسا ہی کیا۔ اور گفتگو کے آخری سرے پر پہنچ کر صنوبر کے رشتے کی بات کی۔

جس کا جواب آصف نے یہ کہہ کر دیا کہ ہم اپنی بیٹی پر کسی بھی قسم کی زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے اور ہم جانتے ہیں وہ کیا چاہتی ہے اس لیے یہ بات آپ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔“

”میں مانتا ہوں۔ بلکہ تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ پھر بھی آصف اگر آپ میرے اطمینان کی خاطر ایک بار میری موجودگی میں صنوبر بیٹی سے پوچھ لیں گے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ میں آپ کے گھر سے کبھی یہ خوشی حاصل کرنے کے بارے میں سوچوں تک نہیں۔“

آصف نے فارس کے باپ کی یہ بات سننے کے بعد درشہوار کی طرف ایسے دیکھا کہ کیا کہتی ہو؟ درشہوار نے کہا۔

”ویسے تو مجھے اپنی بیٹی کا جواب معلوم ہے پھر بھی آپ کے اطمینان کے لیے میں ایک بار اور اس سے پوچھ لیتی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اسے مزید تکلیف پہنچانے کا باعث بن رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر درشہوار چلی گئی اور کچھ دیر کے جاں گسل انتظار کے بعد جب وہ واپس آئی تو آصف نے اس کے بات کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

”مجھے معلوم ہے کیا کہا ہوگا میری بیٹی نے۔“

”نہیں..... آصف ہم ٹھیک نہیں سوچ رہے.... صنوبر اس رشتے پر راضی ہے!!!“

ایک دھماکہ تھا جو اس وقت اس کمرے میں اس طرح ہوا کہ سماعتوں کا توازن درہم برہم ہو گیا۔ کسی کو بھی درشہوار کی بات کا یقین نہیں آیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے درشہوار نے جو مذاق کیا ہے وہ اس پر کچھ دیر بعد سنجیدگی سے کہے گی کہ یہ تو بس ایک جوک تھا ورنہ ہم سب جانتے ہیں صنوبر کیا چاہتی ہے۔ اس کا جواب کیا ہوگا۔

مگر کئی بار پوچھنے پر بھی درشہوار نے اپنا بیان نہیں بدلا اور وہ اس بات پر قائم رہی کہ ان کی بیٹی صنوبر رحمن کے بیٹے فارس سے شادی کرنے پر تیار ہے.... حیرت کا پورا سمندر تھا جس میں ہلچل مچی اور سب کے چہروں ہر ناقابل یقین تاثر نے ڈیرا سا جمالیا۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے
 سطر سطر ہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ اکتوبر میں پڑھیے)

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”تختی کہانیاں“ کے اوّلین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”تختی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو جہاں ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعا کے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا کے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپرد ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”تختی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تحخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے مستحق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو مختصر فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”تختی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

ہمارے سر پر قرضہ بہت زیادہ ہے۔ جو ایک بار کسی سے پیسے لیں تو دوبارہ ادا نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔ دوسرا مسئلہ بہت شدید ہے باباجی! جب بھی دسمبر کا ماہ آتا ہے ہم پہ بہت بھاری گزرتا ہے ہمارے پورے گھر پہ۔ ہمارا اپنا کوئی خاص یا تو وقتا پاجاتا ہے یا بہت دور چلا جاتا ہے۔ ایسا اس ماہ میں ہمارے ساتھ ہر سال ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ ہمیں کرائے کا مکان میں رہتے ہوئے 10 سال ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا گھر نہیں ہے۔ اور تاہی ہم دو بہنوں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ پلیز باباجی! ہمیں کوئی اچھا سا اور جلالی وظیفہ بتادیں۔ جس سے ہمارے یہ سارے مسئلے حل ہو جائیں۔ پلیز باباجی! ہمارے یہ سارے مسئلے حل کر دیں۔ ہم آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔ باباجی! ہم پانچ وقت نماز بھی پڑھتے ہیں۔ فجر کے بعد یسین کی سورۃ بھی پڑھتے ہیں۔ اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ بھی پڑھتے ہیں۔ ہم نے یہ ایک ماہ پورا وظیفہ بھی کیا ہے اور اب بھی پڑھتے ہیں۔ پلیز باباجی! ہماری مدد کرنا۔ باباجی! ہماری چھوٹی بہن جس کی عمر 17 سال ہے۔ اُسے مرگی کی بیماری ہے۔ جس کا ہم نے بہت علاج کر دیا ہے۔ کہیں سے بھی آرام نہیں آیا۔ وہ ایک گولی کھاتی ہے۔ اگر کھاتی رہے تو ٹھیک رہتی ہے اگر نہ کھائے تو بیمار ہو جاتی ہے۔ اور رات کو سوتے ہوئے اُس کی

بچو! اللہ تم سب کو صحت کے ساتھ ذمیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ جب یہ سطور آپ پڑھ رہے ہوں گے تو ماہ ذوالحجہ شروع ہو چکا ہوگا۔ یہ اسلامی مہینہ ہمیں قربانی کا درس دیتا ہے۔ جب زندگی کے ہر معاملے میں قربانی کا شعار اپنایا جاتا ہے تو زندگی بھی سہل ہو جاتی ہے اور آخرت کے لیے توشہ تیار ہو جاتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو نصیحت کروں گا کہ خود نمائی سے بچنے کی کوشش کریں اور نیکی صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کریں۔ دنیاوی معاملات دنیا میں ہی رہ جائیں گے۔ عبادت بھی اس وقت قبول ہوتی ہے جب نیت خالص ہو ورنہ زمین پر سر مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا..... ہر خوشی کے موقع پر اُن لوگوں کو ضرور یاد رکھیں خوشیاں جن کی دسترس سے باہر ہیں۔ چلتے پھریا قہار کا ورد ضرور کریں۔ سورۃ رحمن کی تلاوت کو اپنی عادت بنا لیں۔ سادہ پہنیں سادہ کھائیں۔ کیونکہ اس بدن کو بالآخر کیزے مکوڑوں کی خوراک ہی بنتا ہے۔

□ افضالہ۔ منڈی وار برٹن

○ پیارے باباجی! میں آپ کو پہلے بھی دو بار خط لکھ چکی ہوں۔ آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا اس سے کچھ حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے اور بھی کچھ مسئلے ہیں پلیز باباجی ان کے لیے ہماری مدد کیجیے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے باباجی!

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کراشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

حالت خراب ہوتی ہے۔ باباجی! ہمیں اس کے لیے دوا چاہیے۔

☆: بی افصال! مسئلے اللہ کے کرم سے حل ہوتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا انسان تو وسیلہ ہے۔ تم کچھ عرصے کے لیے سورۃ یسین پڑھنا ترک کر دو اور صرف درود شریف پڑھو۔ بعد فجر تین تسبیح اور بعد عصر تین تسبیح۔ انشاء اللہ ایک ایک کر کے سارے مسئلے حل ہوں گے۔ مرگی کی دوا میں تیار نہیں کرتا۔ اس کے لیے تمہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا ہوگا۔

□ ریحانہ درانی۔ میانوالی

○ باباجی میں بہت پریشان ہوں۔ میری ایک جاننے والی خاتون نے آپ کے بارے میں بتایا اور میں اس امید پر خط لکھ رہی ہوں کہ آپ اللہ کے نیک بندے میری پریشانی کا کچھ حل ضرور نکالیں گے۔ باباجی میں شادی شدہ عورت ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ شوہر اچھا کھاتے ہیں بظاہر کوئی پریشانی نہیں بس ذرا غصے کے تیز ہیں اور غصے میں بہت گالم گلوچ کرتے ہیں۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔ مجھے اُن کی یہ عادت بہت بری لگتی ہے بہت بار سمجھانے کی کوشش کی کبھی نرمی سے کبھی ناراض ہو کر مگر اُن کو سمجھ نہیں آتی۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے مجھے اپنے شوہر سے بہت نفرت سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اُن کا گھر میں موجود رہنا یا مجھ سے بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں کہ رشتے میں بھی رہوں اور وہ نظر بھی نہ آئیں۔ باباجی شاید آپ کو میرا مسئلہ اتنا سنگین نہ لگے مگر یقین کیجیے میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ رہتی ہوں جس سے مجھے اُکھن ہوتی ہے اور اس لیے میں بہت چڑچڑی اور بدتمیز ہو گئی ہوں۔ بہت بدزبانی کرتی ہوں جس کا اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔ اللہ کے واسطے مجھے اس مشکل سے نکال دیجیے۔ مجھے تعویذ دیجیے گا بچے چھوٹے ہیں وظیفہ کرنا ممکن نہیں۔

☆ بیٹی ریحانہ! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت

پڑھو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے بہت سنبھل کر خط لکھا ہے اور مار پیٹ کا تذکرہ قصداً نہیں کیا۔ تمہاری کیفیت میں بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ کسی انسان کو بھی بے عزت کرنے والے روئے اچھے نہیں لگتے، میں یہ بات اس بڑھاپے میں تجھی سمجھ نہیں پایا کہ لوگ بیویوں کو محبت اور حسن سلوک کے ساتھ کیوں نہیں سمجھاتے۔ ہاتھ اٹھانے یا برے الفاظ استعمال کرنے سے کیا سکون ملتا ہے۔ بیٹی اصل میں تمہارے شوہر نے اپنے گھر میں یہی سب دیکھا ہے۔ یہ وہ بچپن کا غصہ اور بے بسی ہے جو اب نکل رہی ہے۔ اپنے باپ کو ماں سے ساتھ ایسا رویہ رکھتے دیکھا ہوگا۔ مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم زبان درازی مت کیا کرو۔ کیونکہ نہ چاہتے ہوئے تم بھی اُن جیسی بن جاؤ گی اور پھر بچے بھی برابر وہی ہی اختیار کریں گے۔ لہذا برائی کو روکنا چاہتی ہو تو اپنی زبان کو روک لو۔ شوہر جب غصے میں ہوں تو سامنے مت آیا کرو۔ بکثرت لاجول ولاقوۃ پڑھا کرو۔ میں تعویذ ضرور تیار کر دوں گا اُس کے لیے تم جو ابی لفافے کے ساتھ خط لکھو۔ بیٹی صبر کرو ساری توجہ بچوں کی تربیت پر مرکوز رکھو۔ انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔

□ شازیہ زمان۔ لاہور

○ باباجی میں آپ سے اکثر اپنے گھر کے مسائل شیئر کرتی ہوں اور آپ کی وجہ سے بہت سے مسئلے حل بھی ہو گئے ہیں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اس مسئلے کا بھی حل بتائیں۔ یہ بات میں کسی اور کو نہیں بتا سکتی۔ آپ ناراض مت ہوئے گا۔ باباجی مجھے اپنے کزن سے بہت محبت ہے۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ میں نے یہ بات آپ کو پہلے تجھی بتائی تھی مگر پوری طرح نہیں بتائی تھی۔ میرے گھر والے اور اس کے گھر والے ہمیں کبھی بھی ایک نہیں ہونے دیں گے۔ وجہ کوئی دشمنی نہیں بلکہ میری سگی بڑی بہن ہے۔ میرا یہ کزن میرا بہنوئی بھی ہے ڈیڑھ سال پہلے میری بہن سے

سے گزارش ہے کہ میری بہن سچی کہانیاں کے دفتر آکر آپ کے لیے لفاظہ دین کی قبول کیجیے گا اور بابا صاحب وہ ایک ماہ پاکستان میں ہی ہیں۔ ان کے ہمراہ میری چھوٹی بیٹی اور بیٹے کے لیے بھی تعویذ ارسال کر دیجیے گا۔ یہ میں آپ کو بھجوادوں گی۔ بیٹے کی جاب کا مسئلہ ہے اور بیٹی کی شادی اچھے گھر میں ہو اس کے لیے تعویذ درکار ہے۔ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی سلمی! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کرم فرمایا بس اس کی راہ میں حسب استطاعت رقم نکالتی رہا کرو۔ تعویذ میں تیار کروں گا بڑی بچی کا تعویذ اب تلف کر دو اس کے لیے بھی دوسرا تیار کروں گا۔ بیٹی میں بوڑھا آدمی کہاں ٹیکوں کے چکر لگاؤں گا اسی لیے اکاؤنٹ ہی نہیں تم ویسٹرن یونین کے ذریعے ٹیکوں کا حصہ ڈال سکتی ہو۔ خوش رہو۔

□ بانو۔ کراچی

○ بابا جی! میں ایک بیوہ عورت ہوں شادی کے صرف چار سال بعد بیوہ ہوئی۔ میرے دو بچے ہیں۔ شوہر کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے چاہتے ہیں کہ میں اپنے دیور سے شادی کر لوں وہ لوگ بچوں سے دور ہونا نہیں چاہتے۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ اپنے والدین پر بوجھ بنوں۔ مگر بابا جی میں اپنے دیور سے شادی نہیں کرنا چاہتی وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی ہے پھر اس کے ساتھ کیوں زیادتی ہو کہ وہ ایک بیوہ اور دو بچوں کی ذمہ داری اٹھائے۔ میں ایسے ہی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنے ساس سسر کی خدمت کر کے، بچوں کی پرورش کر کے میں کسی جذباتی فیصلے کی وجہ سے پچھتانا نہیں چاہتی اور بابا جی سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی جگہ کسی اور کو دے بھی نہیں سکتی۔ لہذا دھوکے والی زندگی میرے لیے گزارنا بہت مشکل ہے۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی بانو! اللہ تمہیں صبر اور ہمت عطا فرمائے۔ بیٹی تمہارے سسرال والوں کی سوچ بھی بالکل درست ہے۔ جوان بیوہ بہو کو گھر میں رکھنے

نکاح ہوا تھا تب وہ مجھے اتنا پسند نہیں تھا مگر جب گھر میں آنا جانا شروع ہوا تب وہ مجھے بہت اچھا لگنے لگا۔ اس عید کے بعد میری بہن کی رخصتی ہے یہ سوچ سوچ کر میرا برا حال ہے۔ بابا جی کچھ ایسا کر دیں کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور میری شادی اس سے الگ ہو جائے۔ آپ کچھ بھی کریں جتنا خرچا ہوگا میں کروں گی مگر میرا کام کر دیں میں وظیفہ نہیں کر سکتی۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ اگر تمہاری بہن کو وہ شخص طلاق دے دے تو کیا تمہارے والدین اسی گھر میں دوسری بیٹی دیں گے؟ بالکل نہیں! ساری رشتہ داری بھی ختم ہو جائے گی۔ تمہارے پاس بہت پیسے ہیں تو بیٹی اللہ کے نام پر صدقہ خیرات کر دیا کرو تاکہ یہ جو شیطان تم پر حاوی ہے اس سے چھٹکارا مل سکے۔ ایک بات اور بتا دوں وہ شخص صرف تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ جلد ہی تمہاری بہن کو رخصت کر والے گا اور اس کے بعد بھی تمہیں اسی طرح بے وقوف بنائے گا۔ تمہاری نجات صرف اسی میں ہے کہ اللہ سے توبہ کرو اور عہد کر لو کہ آئندہ اس شخص سے تنہائی میں نہیں ملو گی میں تمہیں تعویذ ضرور دوں گا مگر جب تم یہ وعدہ کرو گی۔ کہ غلط راستے پر اب نہیں چلو گی۔ بیٹی یاد رکھو دھوکا دینے والا شخص کسی اور کو نہیں دراصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے اور یہ بات وقت ثابت کر دیتا ہے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

□ سلمیٰ احمد۔ یو کے

○ بابا صاحب! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ تین ماہ قبل آپ سے بیٹی کی شادی کے لیے تعویذ منگوا یا تھا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بچی کی بات طے ہو گئی جہاں ہم لوگ بیچا رہے تھے۔ عید کے بعد اس کی شادی ہے۔ لڑکا کچھ پیچم میں رہتا ہے اور بہت اچھا گھرانہ ہے۔ بابا صاحب میں کس طرح آپ کا شکر یہ ادا کروں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق صدقہ نکال دیا تھا آپ

ہو۔ وہ سبب الاسباب ہے۔ رزق کا وعدہ اس کا ہے لہذا پریشان مت ہو۔ کوشش ضرور کرتے رہو مگر یقین کے ساتھ اور بیٹے یہ بات بہت بری ہے۔ اللہ نے تمہیں پیدا کیا جو ان کیا مکمل اعضاء عطا کیے صحیح دماغ دیا ہے اگر زندگی کے چند سال تکلیف وہ ہو گئے۔ تو تم اللہ کے ساتھ خیانت کرنے کا سوچ رہے ہو۔ یہ بہت بری بات ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اُس کی قدر کرو حفاظت کرو خوشی میں شکر ادا کرو دکھ میں صبر کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ بکثرت درود شریف پڑھو راستے خود بخود دھلتے چلے جائیں گے انشاء اللہ۔

□ علیہ۔ سیالکوٹ

○ بیٹی علیہ! تمہارا مسئلہ یقیناً بہت تکلیف دہ ہے مگر اس کا حل بہت آسان ہے۔ تمہیں یہ وہم رہتا ہے کہ تمہاری تصویریں بے لباس آئیں گی اس لیے تم تقریبات میں جاتے ہوئے گھبراتی ہو تو بیٹی تم شرعی پردہ شروع کر دو۔ مکمل حجاب لیا کرو پھر کسی بھی تقریب میں کوئی بھی تصویر کھینچنے کا تو تمہیں پریشانی نہیں ہوگی۔ شروع میں لوگ اعتراض کریں گے کیونکہ لوگ اچھائی سے گھبراتے ہی۔ مگر تم مستقل مزاجی سے پردہ جاری رکھتا جب گھر سے کہیں جانے کے لیے نکلو 7 بار پڑھ لیا کرو نصر من اللہ وفتح قریب تم خود اپنے میں مثبت تبدیلی محسوس کرو گی۔ مجھے صورت حال سے ضرور آگاہ کرنا۔

□ سعادت علی۔ وزیر آباد

○ باباجی میں یہ خط اپنی والدہ کے کہنے پر لکھ رہا ہوں۔ 2013ء میں میری شادی والدین کی رضا مندی سے سگی خالہ کے گھر ہوئی۔ میں پڑھا لکھا اچھی نوکری پر فائز ہوں۔ اور میری بیوی واجبی سی تعلیم حاصل کر کے گھر داری میں مشغول ہو گئی۔ باباجی میں پڑھائی اور پھر نوکری کی وجہ سے اپنے رشتے داروں سے ذرا دور ہی رہا۔ میری والدہ کو لڑکی پسندھی میں نے شادی کے لیے حامی بھری۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میری بیوی میری ماں اور اپنی سگی خالہ کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرتی۔ میں اپنی والدہ سے بے انتہا

سے مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔ نکاح کروینے سے تمہارا اس گھر میں رہنے کا شرعی جواز بن جائے گا۔ وگرنہ تمہارے سر بھی تمہارے لیے نامحرم ہیں۔ تمہاری سوچ بھی اپنی جگہ درست ہے مگر بیٹی معاشرتی اقدار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے دیور کی اگر کہیں اور شادی کر دی جائے تو وہ لڑکی تمہیں اور بچوں کو برداشت نہ کرے پھر کیا ہوگا؟ تم سمجھدار لڑکی ہو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ساس سر کی بات مان لو اور معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور حسب قدر ممکن ہو پڑھا کرو سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ ریاض خان۔ پشاور

○ باباجی میرے دوست نے آپ سے رابطہ کرنے کو کہا میں کراچی بھی آیا لیکن پتہ چلا آپ ملتے نہیں ہیں اسی لیے یہ خط لکھی کہانیاں کے دفتر میں دے کر جا رہا ہوں۔ میرا مسئلہ نوکری کا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل میں اور میرا بڑا بھائی سعود یہ میں تھے۔ بڑا بھائی عرصہ 12 سال سے اور میں 8 سال سے وہاں نوکری کر رہے تھے۔ اچانک ہماری نوکریاں بھی ختم ہو گئیں اور تنخواہ بھی پھنس گئی۔ میں تو پاکستان آ گیا کیونکہ شادی تھی مگر بھائی ابھی ادھر ہی ہے۔ نہ کام ہے نہ تنخواہ دیتے ہیں نہ واپسی کا کوئی سبب بن رہا ہے۔ بہت پریشانی ہے۔ بھائی کے بیوی نئے گاؤں میں ہیں۔ میں کراچی میں کام کی تلاش میں جھٹک رہا ہوں۔ بوڑھے والدین، چھوٹے بہن بھائی اور میری بیوی سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ سوچ سوچ کر سر پھٹتا رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اپنے ساتھ کچھ غلط نہ کر لوں۔ میری مدد کریں کچھ ایسا پڑھنے کو دیں کہ یہ مسائل ہو جائیں۔

☆ بیٹی ریاض! یقیناً حالات بہت مشکل میں مگر ناممکن نہیں۔ مشکل وقت سدا نہیں رہتا جیسے اچھا وقت بھی ہمیشہ نہیں رہتا زندگی نام ہی نشیب و فراز کا ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ مایوس بالکل مت

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کمائیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا

قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

وچکی ہے۔ یہ اچھی بچیوں کو نشانی ہوتی ہے۔ تم اپنی نند کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو طریقہ تم جانتی ہو۔ رشتہ آنے پر پہلے مجھے مطلع کرنا میں استخارہ کروں گا ایک بات کا اور خیال رکھتا کہ تعویذ کے بارے میں کسی کو پتہ مت چلنے دینا۔ جو کام بھی رازداری اور احتیاط سے ہوتا ہے وہ پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ تعویذ کے ہمراہ ورد بھی دوں گا جو بچی بھی کرے گی اور والدہ بھی انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔

□ آمنہ سلیم۔ جہانیاں

○ باباجی میں بہت پریشان عورت ہوں میرے چار بچے ہیں۔ جو ذہنی طور پر مفلوج ہیں۔ بڑے دنوں ذرا بہتر ہیں مگر چھوٹی بیٹیاں بالکل معذور ہیں۔ ان کے سارے کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔ شوہر ان بچوں کی حالت کا الزام مجھے دے کر گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وہ پنڈی میں رہتے ہیں اور شادی بھی کر لی ہے۔ باباجی میرے لیے اس وقت سب سے اہم چیز بچوں کی کفالت ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نازل بچوں کو پالنا ہی کتنا مشکل ہے پھر یہ تو ذہنی اور جسمانی معذور بھی ہیں۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ اپنے شوہر کی ضرورت تھی جب انہوں نے ہی اپنی اولاد کو چھوڑ دیا تو کسی اور سے کیا گلہ کروں۔ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات سے کیسے نمٹوں۔

○ بیٹی آمنہ! اللہ تمہیں ہمت اور طاقت دے یقیناً بہت مشکل وقت ہے تمہارے شوہر کے بارے میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ وہ اس وقت سے ڈرے جب اُس کے اللہ کو جواب دینا ہوگا۔ بیٹی تم معلوم کرو تمہارے علاقے میں ذہنی معذور بچوں کا ادارہ ضرور ہوگا۔ وہاں کی انتظامیہ سے ملو اور بچوں کو داخلہ دلوانے کی کوشش کرو۔ اس طرح اُن کی نگہداشت بھی بہتر انداز میں ہوگی اور تم بھی مطمئن رہو گی۔ مناسب ہوگا کہ ایسے کسی ادارے میں تم خود بھی نوکری کی کوشش کرو۔ اس طرح تمہیں بہت سہولت ہو جائے گی۔ بیٹی بہت مختصر سا ورد تمہیں دے رہا ہوں۔ کیونکہ جانتا ہوں کہ تمہارے لیے تو فرض

محبت کرتا ہوں۔ طبیعتاً صلح پسند ہوں لیکن اُس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی والدہ کے لیے اپنی سیدھی باتیں برداشت کرتا رہوں۔ پچھلے سال میں نے بیوی کو اس کے گھر بھجوا دیا کیونکہ وہ میری بات سمجھنے کو تیار نہیں باباجی میں اس لڑاکا عورت کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا ابھی تو اولاد بھی نہیں ہے بعد میں شاید فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے۔ دراصل اب وہ عورت میرے دل سے مکمل طور پر اتر گئی ہے۔ میں سمجھوتہ کو کر سکتا ہوں مگر خوشی سے اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ والدہ تو یہ بات بار بار بتا چکا ہوں اب وہ کہتی ہیں کہ باباجی سے مشورہ لے لو باباجی وہ ایک جاہل اور مغرور عورت ہے میرا گزارہ ناممکن ہے۔ آپ سے بالکل سچ بات کر رہا ہوں بتائیں کیا فیصلہ کروں؟

○ بیٹی سعادت! تمہارا تفصیلی خط پڑھا حالات کا اندازہ ہوا۔ موجودہ صورت حال میں یہی مشورہ دوں گا کہ بڑوں کو بٹھا کر فیصلہ کر لو کیونکہ جو عورت گھر بسانا چاہتی ہے وہ معمولی باتوں پر بڑائی جھگڑے نہیں کرتی پھر ماں سے حسد رکھنا تو بہت ہی افسوس ناک فعل ہے۔ تم سمجھدار ہو اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہے ہو گے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ بچی کا سامان اور زیور اس کے گھر بھجوادو۔

□ سمیرا ارشد۔ چوکی

○ باباجان 4 سال قبل آپ سے شادی کے لیے تعویذ لیا تھا جہاں جاہتی تھی وہاں شادی ہو گئی۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو مطلع نہیں کر سکی۔ اللہ کا احسان ہے بہت خوش ہوں باباجان یہ خط میں اپنی نند کے لیے لکھ رہی ہوں وہ بیوہ ہیں اور دو بیٹے ہیں۔ عمر بہت کم ہے۔ ہم سب گھر والے چاہتے ہیں کہ ان کی دوبارہ شادی ہو جائے۔ میرے ساس سر چاہتے ہیں کہ اچھے اور شریف لوگ ملیں کیونکہ وہ پہلے ہی بہت بڑے دکھ سے گزری ہیں اور باباجان یہ خط میں اپنی ساس کی اجازت سے لکھ رہی ہوں۔ اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔

ہذا: بیٹی سمیرا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ مجھے اچھا لگا کہ تمہیں اپنے سسرال کے مسائل میں

نمازیں بھی ادا کرنا مشکل ہوتا ہوگا۔ بس چلتے پھرتے اللہ اکبر کا ورد کیا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا بھی اہتمام کروں گا اللہ تمہیں اس آزمائش میں سرخرو فرمائے۔

□ توصیف احمد۔ انک

○ باباجی کئی سالوں سے گھر والوں سے دور روزگار کے سلسلے میں رہ رہا ہوں۔ بوڑھے والدین بچے سب سے دور ہوں مہمانوں کی طرح گھر جاتا ہوں۔ سفر کی تھکن ہی نہیں اترتی کہ واپس آنا پڑتا ہے۔ باباجی میں چاہتا ہوں کہ اپنوں کے درمیان رہوں والدین کی خدمت کروں، بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتا دیکھوں۔ مگر لاکھ کوشش کے بعد بھی گھر کے قریب نوکری نہیں ملتی ہر بار نونے دل کے ساتھ واپس لوٹ جاتا ہوں۔ باباجی آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ مجھے ایسا تعویذ عطا کیجیے جس کی برکت سے میں اپنے وطن میں ہی نوکری کر سکوں۔ وظیفہ نہیں کر سکوں گا نوکری بہت سخت ہے۔

☆ بیٹے توصیف! تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں پردیس میں رہنا کتنا مشکل ہے یہ وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس نے پردیس میں زندگی گزاری ہو۔ تم مجھے اپنا مکمل پتا ارسال کرو تا کہ تعویذ تیار کر کے تمہیں ارسال کیا جاسکے۔ مختصر سی دعا بھی دوں گا جو تم بھی پڑھنا اور اپنی بیگم سے کہنا وہ بھی پڑھے۔ اللہ ضرور اسباب پیدا کرے گا۔

□ چوہدری نزاکت، مانچسٹر (انگلینڈ)

○ جناب باباجی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے اپنے جس کام کے لیے آپ سے براہ راست وظیفہ منگوایا تھا، وہ دوسری بار وظیفہ پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے حسب مرضی ہو گیا ہے۔ آپ کا شکر یہ باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو نیک صلہ دے (آمین) میرا ایک مسئلہ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ میرا ایک کام انکا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے آپ سے تعویذ درکار ہے۔ جواب رسالے میں دے دیں۔ شکر یہ۔

☆ بیٹے نزاکت! رب کریم نے تم پر کرم فرمایا، اس کا شکر یہ ادا کرتے رہنا اور نماز میں بھی غفلت نہ برتنا۔ تعویذ کے لیے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔ مسئلے کیلئے صرف پندرہ دنوں کا وظیفہ دے رہا ہوں۔ بارہ روز تک روزانہ بارہ سو مرتبہ پڑھو اول و آخر سات سات مرتبہ درود شریف۔ انشاء اللہ تعالیٰ کرم ہوگا۔ یا بدیع العجایب یا خیر یا بدیع

□: رفیعہ بی بی، مظفر گڑھ

○ جناب باباجی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! میں نے آپ سے اپنی بچیوں کے رشتے کے لیے جو تعویذ منگوایا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری دو بچیوں کے رشتے ہو گئے ہیں۔ اب ایک باقی ہے۔ اللہ پاک نے چاہا تو اس کا بھی جلدی ہو جائے گا۔ پروردگار آپ کو کبھی حیاتی دے تا کہ آپ ہم سب جیسے لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔ آپ کا بہت شکر یہ باباجی۔

☆ بیٹی رفیعہ! جو کچھ بھی ہوتا ہے غفور الرحیم ہی کی رضا سے ہوتا ہے، اس کا شکر یہ ادا کرتی رہنا اور نماز کی پابندی جاری رکھنا۔ بیٹیوں کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔ ہمیشہ سکھی رہیں گی۔

□: شمیم بانو، حیدرآباد

○ بیٹی شمیم! رب رحیم تمہارے مسائل حل فرمائے، آمین۔ بیٹی تم نے تو بہت سے مسائل لکھ دیے ہیں جب کہ صرف دو مسئلے لکھنا چاہیے تھا۔ جو حالات تم نے لکھے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے گھرانے میں نہ نماز روزے کی پابندی کی جاتی ہے، نہ عبادت الہی۔ بیٹی! سب سے پہلے تو سب لوگ پابندی سے نماز ادا کریں۔ رزق روزی کی کشادگی اور برکت کے لیے وظیفہ دے رہا ہوں۔ ساز کی پابندی کے ساتھ ساتھ جھوٹ، حسد اور غیبت سے پرہیز ضروری ہے۔ نماز فجر کے بعد سورۃ رحمن کی تلاوت کرو اور نماز عشاء کے بعد گیارہ تسبیح یا معزز اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف، مدت ایک ماہ ہے۔ پھر مجھے مطلع کرنا۔

شوہر کے ساتھ امریکا چلی جاؤں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔ مجھے اور میرے شوہر کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆: بیٹی ہمینہ! باری تعالیٰ تمہیں شاد و آباد رکھے۔ (آمین) کوئی کام خالق و مالک کائنات کی رضا کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہمیشہ اس کا شکر ادا کرتی رہنا اور نماز سے کبھی غفلت نہ برتنا۔ اپنے شوہر کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔

□: یاسمین۔ گجرات

☆: بیٹی یاسمین! جو خط مجھ تک پہنچ جاتا ہے اس کا جواب ضرور دیتا ہوں۔ البتہ باری کی وجہ سے دیر ہو سکتی ہے کیونکہ جواب باری آنے پر دیتا ہوں۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے تو باری تعالیٰ تمہاری جائز خواہش پوری فرمائے۔ آمین۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□: قاری محمد انور۔ چیچہ وطنی

☆: بیٹے محمد انور! باری تعالیٰ تمہیں ہر مرض سے محفوظ رکھے۔ (آمین) بیٹے! سورۃ فاتحہ اپنے اندر شفا کی بڑی تاثیر رکھتی ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے نماز کے پابند ہیں۔ نماز فجر کے بعد اگر یہ سورۃ اس کے حروف کی تعداد کے برابر یعنی 125 مرتبہ پڑھی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہتری ہوگی۔ گھر میں جسے بھی تکلیف ہو، وہ بھی یہی عمل کرے۔ مدت کا کوئی تعین نہیں۔ جب تک افاقہ نہ ہو، یہ عمل جاری رکھنا چاہیے۔

□: محمد عالم۔ لاہور

☆: محترم باباجی! السلام علیکم! مجھے اکثر گلے کی تکلیف رہتی تھی۔ میں علاج کروا کروا کے تھک گیا تھا۔ وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا تھا مگر مکمل طور پر شفا نہیں ہوتی تھی۔ کسی کے مشورہ دینے پر میں نے آپ کی دوا آزمائی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے گلوں کی تکلیف بالکل ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت خلق کا نیک

□: شاہ محمد۔ جام پور

☆: جناب باباجی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے آپ سے اپنے مقدمے کے لیے جو وظیفہ منگوا یا تھا۔ سے مکمل کیا مگر تاریخیں بڑھتی رہیں اور فیصلہ نہ ہوا تو میں نے یہی وظیفہ دوبارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا جس کے لیے آپ کا شکریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو نیک اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بیٹے شاہ محمد! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک عاجز و عاصی بندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر کرم فرمایا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو اور کرتے رہنا اور نماز ہمیشہ پابندی سے پڑھنا۔

□: نذیراں بی۔ کراچی

☆: محترم باباجی! السلام علیکم! مجھے کافی عرصے سے داد کی مکر وہ بیماری تھی۔ میں نے اس کا بہت علاج کروایا مگر وہ کسی دوا سے ٹھیک نہ ہوئی تو کسی نے آپ کی دوا کے بارے میں بتایا۔ میں نے آپ کی دوا منگوائی تو اس کے استعمال سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ دوسری بار دوا کے استعمال سے بفضل خدا مجھے اس مکر وہ بیماری سے نجات مل گئی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو خلق خدا کی خدمت کا نیک اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بیٹی نذیراں! شفا دینے والی ذات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے بس اسی کا ہمیشہ شکر ادا کرتی رہو اور نماز میں کبھی غفلت نہ برتنا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر بیماری سے محفوظ رہوگی۔

□: ہمینہ گل۔ پشاور

☆: اچھے باباجی! السلام علیکم آج میں کوئی مسئلہ لے کر نہیں بلکہ ایک خوشخبری سنانے حاضر ہوئی ہوں۔ میں نے جس کام کے لیے آپ سے براہ راست تعویذ منگوا یا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ غیر برادری میں شادی نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ کے کلام کی برکت سے میرے والدین راضی ہو گئے اور میری شادی اسی سے ہو گئی جسے میں دل سے چاہتی تھی۔ اب جلد ہی میں اپنے

اجراور لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔
 رحیم و کریم کی ہے جو مالک کائنات ہے۔ اس کا شکر ادا کرو اور ہمیشہ کرتے رہنا۔ نماز میں کبھی غفلت نہ برتنا اور ہاں، والد کی صحت یا بی پر حسب توفیق صدقہ و خیرات بھی دے دینا۔

□ محمد تعلق۔ کوہاٹ

○ بیٹے تعلق! باری تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ آمین۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لو کہ رب کریم کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہم عاجز بندے اللہ تعالیٰ سے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں جو درخواست ہوتی ہے۔ وہ کب منظور ہوتی ہے یا کیوں منظور نہیں ہوئی، یہ صرف مالک کائنات ہی جانتا ہے۔ دونوں مسئلوں کے لیے ایک بہت سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ نماز کی مکمل پابندی کرنا۔ کسی بھی نماز کے بعد ایک ہزار مرتبہ ”یابدیع السموات والارض“ پڑھ کر پورے یقین اور یکسوئی کے ساتھ گڑ گڑا کر حاجات کی قبولیت کے لیے دعا مانگو۔ کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☆ بیٹے عالم! باری تعالیٰ تمہیں صحت مند رکھے۔ آمین۔ اس رب عظیم کا شکر ادا کرو اور ہمیشہ کرتے رہنا جس نے تمہیں شفا بخشی ہے۔ نماز کی بھی پابندی جاری رکھنا۔

□ نور مہدی۔ راولپنڈی

○ جناب باباجی! السلام علیکم! میں نے اپنے والد صاحب کی بیماری کے لیے آپ سے جو تعویذ منگوا یا تھا۔ اس کی برکت سے بفضل خدا میرے والد صاحب صحت یاب ہو گئے ہیں۔ آپ کا شکر یہ باباجی! اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں ان کا مہنگا علاج کروا سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا نیک اجر دے اور لمبی زندگی عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح مخلوق خدا کی مدد کرتے رہیں۔ آمین۔

☆ بیٹے مہدی! میں تو اللہ تعالیٰ کا نہایت عاجز اور عاصی بندہ ہوں۔ شفا دینے والی ذات تو اس

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جو ابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7 کراچی

253 نسخوں کے انداز میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہائپر پارک

ذی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی غلط فیصلہ ہو بھی جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں ان کی حفاظت گو کرنا ہوگی۔ دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر تاریخی فیصلے غلط تھے لیکن تاریخی تھے۔ تاریخ اپنا بیشتر کام انسان کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے جنت میں جا پہنچتا ہے۔ جنت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

واصف علی واصف کی تصنیف سے رضوانہ کوثر لاہور کا انتخاب۔

تلاش گم شدہ

☆ رشوت کی گلی میں ہمارا ایمان کھو گیا ہے کہاں ملے گا؟
☆ گھر سے اخلاق گم ہو گیا ہے کہاں ملے گا؟
☆ دہشت گردی کی آگ بجھانے والا اسپرے گم ہو گیا ہے کہاں سے ملے گا؟
☆ بے حسی کی بیماری میں لگانے والا خلوص و محبت کا انجکشن گم ہو گیا ہے کہاں سے ملے گا؟
☆ شرافت ہمیں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئی ہے کہاں سے ملے گی؟

مرسلہ: انور شیخ۔ حیدرآباد

کمزور عشق

مولانا رومی ایک دن خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر جا کر رک گئے۔ دیکھا کہ ایک عورت کچھ سودا سلف خرید رہی ہے۔ سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے جب رقم ادا کرنا چاہی تو دکان دار نے کہا۔ ”عشق میں پیسے کہاں ہوتے ہیں چھوڑو پیسے اور جاؤ۔“ اصل میں یہ دونوں عاشق اور معشوق تھے۔ مولانا رومی یہ سن کر غش کھا کر گر پڑے۔ دکان دار سخت گھبرا گیا۔ اس دوران میں وہ عورت بھی وہاں سے چلی گئی۔ خاصی دیر بعد جب مولانا رومی کو ہوش آیا تو دکان دار نے پوچھا۔ ”مولانا! آپ کیوں بے ہوش ہوئے؟“ مولانا نے جواب دیا۔ ”میں اس بات پر بے ہوش ہوا کہ تم میں اور اس عورت میں عشق اتنا قوی اور مضبوط ہے کہ دونوں میں کوئی حساب کتاب نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ میرا عشق اتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح گن کر کرتا ہوں۔“

مولانا رومی کی تصنیف ”حکایات رومی“ سے اقتباس انتخاب: شہزاد خان پشاور۔

فیصلے کا لمحہ

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسے لمحات نہیں آتے، ٹھیک وقت پر

تیس پتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جنوں کی حد تک محبت کرتا ہو کیونکہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ بے شک تم نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں اتنا بھی پاگل نہیں کہ تمہاری خوبصورت آنکھوں میں اپنے لیے محبت نہ دیکھ سکوں چاہو بھی تو اس بات سے انکار نہیں کر سکتی کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔

انتخاب: رفعت، بہاولنگر

وٹامن ڈی کے فوائد اور حصول کے ذرائع

اصل میں وٹامن ڈی ایک ہارمون ہے جو مسلز کو مضبوط بناتا ہے اور کیلشیم کو نہ صرف جسم میں جذب کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ وٹامن ڈی کی معقول مقدار جسم میں نہیں ہوگی تو کیلشیم سے مالا مال غذا یا سپلی منٹ کا بہترین استعمال نہیں ہو سکے گا۔

اگرچہ یہ جلد میں دھوپ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مگر ڈاکٹرز یہ مشورہ دیتے ہیں کہ جو لوگ 40 سال سے اوپر کے ہو گئے ہیں انہیں وٹامن ڈی سپلی منٹ لینا چاہیے کیونکہ عمر کی بڑھوتری کے ساتھ جلد کی کارکردگی ہلکی ہو جاتی ہے۔

اس کے دیگر ذرائع میں فوری فائدہ نوڈ اور چکنائی والی مچھلی مثلاً سالمن، کیلشیم کی طرح وٹامن ڈی کو جسم میں اسٹور کیا جاسکتا ہے اس لیے اس کی سطح ہمیشہ اوپر رکھی جاسکتی ہے۔

مرسلہ۔ عمر العطاس، حیدرآباد

قابلیت کی ویلیو

جناب کیسی ہے یہ یونیورسٹی؟ ایک اسٹوڈنٹ نے ایم بی اے کا فارفل کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔

”بہت اچھی ہے میں نے بھی یہاں سے ہی ایم بی اے کیا تھا۔“ چوکیدار بولا۔

حسن انتخاب: کرن شبیر، کراچی

آتے ہیں روز گھر میں جو مہمان بے شمار ہم نے اٹھائے ان سے بھی نقصان بے شمار

اس شہر انتشار میں جینا محال ہے چاروں طرف ہیں موت کے سامان بے شمار

صحرا نکل گیا ہے مسافر کو رات میں مل جائیں یوں نہ خاک میں انسان بے شمار

اس شہر اجنبی میں پہنچ کر لگا مجھے واقف بہت ہی تھوڑے ہیں انجان بے شمار

عامر جفا و جور کے قصے طویل ہیں بننے لگے جو جنگ کے عنوان بے شمار

شاعر: عامر ثانی

سرکاری ملازم

ایک سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے ایک صاحب وقفے وقفے سے فون کر رہے تھے۔ صبح سے دوپہر تک انہیں مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔ کچھ دیر پہلے صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ جی ہاں وہ آئے تھے لیکن ابھی ابھی بڑے صاحب نے انہیں میٹنگ کے لیے بلا لیا ہے۔ جی وہ ابھی میٹنگ سے نہیں آئے۔ اب تو وہ لچ کے لیے چلے گئے ہیں۔“

دوپہر دو بجے کے بعد ان صاحب کو مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”بس وہ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ نہیں وہ ابھی تک نہیں آئے آپ پیغام دے دیجیے۔ وہ بلڈنگ میں ہی کہیں ہیں۔ ان کی واسٹ کرسی پر لٹکی ہوئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں مجھے پکا پتا نہیں ہے کہ وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ جی ہاں ان کا موبائل آف ہے۔“

ارے جناب وہ آئے تھے لیکن بس دو مہینے پہلے ہی چھٹی کر گئے ہیں۔ اب تو ویسے بھی آفس بند ہی ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں تالا ہے۔“
حسن انتخاب: سلمان عمرانی، سجاول

ضعیف ترین

بے نیاز اور لاابالی فلسفی نے اپنے کسی شاگرد کو خط کے جواب میں لکھا۔ ”تم نے پوچھا ہے کہ دنیا کا ضعیف ترین آدمی کون ہے؟ یوں تو اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن میں بات کو طول دینا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک دنیا کا ضعیف ترین انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غالب نہیں آ پاتا۔“
مرسلہ۔ فیصل بخت۔ پشاور

رائل سعودی لینڈ فورسز (RSLF)

سعودی عرب کی بری یا زمینی افواج کا آئینہ نام رائل سعودی لینڈ فورسز (RSLF) ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر ملک کے شمال میں کویت کی سرحد کے قریب کنگ خالد ملٹری سٹی حفر الباطن میں واقع ہے۔ سعودی زمینی فوج کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے اور یہ دنیا کی 15 ویں بڑی آرمی بھی جانی ہے۔ سعودی بری فوج کئی جنگیں لڑنے کا تجربہ رکھتی ہے۔ 1902ء سے 1933ء تک مملکت سعودیہ کی تشکیل کے دوران لڑی گئی طویل جنگ کے علاوہ سعودی آرمی نے 1948ء میں اسرائیل کے خلاف عربوں کی جنگ میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور تین ہزار سے زیادہ فوجیوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ 1967ء میں سعودی آرمی کے 20 ہزار اہلکاروں نے اردن میں خدمات انجام دیں۔ 1969ء میں جنوبی یمن کی فوج نے سعودی عرب کے سرحدی شہر الوادیہ پر حملہ کیا، تاہم سعودی آرمی نے حملہ آور فوج کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ 1973ء میں جنگ اکتوبر کے دوران امریکی مداخلت کے خلاف سعودی عرب نے خلیج کے دیگر ممالک کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے ہوئے تیل کی

قیمتوں میں اضافہ کروایا اور شام کے محاذ پر لڑنے کے لیے اپنے تین ہزار فوجیوں کو اردن میں تعینات کر دیا۔ 91-1990ء میں کویت پر عراقی فوج کے قبضے کے بعد سعودی بری فوج نے امریکا اور دیگر اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ خلیج میں حصہ لیا اور کویت کو آزاد کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔
مرسلہ۔ نازی عمر۔ جاتی، سندھ

غزل

نہ طلب ہے مجھ کو زمین کی نہ نئے مکاں کی تلاش ہے جہاں ایک بار جھکا تھا سر اسی آستان کی تلاش ہے نہیں مال و زر کی ہے جستجو نہ دیار غیر کی آرزو جہاں نیند آئے سکون سے مجھے اس جہاں کی تلاش ہے جو گلوں کا حسن نکھار دے جو فضا کو رنگ بہار دے جو چمن کو پھر سے سنوار دے اسی باغبان کی تلاش ہے میرا حال سب سے جدا یہی مری بات سب سے الگ یہی جو قریب سے مجھے سن سکے اسی مہرباں کی تلاش ہے
شاعرہ: سمیعہ نسیم۔ پٹنہ بہار۔ بھارت

زندگی

ہر انسان زندگی کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ یہ سات رنگوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ زندگی خوابوں کا خوبصورت جزیرہ ہے جبکہ کوئی اس کو ٹوٹے خوابوں کا قبرستان کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں یہ پھولوں کی بیج ہے تو کسی کی نظر میں کانٹوں کا بستر ہے۔ کوئی اس کو محبت کا پھول کہتا ہے تو کوئی اس کو نفرت اور جدائی کے کانٹوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ غم کا دریا ہے اور کوئی اس کو خوشیوں کا جھرنہ کہتا ہے۔ کوئی اس کو تاریکی اور کوئی روشنی کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں یہ آنسو اور کسی کی نظر میں دل آویز مسکراہٹ ہے۔ کوئی اس کو محبت کا نغمہ اور کوئی اس کو جدائی اور غم کا مرثیہ کہتا ہے لیکن میری نظر میں زندگی سخت سردی میں تھر تھر کانپتے اس معصوم بچے کے سر پر دست شفقت رکھنا ہے جو ماں باپ کی محبت سے محروم ہو چکا ہو۔
مرسلہ۔ شہزادی بانو بدین



تیسرا نم کش

تاریخ

اپنی سخن فہمی کو آزمائے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجئے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

نہ کرو بحث ہار جاؤ گے حسن اتنی بڑی دلیل نہیں ابو ذر غفاری..... بہاول نگر	مقصود شاہانی..... حیدرآباد میں اک اداس پرندے کے پاس بیٹھی تھی پھر ایک دم ہی میرے ہاتھ پھڑ پھڑانے لگے ابو ہریرہ بلوچ..... بورے والا
ایک سائل کو مرے دل کی ضرورت ہے مگر ہائے گھر والے سخاوت نہیں کرنے دیتے محمد فیاض محمود..... کراچی	جبر ہوتا نہیں محبت میں جب مناسب ہو میرے ہو جانا عبدالعزیز جی آ..... چکوال
میں حادثوں کو عجب مشکل میں ڈال دیتا ہوں سفر سے پہلے ہی صدقہ نکال دیتا ہوں کرن شہزادی..... راولپنڈی	اک مری ہی یاد سے پرہیز ہے آپ کو نہ جانے کس طبیب سے دوا لیتے ہو آریان خان..... کراچی
ہوئی جو صبح تو وہ مجھ سے لڑنے آئے کہ تم ہوتے کون ہو مرے خوابوں میں آنے والے محمد جواد انور..... اسلام آباد	عشق ٹوٹا تو استخارہ کیا پھر اسی عشق کو دوبارہ کیا رانا حبیب الرحمن..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
صرف تصویر رہ گئی باقی جس میں ہم ایک ساتھ بیٹھے ہیں عبدالمستقیم قریشی..... کراچی	وہ ایک خط جو اس نے کبھی لکھا ہی نہیں میں روز بیٹھ کے اس کا جواب لکھتا ہوں حمزہ خان..... کراچی
ہر کسی کے ہاتھوں بک جانے کو تیار نہیں یہ میرا دل ہے شہر کا اخبار نہیں عظیم الدین..... حیدرآباد	کس مسافت کے بعد پہنچا ہے تیرے رخسار تک مرا آنسو احسن عمرانی..... سہاول
محبت واجب تھی ہم پر جو ہم نے کر لی وفا فرض ہے تم پر، دیکھتے ہیں ادا کرتے ہو یا قرض..... غیاث الدین..... پشاور	نازک لگتے تھے جو حسین لوگ واسطہ پڑا تو پتھر کے نکلے احسن رضوی..... کراچی
شوق تعبیر کی پڑی ہوئی ہے دکھ کی تاثیر کی پڑی ہوئی ہے پہلے مسہار کیوں کیا تھا مجھے	تم بہت جازب و جمیل سہی زندگی جازب و جمیل نہیں

تورالین..... اسلام آباد
 جارہا ہے وہ ریل گاڑی میں
 بچھ رہا ہے دماغ میں سورج
 اس نے صدقہ کیا تھا اک آنسو
 بن گیا وہ چراغ میں سورج
 نسیم سحر..... اسلام آباد

اک قطرہ کہیں سمندر تھا
 اور مری دسترس سے باہر تھا
 دھوپ کی مہربانیوں کے سبب
 میرا سایہ میرے برابر تھا
 حاصم وقاص..... لاہور

ساتھی تھی ہم سفر تھی شریک سخن تھی وہ
 تاریکوں میں رات کی صبح کرن تھی وہ
 برہان الدین..... پشاور

جب پلکوں کے روزن سے جھانکا ایک بار
 اس لمحے میری آنکھوں کو اک خواب لگا تھا
 کیوں کاتب تقدیر نے کھینچی ہیں کبیریں
 جب غور سے دیکھا تو تیرا نام لکھا تھا
 شاہدہ ناز..... کامونگے

کتاب زیست کے صفحے وفا سے خالی ہے
 وہ چاہتوں کا فسانہ تلاش مت کرنا
 تمہارے ذکر سے تم کو کہیں نہ زک پہنچے
 میرا کلام پرانا تلاش مت کرنا
 سدرہ نور..... بٹگرام

تم میری آنکھوں میں بن کے تصویر رک گئے ہو
 یا سارے عالم پہ کوئی لمحہ ثبات کا ہے

اب جو تیسیر کی پڑی ہوئی ہے
 رضوانہ کوثر..... لاہور

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
 اجنبی دیوار و در، ویران گھر، تنہائیاں
 فیضان خورشید..... حیدرآباد

رکی ہوئی ہیں گردشیں، نظام چل نہیں رہا
 گیا وہ جب سے چھوڑ کے سے بدل نہیں رہا
 ہر ایک شے ہے آس پاس جوں کی توں رواں دواں
 پر مری گرفت میں وہ ایک پل نہیں رہا
 اسامہ بلال اعوان..... داروہ والا، لاہور

ہم نے تاخیر سے سیکھے ہیں محبت کے اصول
 ہم پہ لازم ہے کہ عشق دوبارہ کر لیں
 اشعر عشیق..... کراچی

دیواریں چھوٹی ہوتی تھیں لیکن پردہ ہوتا تھا
 تالے کی ایجاد سے پہلے صرف بھروسا ہوتا تھا
 شکر کرو تم اس بستی میں بھی اسکول کھلا دو نہ
 مرجانے کے بعد کسی کا سنا پورا ہوتا تھا
 عبدالغفار عابد..... چیچہ وطنی

جب تک ماتھا چوم کے رخصت کرنے والی زندہ تھی
 دروازے کے باہر تک ہی منہ میں لقمہ ہوتا تھا
 نور زمان..... پشاور

خدا کرے کہ وہم ہو خدا کرے کہ خیر ہو
 بہت دنوں سے اس طرف چراغ جل نہیں رہا
 شانہ زمان..... سکھر

کیا خبر اگلے سفر میں نہ زمیں مجھ کو ملے
 مشت بھر خاک اٹھانے کی تو مہلت دے دے

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے

کو پین برائے

تیسیر

کشن

اکتوبر 2016ء

نام:
 پتا: